گاندھی جی کے تعلیمی خیالات

مرتبہ

سعید انصاری

○ [illegible] ○
चौड़ा रास्ता, जयपुर-३

گاندھی سمارک ندھی۔ نئی دہلی

تقسیم کار
عبدررد تحکستر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار دہلی ۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

طبع اول ۱۰۰۰ جولائی ۱۹۷۰ء قیمت -/۱۶

مطبوعہ کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی

فہرست

عنوان	صفحہ
ا دیباچہ ازمرتب	۵
ب ۔ قارئین سے	۱۱
ج ۔ "میرے تعلیمی خیالات"	۱۳
۱۔ پہلا باب :۔ تعلیم کے معنی اور مقصد	۱۷
۲۔ دوسرا باب :۔ موجودہ نظام تعلیم	۹۵
۳۔ تیسرا باب :۔ تعلیم اور زبان کا مسئلہ	۱۵۵
۴۔ چوتھا باب :۔ تعلیم اور طلبار	۱۶۷

صفحہ

۵- پانچواں باب :- مختلف قسم کی تعلیم :—

(۱) اوائلِ عمر یا نرسری کی تعلیم ۲۷۴
(۲) مذہبی تعلیم ۲۹۲
(۳) تعلیمِ بالغان ۳۲۲
(۴) عورتوں کی تعلیم ۳۶۷
(۵) جنسی تعلیم ۳۳۵
(۶) کام کی تعلیم ۳۸۳

۶- چھٹا باب :- متفرق مضامین :—

(۱) درسی کتابیں ۴۰۵
(۲) ایک کتب خانہ کا مقصد ۴۰۹
(۳) جامعہ ملیہ اسلامیہ ۴۱۲

دیباچہ

گاندھی جی یوں تو عام طور پر ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے جانے اور بوجھے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی سیاسی رہنمائی میں کئی سماجی اصلاحات اور معاشی فلاح و بہبود کے مسائل شامل تھے۔ انھوں نے نہ صرف یہی بلکہ ہندوستانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس پر اپنے خیالات و افکار کی گہری چھاپ نہ ڈالی ہو۔ اسی میں تعلیم کا ایک مسئلہ بھی آتا ہے، جس پر انھوں نے نہ صرف نظری حیثیت سے غور و بحث کی ہے بلکہ عملی اعتبار سے بھی کچھ تجربے کیے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں فینکس کی بستی اسی کی ایک زندہ مثال ہے۔ اپنے "تلاش حق" کے سفر میں انھوں نے اس کوچہ کی خاک بھی چھانی ہے اور بہت کم جانتے ہیں کہ انھوں نے بنیادی تعلیم کے علاوہ جسے وہ خود اپنی زبان میں "نئی تعلیم" کہتے تھے، حقیقت نفس تعلیم

کے معنی و مقصد، اس کے اصول و طریقے نیز تعلیم کی نفسیات سے بھی بحث کی ہے، پھر ہندوستان کے نظام تعلیم، جو انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ یہاں آیا، انگریزی زبان بطور ذریعہ تعلیم اور اس نظام کے دوسرے مسائل پر بہت سخت تنقید کی ہے، اور ان مسائل پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ آج بھی ویسے ہی صحیح ہیں جیسے اس زمانہ میں تھے۔

تعلیم سے متعلق سب سے پہلے انھوں نے ایک چھوٹے سے رسالہ میں بحث کی ہے جو اس صدی کے اوایل میں "ہند سوراج" کے نام سے شایع ہوا تھا۔ یہ اصل میں ان کی مثالی زندگی کا ایک خاکہ ہے جو وہ ہندوستان کی قومی زندگی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ پورا رسالہ 'قاری' اور 'مدیر' کے درمیان ایک مکالمہ کی شکل میں ہے۔ اور تعلیم کے بارے میں جب 'قاری' ان سے سوال کرتا ہے تو وہ لکھتے ہیں: "تعلیم ایک آلہ ہے۔ ایک آلہ کا اچھا استعمال بھی ہو سکتا ہے اور بُرا بھی ایک ہی آلہ جو ایک مریض کے صحت یاب ہونے میں کام دے سکتا ہے، اس کی جان لینے میں بھی کام آ سکتا ہے۔"

پھر اس موجودہ تعلیم کے بے معنی ہونے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:-

"ایک کسان اپنی روزی ایمان داری کے ساتھ کماتا ہے۔ اسے دنیا کا عام علم بھی ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اسے اپنے ماں باپ کے ساتھ، اپنی بیوی بچوں اور گاؤں والوں کے ساتھ کس طرح برتاؤ کرنا چاہیئے۔ وہ اخلاقی قانون قاعدوں سے بھی واقف ہے اور ان پر عمل کرتا ہے لیکن وہ دستخط کرنا نہیں جانتا۔ پھر تم اسے لکھنا پڑھنا سکھا کر کیا کرنا چاہتے ہو؟"

یہی نہیں کہ گاندھی جی نے علم کے تصور اور مروجہ تعلیم پر تنقید کرکے چھوڑ دیا ہو، بلکہ انھوں نے ایک نئی اور وسیع تعلیم کا نظریہ بھی پیش کیا ہے جو آج کل کے جدید ترین نفسیاتی نظریوں اور تعلیم کے اصولوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے وہ لکھتے ہیں: "نئی تعلیم یا صحیح تعلیم وہ ہے جس میں ذہن، جسم اور دل تینوں کی تربیت کا خیال رکھا گیا ہو۔ ذہن اور جسم کی ہم آہنگ تربیت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: "میرا عقیدہ ہے کہ ذہن کی صحیح تعلیم صرف جسمانی اعضا ... کی صحیح مشق اور تربیت کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ بچے کے اندر جسمانی اعضا کا صحیح استعمال ہی اس کے ذہن کی تربیت کا سب سے بہتر اور فوری طریقہ ہے۔ لیکن جب تک ذہن اور جسم کا نشوونما ساتھ ساتھ نہ ہو اور اسی کے ساتھ روح میں بیداری نہ آئے، صرف ذہنی نشوونما ایک بھونڈی سی چیز ہوگی۔ روحانی تربیت سے میری مراد دل کی تعلیم ہے۔ اس لیے ذہن کی ایک صحیح اور مکمل نشوونما صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ بچہ کی کی جسمانی اور روحانی دونوں قوتوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہو۔ ان سب سے مل کر ایک غیر منقسم کل بنتا ہے۔"

پھر ان سب پر مزید انھوں نے دل کی پاکیزگی اور سیرت کی تعمیر پر بھی بہت زور دیا ہے اور یہاں تک گئے ہیں کہ ان کے نزدیک تعلیم کا اصل ماحصل سیرت کی تشکیل ہے اور اس کا سب سے موثر ذریعہ انھوں نے استاد کو بتایا ہے جو خود صاحب سیرت و کردار ہو اور ابتدائی و ثانوی کی تعلیم میں اس کے فقدان کا بہت نوحہ کیا ہے۔

گاندھی جی نے صرف بچے کی قوا کی ہم آہنگ تربیت اور اس کی سیرت کی تعمیر و تشکیل ہی پر اکتفا نہیں کی ہے، بلکہ ان کے نزدیک سچی تعلیم وہ ہے جو ان میں سماج کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا کرے اور اس کی انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کے تمام عملی تجربوں سے تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ نہ صرف ہنگامی مصیبت آجانے پر ہی بلکہ عام حالات میں بھی طلبار کا عوام کی خدمت کے لئے تیار رہنا اور اپنے وقت اور استعداد کی قربانی کرنا سچی اور صحیح تعلیم کا ایک بہت بڑا تقاضہ ہے۔ اس طرح انھوں نے تعلیم کا زندگی سے رابطہ پیدا کیا ہے۔ بعد میں ان کا مشہور قول جو عام طور پر ان کے عقیدت مند حلقوں میں نقل کیا جاتا ہے یہ ہے کہ "تعلیم زندگی کے لئے اور زندگی کے ذریعہ"۔

گاندھی جی نے اپنی اس تمام سیاسی زندگی میں تعلیم کے بعض مخصوص پہلوؤں کو بھی لیا ہے، مثلاً اوائل عمر کی تعلیم، بالغوں کی تعلیم، عورتوں کی تعلیم، ہریجنوں کی تعلیم، مذہبی تعلیم، موسیقی کی تعلیم، جنسی تعلیم وغیرہ اور ان سب پر اپنے مخصوص انداز فکر میں نہ صرف ایک سماجی مصلح اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے عام اظہار خیال پر اکتفا کیا ہے بلکہ اس پر ٹکنیکل اور فنی اعتبار سے بھی روشنی ڈالی ہے۔

ایک بڑا حصہ اس کتاب کا "طلبا سے خطاب" اور ان کے خطوں اور مراسلوں کے جواب پر مشتمل ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے طلبار سے متعلق تعلیم کے مختلف مسائل پر بحث کی ہے۔

آخر میں اس مجموعہ میں کچھ متفرق مضامین بھی شامل کر دیئے گئے ہیں، جو ان ابواب میں سے کسی میں نہیں آتے تھے۔ اس طرح گاندھی جی نے تعلیم سے متعلق اس کے کسی پہلو پر جو کچھ بھی لکھا ہے یا کہا ہے، خواہ وہ مضمون کی شکل میں ہو یا شذرات کی، انگریزی میں ہو یا گجراتی، ہندی یا مرہٹی میں، ان کا کوئی قابل ذکر خیال یا قول ایسا نہیں رہ گیا ہے جو اس مجموعہ میں کسی نہ کسی عنوان کے تحت شامل نہ کیا گیا ہو۔

انگریزی میں اگرچہ اس قسم کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا جامع نہیں جو گاندھی جی کے تمام افکار و خیالات پر محیط ہو۔ گجراتی یا ہندی میں تو اس کا ذکر ہی کیا۔ اردو میں یہ سب سے پہلی کوشش ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے یکتا اور یگانہ ہے اور دوسری سب زبانوں سے منفرد ہے۔

۱۹۶۹ء گاندھی جی کی صد سالہ برسی منانے کا سال تھا اور یہ مختلف صورتوں اور شکلوں میں منایا گیا۔ راقم نے گاندھی جی کی عظمت و بزرگی کو جو کچھ پایا ہے اور تعلیم کے میدان میں ان کی نظری اور فنی حیثیت کا جو اثر ہے اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس یادگار سال میں ان کے تمام تعلیمی خیالات اور افکار کو یکجا کر کے اور انھیں مختلف ابواب میں ترتیب دے کر ایک تحفے کی شکل میں پیش کروں، جو اس وقت قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ اگر آج نہیں تو کل، لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے گا، اور گاندھی جی کے یہ خیالات جو آج شرمندۂ عمل نہ ہو سکے

کل لوگ اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے۔

گاندھی سمارک نِدھی اور گاندھی پیس فونڈیشن جو گاندھی جی کے افکار وخیالات کی اشاعت کے دو بڑے ادارے ہیں، قابل صد شکریہ ہیں کہ انھوں نے اس مجموعہ کی طباعت کے لیے مالی امداد دی اور ان اداروں کے ذمہ دار حضرات کی یہ سو جھ بوجھ تھی جنھوں نے اس کام کی قدر پہچانی اور اس کی امداد کے لیے سفارش کی۔ میں ان سب حضرات کا دلی شکرگزار ہوں۔

آخر میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی کے جواں ہمت اور بلند حوصلہ منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب بھی میرے خاص شکریہ کے مستحق ہیں کہ جن کی ہمت اور بلند حوصلگی سے کتاب کی طباعت واشاعت کا اہتمام ہو سکا، ورنہ کتنی اور کوششوں کی طرح یہ کوشش بھی ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

کے مصداق ہوتی۔

سعید انصاری

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

۱۵ راگست ۱۹۷۴ء

قارئین سے

میں اپنی تحریروں کے سنجیدہ پڑھنے والوں سے اور ان سے جو ان میں دلچسپی رکھتے ہیں، یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس کی بالکل پروا نہیں اگر ان میں کہیں انہیں تضاد نظر آئے۔ حق کی تلاش میں میں نے بہت سے خیالات چھوڑے ہیں اور بہت سی نئی باتیں اختیار کی ہیں۔ میں جتنا عمر رسیدہ ہوں، اس سے مجھے یہ بالکل احساس نہیں کہ میری اندرونی نشو و نما رک گئی ہے، یا یہ کہ میرے گوشت پوست کے گل جانے کے بعد ختم ہو جائے گی۔ جس چیز کا مجھے سب سے زیادہ خیال ہے وہ یہ کہ میں حق یعنی اپنے خدا کی آواز پر ہر لمحہ تیار رہوں، اور اس لیے جب کوئی شخص میری کسی دو تحریروں کے درمیان تضاد پائے اور اگر اسے میری صحت دماغی پر یقین ہے، تو اس کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ وہ اس موضوع پر ان دونوں میں سے میری آخری تحریر کا انتخاب کرے۔

(ہریجن، ۲۹ر اپریل ۱۹۳۳ء)

"میرے تعلیمی خیالات"

خلاصہ

یہ تعلیم پر میرے اپنے اور غالباً کچھ عجیب خیالات ہیں جو میرے رفقاء نے ابھی پورے طور پر تسلیم نہیں کیے ہیں اور میں انہیں پیش کر رہا ہوں۔

۱۔ چھوٹے بچوں اور بچیوں کی آٹھ سال کی عمر تک مخلوط تعلیم ہونی چاہیئے۔

۲۔ ان کی تعلیم کسی ماہر تعلیم کی نگرانی میں خاص طور سے ہاتھ کے کام پر مشتمل ہونی چاہیئے۔

۳۔ بچے یا بچی کو جس قسم کا کام دیا جائے، اس میں ہر بچہ کے مخصوص میلان کا خیال رکھا جائے۔

۴۔ جب کوئی کام کرایا جائے تو اس کام کے وجوہ بھی اسے بتانے چاہئیں۔

۵۔ جس وقت بچہ چیزوں کو سمجھنے لگ جائے اسی وقت ہر بچہ کو عام معلومات دی جائے۔ پڑھنا، لکھنا بعد میں سکھانا چاہیئے۔

۶۔ بچہ کو سب سے پہلے علم ہندسہ کی سادہ شکلیں کھینچنی سکھائی جائیں

۶۔ اور جب اس نے یہ شکلیں آسانی سے کھینچنی سیکھ لیں، پھر اسے حروف تہجی لکھنا سکھانا چاہیئے۔ اگر یہ اس نے کر لیا تو وہ شروع ہی سے خوشخط لکھنے لگے گا۔

۷۔ پڑھنا، لکھنے سے پہلے سکھانا چاہیئے۔ حروف تصویروں کی طرح پہچنوانے چاہئیں اور پھر اس کے بعد انہیں نقل کرانے چاہئیں۔

۸۔ ایک بچہ کی اگر اس طرح تعلیم ہو تو آٹھ سال کی عمر تک اسے اپنی صلاحیت کے مطابق کافی معلومات ہو جائیں گی۔

۹۔ بچہ کو کوئی چیز زبردستی نہیں سکھائی چاہیئے۔

۱۰۔ اسے جو چیز بھی سکھائی جائے، اس میں اس کی دلچسپی کا خیال رکھنا چاہیئے۔

۱۱۔ تعلیم بچہ کو کھیل کی طرح معلوم ہو۔ کھیل تعلیم کا ایک لازمی جزو ہے۔

۱۲۔ تمام تعلیم مادری زبان کے ذریعہ دی جانی چاہیئے۔

۱۳۔ بچہ کو حروف سکھانے سے پہلے ہندی اُردو بطور قومی زبان کے سکھانی چاہیئے۔

۱۴۔ مذہبی تعلیم بہت ضروری ہے۔ اور یہ بچہ کو استاد کے عادات و اطوار اور اس کے بارے میں اس کی گفتگو کے ذریعہ آنی چاہیئے۔

۱۵۔ ۹ سے ۱۶ سال تک بچہ کی تعلیم کی دوسری منزل ہوتی ہے۔

۱۶۔ بہتر ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کی حتی الامکان اس دوسری منزل میں

لے گاندھی جی نے اپنے یہ خیالات اپنی گجراتی کتاب "ستیاگرہ آشرم کا اتہاس (ستیاگرہ آشرم کی تاریخ)" میں ۲۷ جون ۱۹۳۲ء بعد ۱۰ جولائی ۱۹۳۲ء کے درمیان قلمبند کئے تھے (مرتب)

بھی تعلیم مخلوط ہو۔

۱۷۔ ہندو بچوں کو اب سنسکرت پڑھائی جانی چاہیئے اور مسلمان بچوں کو عربی۔

۱۸۔ ہاتھ کا کام اس دوسری منزل میں بھی جاری رہنا چاہیئے۔ ادبی تعلیم کے لیے حسبِ ضرورت زیادہ وقت دیا جانا چاہیئے۔

۱۹۔ لڑکوں کو اس منزل میں اپنے والدین کا پیشہ اس طرح سکھانا چاہیئے کہ وہ اگر چاہیں تو اپنا آبائی پیشہ اختیار کرکے اپنی روزی پیدا کرسکتے ہیں۔ اس کا اطلاق لڑکیوں پر نہیں ہوتا ہے۔

۲۰۔ اس منزل میں لڑکے کو تاریخ عالم اور جغرافیہ کی ایک عام واقفیت علم نباتات، ہیئت، حساب، ہندسہ اور الجبرا کی بھی ہونی چاہیئے۔

۲۱۔ بچے کو اب سینا اور کھانا پکانا آنا چاہیئے۔

۲۲۔ سولہ سے پچیس سال تک تیسری منزل ہے جس میں ہر نوجوان مرد اور عورت کی اپنی خواہش اور حالات کے مطابق تعلیم ہونی چاہیئے۔

۲۳۔ دوسری منزل میں (۹ تا ۱۶) تعلیم کو خود کفالتی ہونا چاہیئے، یعنی بچہ جب تک پڑھتا ہے، وہ کوئی ہاتھ کا کام بھی کرتا ہے، جس کی آمدنی سے اسکول کا خرچ پورا ہو۔

۲۴۔ پیداوار بالکل شروع سے ہونی چاہیئے۔ لیکن پہلی منزل میں یہ ابھی خرچ کو پورا نہیں کرسکتی ہے۔

۲۵۔ استادوں کی بہت اونچی تنخواہیں نہیں ہونی چاہئیں بلکہ انہیں صرف زندگی بسر کرنے کے لیے اجرت ملنی چاہیئے۔ انھیں خدمت کے جذبے سے معمور ہونا چاہیئے۔ یہ بہت بڑی ذلت کی بات ہوگی کہ ابتدائی منزل میں ہر ایرے غیرے

غیر تنخواہ دار ماہرین کو بطور اُستاد کے لے لیا جائے۔ تمام استادوں کو اعلیٰ سیرت کا ہونا چاہیئے۔

۳۱۔ تعلیمی اداروں کے لیے بہت بڑی اور خرچیلی عمارتوں کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۲۔ انگریزی، کئی زبانوں میں سے ایک زبان کے طور پر پڑھائی جائے جس طرح ہندی قومی زبان ہے، انگریزی کو دوسری قوموں کے ساتھ کاروبار کرنے اور بین الاقوامی تجارت کے لیے استعمال کرنا چاہیئے۔

۳۲۔ جہاں تک عورتوں کی تعلیم کا تعلق ہے، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ مردوں کی تعلیم سے مختلف ہونی چاہیئے اور یہ کہ یہ کب شروع ہونی چاہیئے لیکن میری یہ قطعی رائے ہے کہ عورتوں کو بھی وہی سہولتیں حاصل ہونی چاہئیں جو مردوں کو ہیں اور جہاں ضرورت ہو، ان کے لیے خاص سہولتیں ہونی چاہئیں

۳۳۔ ان پڑھ بالغوں کے لیے شبینہ مدارس ہونے چاہئیں۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ انھیں پڑھنا لکھنا سکھانا ضروری ہے۔ انھیں لکچروں وغیرہ سے عام معلومات حاصل کرنے میں مدد دینی چاہیئے اور اگر وہ چاہتے ہیں تو انھیں پڑھنا لکھنا سکھانے کا بھی انتظام کرنا چاہیئے۔

ماخوذ از "آشرم کے قوانین" صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۵ مطبوعہ ۱۹۵۹ء

پہلا باب

تعلیم کے معنی اور مقصد

تعلیم کے معنی

تعلیم کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی ہیں علم حاصل کرنا۔ تعلیم ایک آلہ ہے ایک آلے کا اچھا استعمال بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ ایک ہی آلہ جو ایک مریض کے صحت یاب کرنے میں مدد دے سکتا ہے، اس کی جان لینے میں بھی کام آسکتا ہے۔ یہی حال علم کا بھی ہے۔ ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ اکثر لوگ اس کا صحیح استعمال نہیں کرتے اور بہت کم لوگ ہیں جو اس کا صحیح استعمال کرنا جانتے ہیں۔ اور اگر یہ درست ہے تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس سے فائدے سے زیادہ نقصان پہنچا ہے۔

تعلیم کے عام معنی ہیں علم حاصل کرنا۔ بچوں کو پڑھنا، لکھنا اور حساب سکھانا ابتدائی تعلیم کہلاتا ہے۔ ایک کسان اپنی روزی ایمانداری کے ساتھ کماتا ہے۔ اسے دنیا کا عام علم بھی ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اسے اپنے ماں باپ کے ساتھ، اپنی بیوی بچوں اور اپنے گاؤں والوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے وہ اخلاقی قاعدے قانون سے بھی واقف ہے، اور ان پر عمل کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنا دستخط نہیں کر سکتا۔ پھر تم اسے لکھنا پڑھنا سکھا کر کیا کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم اس کی خوشی میں ایک ذرہ بھی اضافہ کر سکتے ہو؟ کیا تم اسے اپنے جھونپڑے یا اپنی قسمت سے غیر مطمئن رکھنا چاہتے ہو؟ اگر تم ایسا کرنا بھی چاہو تو اسے ایسی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ مغربی خیالات کی رو میں بہہ کر ہم بغیر اس کا آگا پیچھا سوچے اس نتیجہ پر پہونچے کہ ہمیں بھی اپنے بچوں کو اسی قسم کی تعلیم دی جانی چاہیئے۔

اب اعلیٰ تعلیم کو لیجئے۔ میں نے جغرافیہ، ہیئت، الجبرا، علم ہندسہ وغیرہ

پڑھا ہے۔ لیکن اس سے کیا فائدہ ہوا؟ میں نے کسی طرح اپنے کو یا ان لوگوں کو جو میرے آس پاس رہتے ہیں، فائدہ پہنچایا ہے؟ تم نے یہ چیزیں کیوں پڑھی ہیں؟ پروفیسر ہکسلے نے (انگلستان کے ایک مشہور فلسفی ہیں) تعلیم کی تعریف اس طرح بیان کی ہے: "میرے خیال میں اس شخص نے لبرل تعلیم پائی ہے اور جس کی اپنی نوجوانی میں اس طرح تربیت ہوئی ہے کہ اس کا جسم اس کی مرضی کا غلام ہے اور نہایت آسانی اور خوشی سے وہ سب کام انجام دیتا ہے جو ایک مشین کی حیثیت سے وہ کر سکتا ہے، اس کا ذہن ایک نہایت صاف شفاف، ٹھنڈا منظم انجن ہے جس کے تمام پرزے یکساں قوت اور ٹھیک حالت میں چل رہے ہوں... جس کا دماغ فطرت کی بنیادی حقیقتوں کا مخزن ہے.... جس کے جذبات کی اس طرح تربیت ہوئی ہے کہ وہ ایک مضبوط ارادے کے پابند، اور ایک لطیف ضمیر کے غلام ہیں..... جس نے تمام دنی اور چھوٹی باتوں سے نفرت کرنا اور اپنے برابر دوسروں کی عزت کرنا سیکھا ہے، ایسا شخص اور اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں جس نے میرے خیال میں لبرل تعلیم حاصل کی ہے، اس لیے کہ وہی فطرت سے ہم آہنگ ہوگا، وہی فطرت سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گا اور فطرت اس سے۔"

اگر یہی صحیح تعلیم ہے تو میں نہایت پُر زور طریقہ پر کہوں گا کہ جن علوم کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، انھیں ہم اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے کبھی نہیں استعمال کرتے ہوں، اس لیے خواہ تم ابتدائی تعلیم کرو یا اعلیٰ تعلیم کرو، اصل مقصد کے لیے ان میں سے کسی کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہیں انسان بناتی ہے اور نہ تمہیں اپنا فرض ادا کرنا سکھاتی ہے۔

تو دی:۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر مجھے آپ سے ایک اور سوال کرنا پڑے گا جو سب باتیں آپ مجھ سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اگر آپ نے اعلیٰ تعلیم نہ پائی ہوتی

تو آپ مجھ سے ان باتوں کی اسی طرح وضاحت کیسے کرتے، جیسی آپ نے کی ہے؟

مدیر:- آپ نے بہت صحیح فرمایا۔ لیکن میرا جواب بالکل سیدھا سادہ ہے۔ میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سمجھتا کہ اگر میں نے اعلیٰ یا ابتدائی تعلیم حاصل نہ کی ہوتی تو میری زندگی بے کار جاتی۔ اور نہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ چونکہ میں یہ کہہ رہا ہوں، اس لیے میں کوئی خدمت انجام دے رہا ہوں۔ لیکن میری یہ خواہش ہے کہ میں خدمت کروں اور اپنی اس خواہش کی تکمیل میں میں اپنی اس تعلیم کا استعمال کرتا ہوں جو میں نے پائی ہے اور اگر میں اس سے مفید کام بھی لیتا ہوں تو اس سے ان لاکھوں آدمیوں کو کوئی فائدہ نہیں، بلکہ یہ صرف آپ جیسے لوگوں کے لیے ہے اور یہی میرے دعوے کی دلیل ہے۔ آپ اور میں دونوں اس تعلیم کا شکار ہیں جو زیادہ تر جھوٹی تعلیم کہی جا سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس کے برے اثر سے آزاد ہو گیا ہوں اور میں اس لیے اپنے تجربے سے آپ کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں اور اس طرح میں آپ پر اس تعلیم کے نکمے پن کو ظاہر کر رہا ہوں۔

پھر اس کے علاوہ میں نے علم حاصل کرنے کو ہر حال میں برا نہیں کہا ہے۔ میں نے جو کچھ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے وہ صرف یہ کہ ہمیں اسے بت نہیں بنا لینا چاہیے۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہے۔ اپنی جگہ پر یہ مفید ہو سکتا ہے اور جب ہم اپنے حواس پر قابو پا لیں گے اور اپنی اخلاقیات کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر لیں گے تو اس کا اپنا مقام ہے اور اس وقت اگر ہم یہ تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو ہم اس کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ ایک زیور کی طرح یہ ہم پر پھب آ سکتا ہے۔ اس لیے اب یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس تعلیم کو جبری کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہمارا پرانا مدرسوں کا نظام کافی ہے۔ سیرت کی تعمیر اس میں پہلی جگہ رکھتی ہے اور یہی ابتدائی تعلیم ہے۔ ایک عمارت جو اس بنیاد پر کھڑی کی جائے گی، وہ قائم رہے گی۔ ("ہند سوراج" باب ۱۸ ۱۹۰۸ء)

سچّی تعلیم

گاندھی جی نے اپنے خیال کے مطابق "سچی تعلیم" یا صحیح تعلیم اس تعلیم کو کہا ہے جس میں ذہن، جسم اور دل تینوں کی تربیت کا خیال رکھا گیا ہو۔ ذہن اور جسم کی ہم آہنگ تربیت کے بارے میں انہوں نے ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

میرا عقیدہ ہے کہ ذہن کی صحیح تعلیم صرف جسمانی اعضا مثلاً ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، ناک وغیرہ کی صحیح مشق اور تربیت کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہ بچہ کے اندر جسمانی اعضا کا صحیح استعمال ہی اس کے ذہن کی تربیت کا سب سے بہتر اور موثر طریقہ ہے لیکن جب تک ذہن اور جسم کی نشوونما ساتھ ساتھ نہ ہو اور اسی کے ساتھ روح میں بیداری نہ آئے، صرف ذہنی نشوونما ہونا ایک بھونڈی سی چیز ہوگی۔ روحانی تربیت سے میری مراد دل کی تعلیم ہے اس لیے ذہن کی ایک صحیح اور مکمل نشوونما صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ بچے کی جسمانی اور روحانی دونوں قوتوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہو۔ ان سب سے مل کر ایک غیر منقسم کل بنتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ ان کی الگ الگ اور ایک دوسرے سے بے تعلق بھی تربیت ہو سکتی ہے۔

گاندھی جی نے سچی تعلیم کی ایک اور تعریف بھی کی ہے۔ یہی نہیں کہ اس تعلیم میں ذہنی، جسمانی اور روحانی قوا کی ہم آہنگ تربیت کا خیال رکھا گیا ہو، بلکہ ان کے نزدیک سچی تعلیم یہ بھی ہے کہ جو بزرگوں کی خدمت کا جذبہ پیدا کرے۔

ایک زمانہ میں سندھ میں سیلاب آنے کی وجہ سے سخت تباہی آئی تھی،

اور اس وقت سندھ کے سیلاب زدہ لوگوں کی امداد و اعانت کے لیے طلبار کی سخت ضرورت تھی۔ گاندھی جی لکھتے ہیں کہ ہمارے طلبار کے دلوں میں یہ خیال بٹھا دیا گیا ہے کہ جس وقت وہ تعلیم حاصل کر رہے ہوں، انھیں اپنی پڑھائی چھوڑ کر خواہ وہ عارضی ہو یا مستقل خدمت کے کاموں میں نہیں لگنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ اپنی تعلیم چھوڑ کر، خواہ وہ علمی ہو یا صنعتی، امدادی کاموں میں لگ جائیں جیسا کہ ان میں سے کچھ گجرات میں کر رہے ہیں تو ان کا کچھ نقصان نہ ہوگا بلکہ اور فائدہ ہی ہوگا۔ تمام تعلیم کا مقصد یقیناً خدمت ہونا چاہیے اور اگر کسی طالب علم کو جس وقت وہ تعلیم پا رہا ہو، خدمت کرنے کا موقع ملتا ہے تو اسے ایک نادر موقع سمجھنا چاہیے اور اسے تعلیم چھوڑنا نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ تعلیم کی تکمیل خیال کرنا چاہیے۔

گجرات کی مصیبت میں امداد کی اپیل پر جو لبیک کہا گیا ہے وہ بہت قابل تعریف بات ہے۔ سب سے پہلے جہاں سے امداد آئی وہ ادارے تھے ایک گرو کل کانگڑی اور دوسرا شانتی نکیتن۔ گروکل کے بارے میں آچاریہ رام دیو نے لکھا ہے کہ :-

"استادوں نے اپنی تنخواہ کا کچھ فیصد دیا ہے۔ اور برہمچاریوں (طلبا) نے اپنے کپڑے دھوبی سے دھلوانے کی بجائے خود دھو کر جو پیسے بچائے ہیں وہ انھوں نے دیئے ہیں اور لڑکیوں کے اسکول کی برہمچارنیوں (طالبات) نے کچھ عرصہ کے لیے گھی اور دودھ بند کر کے پیسے بچائے ہیں۔"

گجرات والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان امدادوں کے پیچھے بعض وقت بہت بڑی بڑی قربانیاں ہوتی ہیں۔ گروکل کے لڑکے اور لڑکیوں کی ان قربانیوں سے مجھے سوامی شردھانند جی کی اس امداد کا خیال آنے لگتا ہے،

تب وہ گروکل کے آجار یہ تھے اور انہوں نے جنوبی افریقہ کی ستیاگرہ میں اپنے ہم وطنوں کی امداد کی تھی۔ اس قسم کی قربانیوں کی ان لڑکے اور لڑکیوں سے ہم ہمیشہ امید کر سکتے ہیں جو گروکل کی اس قسم کی روایتوں میں پلے ہوں۔

(ینگ انڈیا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۷ء)

خود اعتمادی کی تعلیم

گروکل کے ایک بہی خواہ کی حیثیت سے مجھے اجازت ہونی چاہیے کہ میں ایک دو تجویزیں کمیٹی اور والدین کے سامنے رکھ سکوں۔ گروکل کے لڑکوں کی اگر انھیں خود اعتمادی اور خود کفیل بنانا ہے تو انکی مکمل صنعتی ٹریننگ ہونی چاہیے میرے خیال میں اس ملک کے اندر جہاں ۸۵ فیصد آبادی زراعت پیشہ ہے اور دس فیصد ان کسانوں کی ضروریات پورا کرنے میں لگی ہوئی ہے' ایسی صورت میں ہر نوجوان کی ٹریننگ کا یہ ایک جزو ہونا چاہیئے کہ اسے زراعت اور ہاتھ کی بنائی کا اچھا خاصہ عملی تجربہ ہو۔ اگر وہ اوزاروں کا صحیح استعمال جانتا ہو، ایک تختہ سیدھا چیر سکتا ہو اور ایک دیوار بنا سکتا ہو تو سول کے غلط استعمال سے گر نہ جائے تو اس میں اس کا کچھ نقصان نہیں ہے۔ ایک لڑکا جو یہ سب کچھ جانتا ہو وہ دنیا سے عہدہ برآ ہونے میں خود کو کبھی بے بس نہیں محسوس کرے گا اور اسے کبھی معاش کی فکر نہ ہوگی۔ حفظان صحت اور صفائی کے قوانین سے واقفیت اور بچوں کی پرورش کا طریقہ جاننا بھی گروکل کے لڑکوں کا ضروری جزو ہونا چاہیئے۔ میلے میں صفائی کے جو انتظامات تھے ان میں ابھی بہت کچھ اور کرنے کی ضرورت تھی۔ مکھیوں کی کثرت خود اپنی زبان حال

سے اپنی داستان بیان کر رہی تھی۔ یہ صفائی کے انسپکٹر ہمیں برابر متنبہ کر رہے تھے کہ صفائی کے معاملہ میں ہمارا انتظام ٹھیک نہیں۔ ان سب باتوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے کھانے کے بچے کھچے حصہ کو اور ہمارے پاخانہ وغیرہ کے ٹھیک طور سے زمین میں دفن کیے جانے کی کس قدر ضرورت ہے۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ ان سالانہ آنے والوں کی صفائی کے عملی سبق دینے کا ایک سنہری موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ لیکن یہ کام لڑکوں سے شروع ہونا چاہیئے۔ اس طرح منتظمین کو اس سالانہ اجتماع پر تین سو عملی صفائی کے استادوں کی ضرورت ہوگی۔ اور سب سے آخری بات لیکن سب سے اہم کہ والدین کو اور کمیٹی کو اپنے لڑکوں کو یوروپین لباس اور جدید تعیشات کی نقالی سے خراب نہ کرنا چاہیئے۔ یہ ان کے بعد کی زندگی میں رکاوٹیں ڈالیں گی اور یہ برہمچریہ کے منافی بھی ہیں انھیں ابھی سے ان برے میلانات کے خلاف کافی جنگ کرنا ہے جو ہم سب میں مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں۔ ہمیں ان کی آزمائشوں میں اضافہ کرکے ان کی جنگ کو اور مشکل نہیں بنا دینا ہے۔

(مہاتما گاندھی کی "تقریریں اور تحریریں" صفحہ ۳۵-۳۳۴۔

تعلیم کا محور

ایسے وقت میں جبکہ تعلیم میں سیرت کی تشکیل سے زیادہ ادبی علوم کی تحصیل پر زور دیا جا رہا ہے، پرنسپل جیکس کا حسب ذیل مضمون جو سنڈے اسکول کرانیکل میں شائع ہوا ہے، نہایت دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

"ہماری زندگی گویا ایک مسلسل حرکت ہے، جس میں سائنس کی رفتار اپنے استعمال کا پورے طور پر ساتھ نہیں دیتی ہے۔ جس نقطہ پر جہاں ہم سب کی ذمہ داری آکر رکتی ہے، وہ اس نقطہ سے ہمیشہ آگے ہوتا ہے جہاں سائنس کا ترقی پذیر قدم آکر رکا تھا۔ اس کا پیچھا کرنے والا جتنا ہی تیز قدم بڑھاتا ہے، اسی قدر بھاگنے والا تیزی سے بھاگتا ہے۔ سائنس کی اسی ناکامی کو میں ذمہ داری کا ساتھ نہ دینے میں، اس کی مجبوریاں کہتا ہوں۔ سائنس کا استعمال آپ کو یہ بتائے گا کہ بندوق کیسے بنائی جاتی ہے، لیکن وہ یہ نہیں بتائے گا کہ بندوق کب چلانی چاہیے اور کس پر چلانی چاہیے؟ آپ کہیں گے کہ علم اخلاق ان باتوں کا خیال رکھے گا۔ میں اس کا یہ جواب دوں گا کہ علم اخلاق جہاں بندوق کا صحیح استعمال بتاتا ہے، وہاں اسی کے ساتھ اس کا غلط استعمال بھی بتاتا ہے۔ اور چونکہ غلط استعمال سے میری ذاتی غرض صحیح استعمال کی بہ نسبت زیادہ پوری ہوتی ہے، اس لیے میرے پڑوسی کو گولی کھانے اور لٹنے کا ایک نیا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک برا آدمی جو علم اخلاق سے آراستہ ہے یعنی دوسرے معنی میں شیطان ہے۔ اگر میفس ٹافلز کا لندن یونیورسٹی میں علم اخلاق میں امتحان لیا جاتا تو اسے تمام انعامات ملتے۔ اس حیثیت سے علم اخلاق اور علم طبیعیات دونوں ایک ہی کشتی میں ہیں۔ ہم اس بھاگنے والی چیز کو کیا نام رکھیں جسے سائنس کبھی نہیں پکڑ سکتی۔ میں نے اس کا نام زندگی رکھا ہے، دوسرے اسے روح، نفس یا شاید قوت ارادہ کہیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا کہ ہم اسے کیا کہتے ہیں، جب تک ہم یہ سمجھتے رہیں کہ اس کا وجود ہے اور انسان کی قسمت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ تعلیم کو اسے اپنے پیش نظر رکھنا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جو تعلیم کی تمام

کوششوں اور مذہب کی تمام تگ و دو کا محور ہے، یعنی ذمہ داری کا خیال۔ اگر ہم اور تمام پہلوؤں کا خیال رکھیں اور ذمہ داری کے خیال کو ترک کر دیں تو ہمیں بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

(ینگ انڈیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۲۶ء)

سیرت کی تشکیل

اصل دشواری یہ ہے کہ لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ تعلیم صحیح معنوں میں کیا ہے؟ ہم تعلیم کی قیمت کا اندازہ اسی طرح کرتے ہیں جس طرح ہم زمین کی قیمت کا یا اسٹاک ایکسچینج مارکیٹ میں حصوں کا کرتے ہیں۔ ہم صرف ایسی تعلیم دینی چاہتے ہیں جس سے طلباء زیادہ سے زیادہ روپیہ کما سکیں ہم طالب علموں کی سیرت کی درستی کا مشکل سے کوئی خیال رکھتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو کمانے کی ضرورت نہیں، اس لیے انھیں تعلیم دینے کی کیا ضرورت ہے؟ جب تک اس قسم کے خیالات ہمارے اندر رہیں گے اس وقت تک ہمیں امید نہیں کہ ہم تعلیم کی صحیح قیمت کبھی جان سکیں گے

(ترجمہ از ہندی۔ انڈین اوپی نین)

ادبی تعلیم

میں نے ادبی تعلیم کو کبھی بت نہیں بنایا میرے تجربہ نے بخوبی یہ ثابت کر دیا ہے کہ ادبی تعلیم کسی شخص کے اخلاقی معیار میں ایک انچ کا بھی

اضافہ نہیں کرتی ہے۔ اور سیرت کی تعمیر کا تو اس سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ میری یہ پختہ رائے ہے کہ سرکاری مدرسوں نے ہمیں بہت نیچے گرا دیا ہے، بے یار و مددگار بنا دیا ہے اور خدا سے ہمیں بے تعلق کر دیا ہے۔ انھوں نے ہمیں بے اطمینانی سے بھر دیا ہے اور اس بے اطمینانی کو دور کرنے کا کوئی علاج نہیں بتایا ہے۔ انہوں نے ہم کو مایوس اور شکستہ دل بنا دیا ہے۔ انہوں نے ہمیں وہ بنا دیا ہے جو وہ ہم کو بنانا چاہتے تھے یعنی کلرک اور وکیل۔

(ینگ انڈیا، یکم جون ۱۹۲۱ء)

دل کی تعلیم

دل کی تعلیم کے بارے میں صرف ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کتابوں سے ہو سکتی ہے۔ یہ صرف استاد دل کے زندہ تعلق سے ممکن ہے اور ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں بھی استاد کون لوگ بنتے ہیں؟ کیا وہ ایمان اور کردار کے مرد اور عورت ہوتے ہیں؟ کیا خود انھوں نے دل کی تعلیم پائی ہے؟ کیا ان سے یہ توقع بھی کی جا سکتی ہے کہ وہ ان لڑکے اور لڑکیوں کے مستقل عناصر کی دیکھ بھال کر سکیں گے جو ان کے سپرد کئے جاتے ہیں؟ کیا نیچے کے مدرسوں کے لیے استاد رکھنے کا جو طریقہ ہے وہ خود کردار کے بننے ایک بڑی رکاوٹ نہیں ہے؟ کیا استاد دل کو زندہ رکھنے کے لئے کافی اجرت ملتی ہے؟ اور ہم جانتے ہیں کہ ابتدائی مدرسوں کے استاد

اپنی وطن دوستی کے لیے نہیں لیے جاتے ہیں۔ صرف ایسے لوگ آتے ہیں جنھیں اور کہیں کوئی کام نہیں مل سکتا ہے۔

(ینگ انڈیا، یکم ستمبر ۱۹۲۱ء)

دل کی پاکیزگی

شخصی زندگی کی پاکیزگی ایک صحیح تعلیم کی تشکیل کے لیے ناگزیر شرط ہے اور میری ہزاروں طلبا سے ملاقات اور اس خط و کتابت نے جو میں ان سے برابر رکھتا ہوں اور جس میں وہ اپنے تمام اندرونی جذبات ظاہر کر دیتے ہیں اور مجھ پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی کتنی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سب لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ میرا کیا مطلب ہے۔ ہماری زبانوں میں ایک بہت اچھا لفظ ہے جو طالب علم کا مرادف ہے، اور وہ لفظ برہمچاری ہے۔ ودیارتھی ایک بنایا ہوا لفظ ہے اور وہ 'برہمچاری' کا مرادف ہرگز نہیں ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ جانتے ہوں گے کہ برہمچاری لفظ کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی ہیں "خدا کا متلاشی"۔ ایک شخص جو اس طرح زندگی بسر کرے جس سے وہ کم سے کم وقت کے اندر خود کو خدا سے قریب کر دے۔ اور دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، اس بنیادی چیز پر متفق ہیں کہ کوئی مرد یا عورت ناپاک دل کے ساتھ اس عرش اعظم کے سامنے نہیں آسکتا ہے۔ ہمارا تمام ویدوں کا علم اور ان کا ذخیرۂ سنسکرت

تاملی، یونانی وغیرہ کا صحیح علم ہمارے لیے کسی کام کا نہیں، اگر ان سے دل کی پاکیزگی حاصل ہونے میں مدد نہیں ملتی ہے۔ تمام علم کا مقصد سیرت کی تشکیل ہونی چاہیے۔

(ینگ انڈیا، ۸ ستمبر ۱۹۲۷ء)

تعلیم میں سائنس کا استعمال

ایک طالب علم جو امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، لکھتے ہیں:-

"میں ان چند میں سے ہوں جو ہندوستان کے وسائل (خام اشیاء) کو ہندوستان کی غربت دور کرنے کے لیے بطور ایک ذریعے کے استعمال کرنے میں دل چسپی رکھتے ہیں۔ اس ملک میں یہ میرا چھٹا سال ہے۔ میرا خاص مضمون لکڑی کا کیمیاوی استعمال ہے۔ اگر مجھے ہندوستان کی صنعتی ترقی کا اس قدر کامل یقین نہ ہوتا تو میں یا تو کوئی انتظامی ملازمت اختیار کر لیتا یا فنی تعلیم حاصل کرتا...... کیا آپ پسند کریں گے کہ میں کسی صنعتی کا مندرجہ ذیل لکڑی جیسے یہ تمہ بنانے کے لیے گودا تیار کرنے کا کام ہے۔ آپ کا ہندوستان کے لیے ایک معقول انسانی صنعتی پالیسی اختیار کرنے کے سلسلے میں کیا خیال ہے؟

کیا آپ سائنس کی ترقی کے حامی ہیں؟ میری مراد ایسی ترقی سے ہے جو انسان کے لیے برکت کا باعث ہو، جیسے فرانس کے لوئی پیسٹر کا کام یا ٹورانٹو کے ڈاکٹر بیٹنگ کا کام " میں اس سوال کا جواب عام طور پر دینا چاہتا ہوں، اس لیے کہ بہت سے طلبا مجھ سے اس قسم کے سوالات پوچھتے رہتے ہیں اور اس لیے بھی کہ سائنس کے بارے میں میرے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مجھے ایسے صنعتی کاموں سے جیسے کہ طالب علم مذکور کے ذہن میں ہیں کسی قسم کا اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ صرف جو اعتراض ہے، وہ یہ کہ اسے لازمی طور پر انسانی نہیں کہوں گا۔ میرے نزدیک ہندوستان کے لیے انسانی صنعتی پالیسی سے مراد ہاتھ کی کتائی کا دوبارہ از سرِ نو شاندار احیاء ہے، اس لیے کہ صرف اسی کے ذریعہ وہ افلاس فوراً دور ہو سکتا ہے جو اس ملک کی لاکھوں انسانی جانوں کو ان کے جھونپڑوں کے اندر تباہ کر رہا ہے۔ اس کے بعد ہر وہ چیز شامل کی جا سکتی ہے جو اس ملک کی پیداواری صلاحیت کو بڑھا سکتی ہے۔ اس لیے میں چاہوں گا کہ تمام نوجوان جنھوں نے سائنٹفک ٹریننگ پائی ہے، وہ اپنی صلاحیتوں کو اگر ممکن ہو سکے تو چرخے کو ہندوستان کے جھونپڑوں میں پیداوار کا بہتر ذریعہ بنائیں۔ میں فی نفسہٖ سائنس کی ترقی کا مخالف نہیں ہوں برعکس اس کے میں مغرب کی سائنٹفک روح کا بہت قائل ہوں اور اگر اس میں کوئی کسر ہے تو اس وجہ سے کہ مغرب کا سائنس داں خدا کی ادنیٰ مخلوق کا کوئی خیال نہیں کرتا ہے۔ میں زندہ جانوروں کی چیر پھاڑ کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میں معصوم جانوروں کے ناقابلِ معافی ذبیحہ کا سخت مخالف ہوں جو سائنس اور نام نہاد انسانیت کے نام پر کیا جاتا ہے اور میں ان سائنس دانوں کی ان تمام دریافتوں کو جو بے گناہ خون سے آلودہ ہیں، بالکل

بے حقیقت سمجھتا ہوں، اگر زندہ جانوروں کی چیر پھاڑ سے دوران خون کا نظریہ دریافت نہ ہوا ہوتا پھر بھی بنی نوع انسان اسکے بغیر رہ سکتی تھی۔ اور میں وہ دن دیکھ رہا ہوں جب مغرب کے ایماندار سائنسداں حصول علم کے موجودہ طریقوں پر پابندیاں عائد کرینگے۔ آئندہ نسلیں ہمارے نہ صرف انسانی خاندان کو بلکہ ہر زندہ چیز کو ملحوظ خاطر رکھیں گے جسطرح ہم آہستہ آہستہ لیکن ثبات قدم کیساتھ یہ محسوس کرتے جا رہے ہیں کہ ہندوؤں کا یہ کہنا کہ وہ اپنی آبادی کے بڑے حصہ کی ذلت و خواری کے باوجود زندہ رہ سکتے ہیں یا مغرب کے لوگوں کا یہ خیال کہ وہ مشرقی و افریقی اقوام کی ذلت اور استحصال [illegible] کے باوجود ترقی کر سکتے ہیں، غلط ہے اسی طرح وہ وقت آئیگا جب ہم یہ بھی محسوس کریں گے کہ ہماری ادنیٰ مخلوق پر فوقیت انہیں ذبح کرنے کیلئے نہیں ہے بلکہ انکے اور اپنے دونوں کے فائدے کیلئے ہے، اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ قدرت نے انہیں بھی اس طرح روح عطا کی ہے جس طرح ہمیں کی ہے۔

(ینگ انڈیا۔ ۱۷ دسمبر [illegible])

طلبا کی دشواریاں

جنوبی ہند کے کسی ہائی اسکول کے استاد نے کچھ اقتباسات بھیجے ہیں جس میں طلبا کی بعض دشواریوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے اکثر تو بغیر ایک لمحے کے توقف کے دور ہو سکتی ہیں۔ طلبا کے ذہنوں کو [illegible] چاہیے استاد اپنے شاگردوں کو صرف بتا سکتے ہیں کہ [illegible] ریاست نے [illegible] کوئی [illegible] ہے۔ یہ بتا دینے کے بعد پھر انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے شاگردوں کے خیالات اور جذبات کو دبائیں۔ اسکا یہ مطلب نہیں کہ ان پر کسی ضبط و نظم کی پابندی نہیں۔ کوئی اسکول بغیر ضبط و نظم کے نہیں چل سکتا لیکن ضبط و نظم کو طلبا کی مجموعی نشو و نما پر عائد کی گئی پابندیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ [illegible] نہیں ہوتی جبکہ ان کے خیالات [illegible] کی [illegible]۔ [illegible]

[illegible]

(ینگ انڈیا، [illegible] ستمبر [illegible])

ذہنی نشوونما یا ذہنی انتشار؟

گاندھی جی نے اپنے ٹراونکور اور مدراس کے دورے کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ بہت سے طلبا اور پڑھے لکھے اشخاص جو مجھے ملے، وہ مجھے ذہنی نشوونما نہیں بلکہ ذہنی انتشار کا مجسمہ نظر آئے۔ یہ قصور اصل میں موجودہ نظام تعلیم کا ہے جو اس غلط میلان کو ابھارتا ہے، ذہن کو غلط راستے پر لے جاتا ہے اور اس طرح اس کے نشوونما کو مدد دینے کی بجائے اس میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ میں نے سیگاؤں میں جو تجربے کئے ہیں وہ اس بات کی مزید تصدیق کرتے ہیں، لیکن وہ ابھی اتنے مکمل نہیں ہوئے ہیں کہ انھیں بطور دلیل پیش کیا جا سکے۔ تعلیم پر میں اپنے جن خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں وہ میرے ذہن میں اس وقت سے چلے آرہے ہیں جب ۱۹۰۴ء میں میں نے جنوبی افریقہ میں ٹالسٹائی بستی بسائی تھی۔

جسم، ذہن اور روح کے مختلف قواء میں جس تال میل اور ہم آہنگی کی کمی پائی جاتی ہے اس کے اثرات ظاہر ہیں۔ وہ ہمارے گردوپیش ہر طرف موجود ہیں۔ ہم صرف اپنے خیالات کی مجبوری سے انھیں محسوس نہیں کر رہے ہیں۔

مثال کے طور پر گاؤں والوں کو لیجئے۔ بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک وہ دن رات اپنے کھیتوں میں بیلوں کی طرح جُتے رہتے ہیں۔ ان کا وجود ایک دُھرے کے کاموں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس میں ذہنی اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کی کوئی جھلک نہیں۔ اپنے ذہن اور رُوح کے نشوونما کا کوئی موقع نہ پاکر وہ جانوروں کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں۔ زندگی ان کے لیے ایک دردناک کہانی بن گئی ہے، اس کے برعکس ہمارے شہر کے اسکولوں اور کالجوں میں آج تعلیم کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ایک ذہنی انتشار ہے۔ ذہنی تربیت وہاں اعضا کے یا جسمانی کاموں سے بالکل بے تعلق سمجھی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ جسم کو تندرست رکھنے کے لیے کسی نہ کسی قسم کی ورزش ضروری ہے، اس فرض کو مصنوعی پیمانے کی تربیت جسمانی کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو نہایت مضحکہ خیز ہوتی اگر اس کے نتائج اس قدر افسوسناک نہ ہوتے۔ جو نوجوان یہ تربیت پاکر نکلتا ہے، وہ جسمانی طاقت میں ایک معمولی مزدور سے کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتا۔ معمولی جسمانی کام سے اس کے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ ذرا دھوپ میں نکلے تو چکر آنے کے لیے کافی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ سب بالکل قدرتی سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک دل کے قوا کا تعلق ہے وہ ایک نہایت غیر منظم طور پر بڑھنے اور نشوونما پانے کے لیے چھوڑ دیئے جاتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ایک اخلاقی اور روحانی بدنظمی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بڑی قابل تعریف بات سمجھی جاتی ہے۔

اس کے مقابل ایک ایسے بچہ کو لیجئے جس کی تعلیم میں دل کی تعلیم کا شروع سے خیال رکھا گیا ہو۔ فرض کیجئے کہ وہ کوئی مفید کام لیتا ہے، مثلاً بُنائی نجاری، زراعت وغیرہ اس کی تعلیم میں اور اس سلسلہ میں اسے مختلف [illegible]

اور اوزاروں کا جن سے وہ کام لے گا، پورا اور جامع علم دیا جاتا ہے۔ وہ جسمانی اعتبار سے ہی ایک اچھا اور تندرست جسم نہ ہوگا بلکہ اس میں ایک صحیح اور طاقتور ذہن بھی ہوگا جو صرف علمی کام کے لیے ہوگا بلکہ تجربہ کی کسوٹی پر پرکھا ہوا اور مضبوط بنیادوں پر ہوگا۔ اس کی ادبی تعلیم میں ریاضی اور دوسرے وہ علوم شامل ہوں گے جو اس کے پیشہ ورانہ کام میں مفید اور ضروری ہوں گے۔ اگر اس میں تفریح کے طور پر ادب کا اضافہ کر دیا جائے تو اس سے اس کی ایک مکمل، متوازن اور ہمہ جہتی تعلیم ہو جائے گی، جس میں ذہن، جسم اور روح تینوں کی برابر کارفرمائی ہوگی اور اس سے ایک قدرتی، ہم آہنگ کل تیار ہوگا۔ انسان نہ صرف ذہنی قوتوں کا نام ہے، نہ محض جانوروں کی سی جسمانی طاقت کا اور نہ ہی دل اور روح کا۔ مکمل انسان بننے کے لیے ان تینوں کا مناسب اور ہم آہنگ مجموعہ ضروری ہے اور یہی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ یہ کہنا کہ اس قسم کی تعلیم صرف اسوقت دی جا سکتی ہے، جب ہم اپنی آزادی حاصل کر لیں گے، میرے خیال میں ایسا ہے جیسا گاڑی کو گھوڑے کے آگے لگانا ہے۔ اگر ہم اپنے لاکھوں آدمیوں کو انکے اپنے اپنے پیشوں کے ذریعہ اس طرح تعلیم دیں اور یہ سکھائیں کہ انھیں سب کی بھلائی کے لیے زندہ رہنا ہے تو یقیناً ہماری آزادی ہم سے اور قریب آ جائیگی۔

(ہریجن۔ ۸ رمئی ۱۹۳۷ء)

خانگی تعلیم

جب میں جنوری ۱۸۹۷ء میں ڈربن اُترا تو میرے ساتھ تین بچے تھے، میری بہن کا لڑکا جو دس سال کا تھا اور میرے اپنے دو بچے جن میں سے

ایک نو سال کا اور دوسرا پانچ سال کا۔ میرے سامنے بڑا سوال یہ تھا کہ میں انہیں تعلیم کے لیے کہاں بھیجوں؟ میں انہیں ہندوستان بھیجنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے کہ میرا اس وقت بھی یہ خیال تھا کہ چھوٹے بچوں کو اپنے والدین سے جدا نہیں رکھنا چاہیے۔ جو تعلیم کہ بچے قدرتی طور پر ایک منظم خاندان میں حاصل کر سکتے ہیں، وہ دارالاقاموں میں ملنا ناممکن ہے۔ اس لیے میں نے اپنے بچوں کو اپنے ساتھ رکھا۔ میں ان بچوں پر اتنا وقت نہیں دے سکتا تھا جتنا میں دینا چاہتا تھا۔ میرے کافی توجہ نہ دے سکنے اور دوسرے ناگزیر اسباب کی بنا پر میں ان کے لیے وہ ادبی تعلیم مہیا نہ کر سکا جو میں چاہتا تھا اور میرے تمام لڑکوں کو اس بارے میں مجھ سے شکایت ہے۔ جب کبھی بھی وہ کسی ایم اے یا بی اے یا کسی میٹرک سے بھی ملتے ہیں تو وہ اپنی مدرسہ کی تعلیم کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔

پھر بھی میری رائے ہے کہ اگر میں کسی نہ کسی طرح ان کی تعلیم پبلک اسکولوں میں دلاتا، وہ اس تربیت سے محروم رہتے جو صرف کسی تجربہ کے مدرسہ میں ہو سکتی تھی یا والدین کی صحبت سے مل سکتی تھی۔ میں آج ان کی طرف سے اس قدر بے فکر نہ رہتا جتنا ہوں اور وہ مصنوعی تعلیم جو ان کی انگلستان یا جنوبی افریقہ میں مجھ سے الگ رہ کر ہوتی وہ ان میں سادگی اور خدمت کا جذبہ نہ پیدا کر سکتی، جو آج ان کی زندگی میں نظر آتا ہے اور ان کا مصنوعی طریقۂ زندگی میرے پبلک کاموں میں بہت بڑی رکاوٹ ہوتا۔ اس لیے اگرچہ میں آج انہیں ادبی تعلیم نہ ان کی خواہش اور نہ اپنی مرضی کے مطابق دے سکا ہوں پھر بھی جہاں تک میں اپنے گزشتہ زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں، مجھے یقین نہیں کہ میں نے اپنے فرائض میں کوئی کوتاہی کی ہے

اور نہ مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں نے انھیں پبلک اسکول میں کیوں نہیں بھیجا۔ مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے کہ آج میں اپنے بڑے لڑکے میں جو ناپسندیدہ باتیں پاتا ہوں، وہ میری اپنی ابتدائی غیر منظم اور غیر منضبط زندگی کا نتیجہ ہے۔ میں اس حصۂ زندگی کو نیم پختہ علم اور تفریح کا زمانہ سمجھتا ہوں، وہی میرے بڑے لڑکے کی اثر پذیر عمر کا زمانہ تھا اور قدرتاً وہ اس کو میرے شوق اور ناتجربہ کاری کا زمانہ نہیں سمجھتا بلکہ۔ برعکس اس کے وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہی میری زندگی کا سب سے روشن حصہ ہے اور جو تبدیلیاں بعد میں میری زندگی میں آئیں، وہ فریب اور نام نہاد روشن خیالی کے باعث تھیں اور وہ بھلے ہی ایسا سمجھے۔ وہ ایسا کیوں نہ سمجھے کہ میرا ابتدائی زمانۂ زندگی بیداری کا زمانہ تھا اور بعد کا انقلاب فریب اور خود پسندی کا زمانہ تھا۔ میرے دوستوں نے مجھ سے اکثر یہ سوالات کیے ہیں کہ اگر میں نے اپنے لڑکوں کو ادبی تعلیم دلائی ہوتی تو اس میں کیا نقصان ہوتا؟ مجھے اس طرح ان کے پر کترنے کا کیا حق تھا؟ میں ان کے ڈگری حاصل کرنے اور اپنی زندگی کی راہ آپ منتخب کرنے میں کیوں حائل ہوا؟

میں نہیں سمجھتا کہ ان سوالات میں کچھ بہت زیادہ وزن ہے۔ میرا بہت سے طالب علموں سے سابقہ پڑا ہے۔ میں نے اپنے تعلیمی تجربے خود یا اوروں کے ذریعہ دوسرے بچوں پر بھی آزمائے ہیں اور ان کے نتائج دیکھے ہیں۔ میرے علم میں آج بہت سے نوجوان ہیں جو میرے لڑکوں کے ہم عمر ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ انھیں اگر ان کی ذاتی حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ کسی طرح بھی میرے لڑکوں سے بہتر ہیں یا میرے لڑکے ان سے بہت کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔

مگر میرے تجربہ کا آخری نتیجہ مستقبل بتا سکتا ہے۔ میرا مقصد اس موضوع پر گفتگو کرنے سے یہ ہے کہ تاریخ تمدن کے ایک طالب علم کے نزدیک ایک منظم گھر کی تعلیم اور مدرسہ کی تعلیم میں فرق ہو سکتا ہے اور اگر والدین اپنی زندگیوں میں تبدیلیاں پیدا کریں تو ان کا اثر بچوں پر بھی پڑ سکتا ہے اس بات کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ایک تنہا طالب اپنی تلاش میں کہاں تک جا سکتا ہے اور یہ بھی کہ ایک آزادی کے طالب علم کو آزادی کی دیوی کیلئے کتنی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ اگر مجھ میں احساس نفس نہ ہوتا اور میں اپنے بچوں کی اس تعلیم سے مطمئن ہوتا جو اور بچوں کو نہیں مل سکتی ہے تو میں ان کو آزادی اور احساس نفس کی اس تعلیم سے محروم رکھتا جس نے انہیں ادبی تعلیم سے محروم رکھا ہے۔ اور اگر آزادی اور تعلیم میں انتخاب کرنا ہو تو کون نہیں کہہ سکتا کہ اول الذکر کو موخر الذکر پر ہر اعتبار ترجیح نہیں ہے۔ (خود نوشت سوانح عمری [illegible] صفحہ ۴۸ - ۲۴۷)

تعلیم کلرک پیدا کرنے کیلئے

اے مدارس کے طالب علمو! اور سارے ہندوستان کے طالب علمو! کیا تم جو تعلیم پا رہے ہو کہ تم اس منصب تک پہنچ سکو گے اور جو تمہاری بہتر سے بہتر صلاحیتوں کو نشوونما دے سکے گی؟ یا ایک ایسی تعلیم ہے جو سرکاری ملازمتیں یا کاروباری دفتروں میں کلرک پیدا کرنے کا رجحان رکھتی ہے؟ کیا تمہاری اس تعلیم کا مقصد جو تم پا رہے ہو صرف نوکری حاصل کرنا ہے خواہ وہ سرکاری دفتروں میں ہو یا اور دوسرے دفتروں میں ہو؟ اگر یہی تمہاری تعلیم کا مقصد ہے اور یہی مقصد تم نے اپنے سامنے رکھا ہے تو مجھے ڈر ہے کہ جو تصور شاعر نے اپنے ذہن میں قائم کیا تھا وہ ابھی بہت دور ہے جیسا کہ تم نے مجھے کہتے سنا ہے یا تم نے پڑھا ہوگا میں جدید تہذیب کا بہت کٹر مخالف چلا آ رہا ہوں۔ میں جیتا جاگتا ثبوت ہوں تم لوگوں کے سامنے [illegible] کیا ہو رہا ہے اور اگر تم اس تجربہ پر پہنچو

کہ یورپ خود آج اس جدید تہذیب کے نیچے دبا جا رہا ہے، پھر تمہیں اور تمہارے بزرگوں کو دوبارہ سوچنا ہوگا، قبل اسکے کہ تم یہ تہذیب اپنے مادر وطن میں لاؤ۔ مگر مجھ سے کہا جاتا ہے کہ "ہم کیا کر سکتے ہیں جبکہ ہمارے حکمراں خود یہ تمدن ہمارے مادر وطن کے اندر لا رہے ہیں؟" تم اسکے بارے میں ہرگز یہ غلطی نہ کرنا۔ میں ایک لمحہ کیلئے بھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ کوئی حکمراں یہ تمدن تمہیں دے سکتا ہے جب تک کہ تم خود اسے قبول کرنا نہ چاہو۔ (ماخوذ از "مہاتما گاندھی کی تقریریں اور تحریریں" صفحہ ۳۱۲، ۱۷ اپریل ۱۹۱۵ء)

ستیہ گرہ آشرم کا تعلیمی نصب العین

بہت سے طلبا جو گزشتہ سال یہاں مجھ سے گفتگو کرنے کے لیے آئے تھے، ان سے میں نے کہا تھا کہ میں عنقریب ہندوستان میں ایک ادارہ ستیہ آشرم کسی جگہ قائم کرنا چاہتا ہوں اور یہ اسی کے بارے میں آج میں تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں اور میں نے اپنی تمام پبلک زندگی میں یہ محسوس کیا ہے کہ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے اور جس کی ہر قوم کو ضرورت ہوتی ہے لیکن ہمیں شاید دنیا کی سب قوموں سے زیادہ ضرورت ہے، وہ کم سے کم اور کلی طور پر سیرت کی تشکیل ہے۔ اور یہی وہ رائے ہے جو اس بڑے محب وطن مسٹر گوکھلے نے بھی ظاہر کی ہے۔ (نعرہ تحسین) جیسا کہ آپ جانتے ہیں، وہ اپنی بہت سی تقریروں میں کہا کرتے تھے کہ ہم کچھ نہیں پائیں گے اور ہم کسی چیز کے مستحق نہیں ہوں گے جب تک کہ ہم میں اس چیز کی تقویت کے لیے کیریکٹر نہ ہو جو ہم چاہتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اس بڑی جماعت یعنی انجمن خدام ہند (سروینٹس آف انڈیا سوسائٹی) کی بنیاد ڈالی اور جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، اس کے دستور العمل

میں شائع ہوگیا ہے، مسٹر گوکھلے نے خاص طور پر لکھا ہے کہ سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ملک کی سیاسی زندگی میں روحانی اثر لایا جائے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہمارا اوسط یورپ کی بہت سی قوموں کے اوسط سے کم ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ان کا یہ خیال جسے میں فخر کے ساتھ اپنا سیاسی گرو کہتا ہوں، آیا واقعتاً کوئی حقیقت بھی رکھتا ہے لیکن میرا یہ خیال ضرور ہے کہ جہاں تک تعلیم یافتہ ہندوستان کا تعلق ہے یہ بہت حد تک شاید صحیح ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے نے غلطیاں کی ہیں، بلکہ اس لیے کہ ہم حالات کی پیداوار ہیں۔ بہرحال مجھے بھی یہ زندگی کا ایک اصول ہے جو میں نے تسلیم کر لیا ہے کہ کوئی آدمی خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اور اس نے کوئی کام بھی کیا ہو، وہ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک اس کے پیچھے کوئی مذہبی طاقت نہ ہو۔

لیکن مذہب کیا ہے؟ فوراً ہی یہ سوال کیا جائے گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ وہ مذہب نہیں جو آپ تمام دنیا کی مذہبی کتابیں پڑھ کر حاصل کرتے ہیں۔ یہ دماغ کا معاملہ نہیں ہے بلکہ دل کا معاملہ ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو ہم سے باہر ہو، بلکہ اسے ہمیں اپنے اندر سے پیدا کرنا ہے۔ یہ ہمیشہ ہمارے اندر موجود رہتی ہے، بعضوں کے اندر شعوری طور پر بعضوں کے اندر غیر شعوری طور پر۔ لیکن یہ موجود رہتی ہے اور آیا ہم اس مذہبی جبلت کو کسی خارجی مدد سے جگائیں یا اندرونی طور پر ابھاریں، اس سے بحث نہیں کہ ہم کس طرح کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہمیں کوئی چیز صحیح طور پر کرنی ہے اور وہ چیز دیرپا ہو تو اس روح کو بہرحال جگانا ہے ہماری مذہبی کتابوں نے بعض قاعدے ایسے مقرر کیے ہیں جو زندگی

کے ضابطے اور بدیہیات میں سمجھے جاتے ہیں۔ شاستروں میں یہ لکھا ہے کہ ان اصولوں پر چلے بغیر ہم کو مذہب کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا۔ ان اصولوں پر اتنے عرصہ تک بے چون و چرا ایمان رکھنے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرنے کے لیے میں نے اس ادارے کے قائم کرنے میں ان لوگوں کی شرکت ضروری سمجھی ہے، جو اس معاملہ میں میرے ہم خیال ہیں۔ اور میں آج آپ کے سامنے وہ قاعدے پیش کروں گا جو اس سلسلہ میں مرتب کئے گئے ہیں اور جن کی ہر ایک کو پیروی کرنی ضروری ہوگی جو اس آشرم کا ممبر بننا چاہتا ہے۔

یہ عہد پانچ "یمیہ" کہلاتے ہیں اور ان میں سب سے پہلا اور ضروری عہد یہ ہے :-

۱۔ سچائی کا عہد :-

وہ سچائی نہیں جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے، یعنی یہ کہ ہمیں حتی الامکان جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے، وہ سچائی نہیں جو یہ کہتی ہے کہ 'ایمانداری سب سے بہتر طریقہ زندگی ہے'، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ بہتر طریقہ نہیں ہے تو ہم اسے ترک بھی کر سکتے ہیں۔ بلکہ سچائی سے ہماری اصل مراد یہ ہے کہ ہم کو اس کے قوانین کے مطابق اپنی زندگی بہر صورت بسر کرنی ہے اور اس تعریف کے لیے میں پرہلاد کی زندگی کے مشہور واقعہ کی مثال دیتا ہوں۔ سچائی کی خاطر اس نے اپنے باپ سے بھی اختلاف کی جرأت کی اور اس نے باپ کے ساتھ انتقام کے ذریعے اپنی مدافعت نہیں کی بلکہ سچائی کی مدافعت میں

جیسا کہ وہ اسے سمجھتا تھا، بے چون و چرا بغیر اپنے باپ پر یا ان لوگوں پر جو باپ کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے تیار تھے، ہاتھ اٹھائے مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ کسی طرح دار کو خالی جانے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔ برعکس اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ساتھ اس نے وہ تمام صعوبتیں جھیلیں جو اس پر آئیں اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر سچائی کی فتح ہوئی۔ اس شکل میں نہیں کہ پرہلاد نے مصیبتیں اٹھائیں بلکہ وہ جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنی زندگی میں سچائی کے قانون پر عمل کر کے دکھائے گا۔

لیکن اگر وہ ان سختیوں کے اندر مر بھی جاتا تو وہ پھر بھی سچائی پر قائم رہتا۔ یہ وہ سچائی ہے جس پر میں عمل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کل ایک واقعہ دیکھا۔ یہ ایک معمولی واقعہ تھا لیکن یہ معمولی واقعے اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے۔ وہ واقعہ یہ تھا۔ میں ایک دوست سے باتیں کر رہا تھا جو مجھ سے علیحدہ بات کرنی چاہتا تھا اور ہم ایک نجی گفتگو میں مصروف تھے۔ ایک تیسرے صاحب آ گئے اور نہایت اخلاق سے پوچھنے لگے میں مخل تو نہیں ہو رہا ہوں؟ جس دوست سے میں باتیں کر رہا تھا وہ بولا "نہیں، نہیں۔ ہم کوئی نجی بات نہیں کر رہے ہیں۔" مجھے اس پر کسی قدر حیرت ہوئی، اس لیے کہ جب وہ مجھے الگ لے گئے تو جہاں تک ان صاحب کا تعلق ہے، یہ گفتگو نجی ہی تھی۔ لیکن وہ فوراً اخلاقاً بلکہ میں کہوں گا حد سے زیادہ اخلاقاً بول اٹھے کہ نہیں کوئی نجی بات نہیں ہے اور وہ (یعنی تیسرے صاحب) اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔ میں آپ سے یہ کہوں گا کہ یہ بات میری تعریف کے مطابق سچائی کے خلاف ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس شخص کو نہایت ادب سے لیکن نہایت صفائی کے ساتھ یہ کہنا چاہیے تھا

کہ "ہاں اس وقت تو آپ مخل ہو رہے ہیں"۔ اور اس سے اس شخص کو ذرہ برابر بھی ناگواری نہ ہوتی، اگر وہ شریف تھا اور ہمیں ہر ایک کو اس وقت تک شریف ہی سمجھنا چاہیئے جب تک کہ وہ اس کے خلاف نہ ثبوت دے۔ لیکن مجھ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس واقعہ سے بہر حال قوم کی شرافت کا پتہ چلتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ضرورت سے زیادہ حمایت ہوگی۔ اگر ہم ایسی ہی باتیں اخلاقاً کہتے رہے تو ہم حقیقت میں منافقوں کی ایک قوم بن جائیں گے۔ مجھے ایک بات یاد آتی ہے جو میں ایک انگریز دوست سے کر رہا تھا۔ وہ ابھی نوجوان تھا۔ اس وقت وہ ایک کالج کے پرنسپل ہیں اور ہندوستان میں کئی سال سے مقیم ہیں۔ وہ مجھ سے ہندوستانیوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ آیا برعکس اکثر انگریزوں کے ہیں 'نہیں' نہ کہوں جبکہ اس سے مراد 'نہیں' ہو اور مجھے اعتراف ہے کہ میں نے فوراً کہہ دیا 'ہاں' میں نے ان کے اس خیال سے اتفاق ظاہر کر دیا اور کہا کہ بے شک ہم جرأت اور صفائی سے 'نہیں' نہیں کہتے ہیں جبکہ ہم جس سے بات کر رہے ہیں اس کے جذبات کا پورا خیال کرنا چاہتے ہیں۔ اس آشرم میں ہم نے یہ قاعدہ بنایا ہے کہ ہم 'نہیں' کہیں گے، جب ہماری مراد 'نہیں' سے ہوگی خواہ اس کے نتائج کچھ ہی ہوں۔

یہ ہمارا پہلا قاعدہ ہے۔

پھر اس کے بعد ہم دوسرے قاعدے پر آتے ہیں:۔

۲۔ اہمسا کا اصول

اہمسا کے لفظی معنی ہیں جان نہ لینا۔ لیکن میرے نزدیک اس کے بہت

وسیع معنی ہیں اور یہ مجھے ایسے دائرے میں لے جاتا ہے جو بہت وسیع ہے اس دائرے سے بھی کہیں زیادہ بلند جہاں میں اہنسا کے معنی صرف جان نہ لینے کے سمجھ کر جانا چاہوں۔ "اہنسا" کے حقیقی معنی ہیں، آپ کسی کو ناخوش نہ کریں۔ آپ کسی ایسے شخص کے متعلق کوئی برا خیال دل میں نہ لائیں جو خود کو آپ کا دشمن سمجھتا ہے۔ مہربانی کر کے اس خیال کی نازک نوعیت پر ذرا غور کیجیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ "جسے آپ اپنا دشمن سمجھتے ہوں" بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ "جو خود کو آپ کا دشمن سمجھتا ہو"۔ اس لیے کہ جو شخص اہنسا کے اصول پر چلتا ہے اس کے یہاں کسی دشمن کی گنجائش نہیں۔ وہ دشمن کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو خود کو اس کا دشمن سمجھتے ہیں اور وہ اس کی وجہ سے خود کو مجبور پاتا ہے۔ اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ایسے لوگوں کے متعلق بھی کوئی برا خیال دل میں نہ لانا چاہیے۔ اگر ہم تشدد کا بدلہ تشدد سے دیں تو ہم اہنسا کے اصول سے ہٹ جائیں گے۔ لیکن میں اس سے اور آگے جاتا ہوں۔ اگر ہم کسی دوست کے فعل کو یا نام نہاد دشمن کے فعل کو برا سمجھیں تو اس صورت میں ہم اس اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ لیکن جب میں کہتا ہوں کہ ہمیں برا نہیں سمجھنا چاہیے تو میرا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں ان کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے۔ لیکن برا سمجھنے سے میرا یہ مراد ہے کہ دشمن کو کوئی نقصان پہنچے یا یہ کہ وہ ختم ہو جائے، نہ صرف ہمارے ہاتھوں بلکہ کسی اور کے ذریعہ بھی یا فرض کیجیے قدرت کے ہاتھوں۔ اگر ہم یہ خیال بھی دل میں لائیں تو ہم اہنسا کے اصول کی خلاف ورزی کریں گے۔ جو لوگ اس آشرم میں شریک ہوں گے انہیں عقلی طور پر اس معنی کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس اصول پر پورے طور پر عمل کرتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ یہ ایک نصب العین ہے

جہاں تک ہم کو پہنچنا ہے اور یہ ایک ایسا نصب العین ہے جہاں تک ہم اِس وقت بھی پہنچ سکتے ہیں اگر ہم میں ایسا کرنے کی استطاعت ہو لیکن یہ علم ہندسہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے جسے ہمیں زبانی یاد کرلیں اور نہ یہ اعلے ریاضی کے مشکل مسئلوں کے حل کرنے کی مانند ہے۔ یہ ان مسئلوں کے حل کرنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ آپ میں سے بہتوں نے ان مسئلوں کو حل کرنے میں رات رات بھر جاگ کر بسر کردی ہے۔ اگر آپ اس اصول پر چلنا چاہتے ہیں تو آپ کو بہت سی ایسی راتیں جاگ جاگ کر کاٹنی ہوں گی۔ اور بہت سے دماغی کرب اور بے چینیوں سے گزرنا ہوگا، قبل اس کے کہ آپ اُس منزل تک پہنچنا تو درکنار، اس کے قریب بھی آسکیں۔ یہ اصل منزل ہے اور اس سے کسی طرح کم نہیں۔ آپ کو اور مجھے اس منزل تک پہنچنا ہے اگر ہم یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ مذہبی زندگی کے کیا معنی ہیں میں اس سے زیادہ اس نظریہ کے بارے میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔ ایک شخص جو اس اصول کی صداقت پر یقین رکھتا ہے اور جب اس منزل کے پہنچنے کے قریب ہوتا ہے تو وہ ساری دنیا کو اپنے قدموں تلے پاتا ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ ساری دنیا کو اپنے قدموں کے نیچے لانا چاہتا ہے، بلکہ ایسا ہو ہی جاتا ہے اگر آپ اپنی محبت یعنی اہنسا اس طرح ظاہر کریں کہ آپ کا نام نہاد دشمن اس سے متاثر ہوتا ہے تو وہ اس محبت کا جواب یقیناً محبت سے دیگا۔ دوسرا خیال جو اس سے پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس قاعدے کے تحت منظم قتل کی کوئی جگہ نہیں ہے، کھلے بند قتل کی بھی کوئی جگہ نہیں اور کسی تشدد کی کوئی گنجائش نہیں، خواہ وہ اپنے ملک کے لیے ہو یا اپنے ان عزیزوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے بھی کیوں نہ ہو جو آپ کی زیر نگرانی ہوں۔ یہ آبرو کی بہت کمزور حفاظت ہوگی۔ 'اہنسا' کا اصول یہ کہتا

ہے کہ تم اُن لوگوں کی آبرو کی حفاظت جو تمہاری نگرانی میں رکھے گئے ہیں خود کو اس شخص کے ہاتھ میں دیکھ کر سکتے ہیں جو ظلم کرنے جا رہا ہے۔ اور اس سے کہیں زیادہ جسمانی اور دماغی ہمت کی ضرورت ہے جتنی مارنے کے لیے ہاتھ اٹھانے میں ہوتی ہے۔ تم میں کس حد تک جسمانی طاقت تو ہو سکتی ہے، ملا سے ہمت نہیں کرتا، اور تم اس طاقت کا استعمال بھی کر سکتے ہو۔ لیکن جب وہ ختم ہو جائے تو پھر کیا ہوگا؟ دوسرا شخص غیظ و غضب میں بھرا ہوا ہے اور تم نے اپنے تشدد کا مقابلہ اس کے تشدد سے کر کے اسے اور بھی غضبناک کر دیا ہے۔ اور جب اس نے تمہیں ختم کر دیا ہے تو اس کے تشدد کا بقیہ حصہ تمہارے ان عزیزوں کی عزت لوٹے گا جو تمہاری نگرانی میں رکھے گئے ہیں لیکن اگر تم بدلے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤ بلکہ اپنے عزیزوں اور اپنے مخالف کے درمیان اپنی جگہ پر کھڑے رہو، اور بغیر بدلہ لیے مار کھاتے رہو، تو پھر کیا ہوگا؟ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس کا تمام تشدد تم پر ختم ہو جائے گا اور تمہارے ذمہ جو لوگ رکھے گئے ہیں وہ صاف بچ جائیں گے۔ اس نظام زندگی میں حب وطن کا کوئی ایسا تصور نہیں جو ان جنگوں کو جائز قرار دے جو آج تم یورپ میں دیکھ رہے ہو۔

پھر اس کے بعد

ترکِ تاہل

کا اصول یہ آتا ہے۔ جو لوگ قومی خدمت کرنا چاہتے ہیں یا جو خدا سے حقیقی
محبت کی زندگی کی جستجو رکھتے ہیں۔ جو سچے ہیں، انھیں ترکِ ازدواج کی زندگی

بسر کرنی چاہیئے خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ۔ شادی صرف ایک
عورت کو مرد سے قریب کر دیتی ہے اور وہ ایک خاص معنی میں دوست ہو جاتے
ہیں اور وہ نہ اس زندگی میں ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور نہ آنے والی
زندگیوں میں۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے شادی کے تصور میں شہوانی خواہشات
لازماً داخل ہوں۔ خواہ ایسا ہو یا نہ ہو، لیکن یہ ہے جو ان کے سامنے پیش کیا
جاتا ہے جو آشرم میں داخل ہونے کے لیے آتے ہیں۔ میں اسوقت اس سے زیادہ
تفصیل سے اس پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔
پھر اس کے بعد

۴۔ ترک لذّات

کا عہد ہے۔
ایک شخص جو اپنی جوانی کے جذبات پر قابو پانا چاہتا ہے، وہ آسانی
سے ایسا کر سکتا ہے اگر وہ اپنی لذتوں پر قابو پالے۔ مجھے یقین ہے کہ اس عہد
پر عمل کرنا سب سے مشکل کام ہے۔ میں ابھی وکٹوریا ہوسٹل دیکھ کر آرہا ہوں۔
میں نے وہاں دیکھا۔ لیکن اس کا مجھ پر کوئی ناگوار اثر نہیں ہوا اگرچہ ناگوار
ہونا چاہیئے تھا، لیکن اب میں اس کا بہت عادی ہو گیا ہوں کہ بہت سے باورچی
خانے ہیں اور وہ باورچی خانے۔ اس بنیاد پر نہیں قائم ہیں کہ ان سے ضروریات
کی تمہید پوری ہوتی ہیں، بلکہ وہ باورچی خانے اس غرض سے رکھے گئے ہیں کہ لوگ مرچ
مسالوں کا استعمال اور وہ بھی ٹھیک اس مقدار میں مرچ مسالوں کا استعمال کریں
جو ان جگہوں پر ہوتا ہے، جہاں سے وہ آئے ہیں اور چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ

جو برتنوں کے لیے مختلف درجے اور مختلف باورچی خانے ہیں جہاں ان مختلف
طبقوں کے لوگوں کے ذائقوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ محض
ذائقہ کی غلامی ہے نہ کہ اس پر قابو پانا۔ جب تک ہم اپنے دماغوں کو اس
عادت سے پاک نہ کریں گے اور جب تک ہم اپنی آنکھیں چاٹ کی دکانوں
اور ان تمام باورچی خانوں کی طرف سے بند نہیں کریں گے اور جب تک
ہم صرف ان چیزوں پر مطمئن نہ ہوں گے جو ہماری جسمانی صحت کے قائم
رکھنے کے لیے ضروری ہیں اور جب تک ہم محرک، گرم اور برانگیختہ کرنے والے
مسالوں سے جو ہم اپنے کھانوں میں ڈالتے ہیں نجات پانے کے لیے تیار نہ
ہوں گے اس وقت تک ہم کبھی اپنے حد سے زیادہ اور غیر ضروری محرکات
پر قابو نہ پا سکیں گے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ
ہم اپنے خود کا برا استعمال کرنے لگیں گے اور ہم اس اعتماد کا بھی برا استعمال
کرنے لگیں گے جو ہم پر رکھا گیا ہے اور ہم جانوروں اور درندوں سے
بھی بدتر ہو جائیں گے۔ کھانا پینا اور جذبات ہم میں اور جانوروں میں مشترک
ہیں لیکن کیا تم نے کبھی کسی گھوڑے یا گائے کو اپنے ذائقہ کا غلط استعمال
کرتے ہوئے پایا ہے جیسا کہ ہم کرتے ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ تہذیب کی یا حقیقی
زندگی کی علامت ہے کہ ہم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی تعداد کو اس حد
تک بڑھاتے جائیں کہ ہمیں خود ان کا پتہ نہ ہو اور طرح طرح کے کھانوں کے پیچھے
اس طرح پڑے رہیں کہ ہم بالکل پاگل بن جائیں اور اخبارات کی طرف دوڑیں
جو ان کھانوں کے اشتہارات شائع کرتے رہتے ہیں۔

۵۔ چوری نہ کرنا

پانچواں عہد آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب ایک طرح کے چور ہیں۔ اگر ہم کوئی چیز لیں جس کی ہمیں خود فوری ضرورت نہ ہو اور اسے رکھو ذہن تو میں اسے کسی سے چوری کر کے لاتا ہوں۔ میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ یہ قدرت کا بنیادی قانون ہے اور اس میں کوئی استثنا نہیں کہ قدرت ہمارے روزمرہ کے استعمال کے لیے کافی پیدا کرتی ہے اور اگر ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق لے اور اس سے زیادہ نہ لے تو اس دنیا میں پھر کوئی غریبی نہ ہوگی، اس دنیا میں کوئی آدمی بھوک سے نہیں مرے گا۔ لیکن جب تک ہم میں یہ عدم مساوات رہے گی، اس وقت تک ہم چوری کرتے رہیں گے۔ میں کوئی اشتراکی نہیں ہوں اور میں ان لوگوں کو ان کی ملکیت سے محروم کرنا نہیں چاہتا، جو مالک ہیں۔ لیکن میں اتنی بات ضرور کہوں گا، ذاتی طور سے، کہ جو لوگ تاریکی میں روشنی دیکھنا چاہتے ہیں، انھیں اس قاعدے پر چلنا ہوگا۔ میں کسی کو اس کی ملک سے محروم کرنا نہیں چاہتا۔ میں اس وقت 'اہمسا' کے قاعدے کے خلاف کروں گا اگر کسی شخص کے پاس مجھ سے زیادہ ہے تو اس کے پاس رہنے دو لیکن جہاں تک میری اپنی زندگی کے درست کرنے کا سوال ہے، میں یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے کوئی ایسی چیز نہیں لینی چاہیے جس کی مجھے ضرورت نہ ہو۔ ہندستان میں ہمارے ہاں ۳۰ لاکھ آدمی ایسے ہیں جنہیں ایک وقت کھانا ملتا ہے۔ اور اس کھانے میں بھی ایک روٹی ہوتی ہے جس پر کوئی گھی نہیں ہوتا اور

ایک ذلی نمک کی۔ آپ کو اور مجھے اس کا کوئی حق نہیں جو ہمیں ملتا ہے جب تک کہ ان تیس لاکھ آدمیوں کو کھانا اور کپڑا میسر نہ آجائے۔ آپ کو اور مجھے جنہیں اچھی طرح معلوم ہے اپنی ضروریات کو کم کرنا چاہیے اور اپنا خوشی سے فاقہ کرنا چاہیے تاکہ انہیں کھانا، کپڑا اور آرام میسر آسکے۔

پھر ملک نہ رکھنے کا عہد ہے جو قدرتی طور پر اس کا نتیجہ ہے۔

اب میں

۶۔ سودیشی

کی طرف آتا ہوں۔ سودیشی کا عہد ایک ضروری عہد ہے لیکن آپ سودیشی زندگی اور سودیشی روح سے ناواقف ہیں۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم اپنی زندگی کے ایک مقدس قانون سے منحرف ہوتے ہیں، اگر ہم اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنے پڑوسی کو چھوڑ کر کہیں اور جاتے ہیں۔ اگر ایک شخص بمبئی سے یہاں آتا ہے اور آپ کو سامان دیتا ہے تو آپ کو بمبئی کے اس تاجر کی مدد کرنا جائز نہیں، اگر آپ کے ہاں خود تاجر موجود ہے جو اسی مدراس میں پیدا ہوا ہے اور یہیں بڑھا پلا ہے۔ یہ میرا سودیشی کا نظریہ ہے۔ آپ کے گاؤں میں اگر گاؤں کا نائی ہے تو آپ کو اس کی مدد کرنی ہے، اس اعلیٰ نائی کے مقابلے میں جو مدراس سے آئے۔ اگر تم اس بات کو ضروری سمجھتے ہو کہ تمہارے گاؤں کا نائی مدراس کے نائی کے معیار پر پہنچے تو تم اس کو تربیت دے سکتے ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ وہ اپنا پیشہ سیکھے تو اسے مدراس بھیجو۔ جب تک تم یہ نہ کرو گے اس وقت تک تمہارا

کسی اور نائی کے پاس جانا جائز نہیں۔ یہ ہے سودیشی۔ اسی طرح جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو ہمیں ہندوستان میں نہیں مل سکتی ہیں تو ہمیں ان کے بغیر کام چلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں بہت سی ایسی چیزوں کے بغیر کام چلانا پڑے گا جنہیں ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ تم یقین رکھو کہ جب تمہارا ایسا ذہن بن جائے گا تو تم دیکھو گے کہ تمہارے سر سے بہت سا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے جس طرح سے کہ اس بے نظیر کتاب 'زائر کی یاترا' میں زائر نے کہا تھا۔ ایک وقت ایسا آیا جبکہ زائر کے کندھوں سے وہ بھاری بوجھ جو وہ اٹھائے لیے جا رہا تھا، غیر شعوری طور پر گر گیا اور وہ اس وقت سے کہیں زیادہ ہلکا پھلکا انسان بن گیا جبکہ اس نے یہ سفر شروع کیا تھا۔ چنانچہ تم بھی جب سودیشی کی یہ زندگی اختیار کر لو گے تو اس سے کہیں زیادہ ہلکے پھلکے انسان بن جاؤ گے جتنا کہ تم اس وقت ہو۔

اس کے بعد

۷۔ بے خوفی

کا نمبر آتا ہے۔ میں نے ہندوستان کا دورہ کرنے میں یہ پایا کہ ہندوستان بالخصوص تعلیم یافتہ ہندوستان ایک ایسے خوف میں مبتلا ہے جس نے اس کے تمام ہاتھ پاؤں شل کر دیئے ہیں۔ ہم باہر اپنی زبان نہیں کھول سکتے ہیں۔ ہم باہر اپنی رائے ظاہر نہیں کر سکتے ہیں، ہم وہ راز میں رکھ سکتے ہیں اور مخفی طور پر ان کے بارے میں گفتگو بھی کر سکتے ہیں، اور ہم اپنے گھر کی چہار دیواری کے اندر جو چاہیں سو کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ باتیں عام اظہار کے لیے نہیں ہوتیں۔ اگر ہم نے خاموش رہنے کا عہد لیا ہوتا تو مجھے کچھ نہیں کہنا تھا جب ہم لوگوں کے سامنے

زبان کھولتے ہیں تو ہم ایسی باتیں کہتے ہیں جن پر ہمارا اعتقاد نہیں۔ اب میں نہیں سمجھتا کہ یہ ہر اس شخص کا تجربہ نہیں ہے جو ہندوستان میں تقریر کرتا ہے۔ پھر میں تم سے کہتا ہوں کہ صرف ایک ذات ہے، اگر ذات کا لفظ استعمال کرنا صحیح ہے جس سے ہمیں ڈرنا ہے، اور وہ خدا ہے۔ جب ہم خدا سے ڈریں گے تو ہمیں پھر کسی انسان کا خوف نہ ہوگا، خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ اور اگر تم سچائی کے عہد پر کسی شکل اور صورت میں چلنا چاہتے ہو تو بے خوفی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ چنانچہ تم بھگوت گیتا میں پاؤ گے کہ بے خوفی برہمن کی ضروری علامت بتائی گئی ہے۔ ہمیں تاریخ نے ڈرپوک بنا دیا ہے اور اس لیے ہم ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ ایک شخص جو خدا سے ڈرتا ہے اسے یقیناً کسی دنیاوی نتیجے کا ڈر نہ ہوگا۔ قبل اس کے کہ ہم یہ سمجھنے کا دعویٰ کریں کہ مذہب کیا ہے، اور قبل اس کے کہ ہم ہندوستان کی رہنمائی کا بیڑا اٹھائیں، کیا تم ایسا نہیں سمجھتے کہ ہمیں بے خوفی کی یہ عادت اپنے اندر پیدا کرنی ہے؟ اپنے ہم وطنوں کو خوف کا ایسا ہی شکار ہوتے ہیں جیسے ہم شکار ہیں؟ اب ہمیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ بے خوفی کا عہد کس قدر ضروری اور اہم ہے۔

پھر

۸-۱ اچھوتوں کے متعلق

عہد کا نمبر آتا ہے۔

ایک اور دھبہ جو ہندو مذہب آج اپنے دامن پر لیے ہوئے ہے۔ میں یہ یقین نہیں کرتا کہ یہ مدتہائے دراز سے چلا آ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ چھوا چھوت کی یہ شرمناک، اسپرٹ ہم میں اس وقت سے آئی ہے جب ہم اپنے

زمانہ کے چکر میں سب سے انحطاط کے دور میں تھے اور یہ برائی ہم میں پیدا ہو گئی اور اب تک چلی آرہی ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک لعنت ہے جو ہم میں پیدا ہوئی اور جب تک یہ لعنت ہم میں باقی رہے گی اُس وقت تک ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ ہر مصیبت جو ہم پر اس پاک ملک میں آئے گی، وہ ہمارے اس بڑے اور دائمی جرم کی جس کے ہم مرتکب ہو رہے ہیں، مناسب اور صحیح سزا ہے۔
ایک شخص جو محض اپنے پیشہ کی وجہ سے اچھوت سمجھا جائے، ہماری سمجھ سے باہر ہے اور تم طالب علموں کی دُنیا، جو یہ جدید تعلیم حاصل کر رہے ہو، اگر تم اس جرم کے مرتکب ہوئے تو اس سے بہتر یہ ہوتا کہ تم کسی طرح کی تعلیم ہی نہ پاتے۔
اس میں شبہ نہیں کہ ہم بہت بڑا نقصان اُٹھا رہے ہیں۔ اگرچہ تم یہ محسوس کر رہے ہو گے کہ اس زمین پر ایک انسان بھی ایسا نہ ہونا چاہیے، جو اچھوت سمجھا جائے، پھر بھی تم خاندان والوں کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے ہو، تم اپنے ماحول کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے ہو، اس لیے کہ تمہارا تمام خیال ایک غیر ملکی زبان کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے اور تمہاری تمام محنت اس کے حصول پر صرف ہوتی ہے۔
اسی لیے ہم نے اس آشرم میں یہ اصول بھی رکھا ہے کہ ہماری

۹۔ تعلیم دیسی زبانوں کے ذریعہ

ہو گی —— یورپ میں ہر مہذب آدمی نہ صرف اپنی زبان سیکھتا ہے بلکہ دوسری زبانیں بھی، اور وہ یقیناً تین یا چار زبانیں ہوتی ہیں۔ اور باوجود اس کے یورپ میں ایسا کرتے ہیں، ہم ہندوستان میں زبان کا مسئلہ حل کرنے کی غرض سے اس آشرم میں زیادہ سے زیادہ جتنی ہندوستانی زبانیں ممکن ہیں، سیکھتے ہیں۔ اور

میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جتنی دشواری انگریزی زبان کی مہارت حاصل کرنے میں ہوتی ہے اتنی دشواری ان زبانوں کے حاصل کرنے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ہمیں انگریزی زبان میں مہارت کبھی نہیں ہو پاتی۔ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر ہمارے لیے ایسا کرنا ممکن بھی نہیں ہے۔ ہم اپنے خیالات کا اظہار اس صفائی سے کبھی نہیں کر سکتے جس صفائی سے ہم اپنی مادری زبان میں کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے بچپن کے تمام سالوں کو اپنے حافظے سے مٹا دینے کی کیسے جرأت کر سکتے ہیں۔ مگر جب ہم اپنی اعلیٰ زندگی ایک غیر ملکی زبان کے ذریعہ شروع کرتے ہیں، تو یہی کرتے ہیں۔ اس سے ہماری زندگی میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جس کی ہمیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔ اور اب ہم ان دونوں چیزوں یعنی تعلیم اور چھوت چھات میں تعلق دیکھیں گے۔ چھوت چھات کی اسپرٹ باوجود علم اور تعلیم کے عام ہونے پر بھی اس قدر سختی سے قائم ہے۔ تعلیم نے ہمیں اس جرم کے ارتکاب میں اور مدد پہنچائی ہے۔ لیکن ہم خوف میں بھی مبتلا ہیں اور اسی لیے ہم اس نظریے کو اپنے گھروں پہ پھیلنے جا سکتے ہیں۔ اور ہمیں اپنے خاندان کی روایات اور اپنے خاندان کے لوگوں کا جھوٹا احترام بھی ہے۔ تم کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے والدین سے یہ نہیں کہہ سکے کہ میں اس جرم میں شریک نہیں ہونا چاہتا تو وہ مر جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ پرہلاد نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اس کا باپ مر جائے گا اگر اس نے وشنو کا مقدس نام اپنی زبان سے نکالا۔ برعکس اس کے خود اپنے باپ کی موجودگی میں جب اس نے مقدس نام کا ورد کیا تو اس کا سارا گھر ایک سرے سے دوسرے تک گونج اٹھا۔ اسی طرح تم اور ہم بھی اپنے والدین کی موجودگی میں ایسا کر سکتے ہیں۔ اگر یہ سننے کے بعد بعض ان میں سے صدمے سے مر جائیں تو یہ کوئی بہت بڑی مصیبت نہ ہوگی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے بعض سخت

دھکے سنبھالنے پڑیں۔ جب تک ہم ایسی چیزوں پر اڑے رہیں گے جو نسلوں سے چلی آرہی ہیں، اس وقت تک اس قسم کے واقعات ہوتے رہیں گے۔ لیکن ایک قدرت کا بھی قانون ہے اور اس اعلیٰ قانون کی اتباع میں والدین کو اور مجھے اس قسم کی قربانی دینی ہوگی۔

اور اس کے بعد نمبر آتا ہے۔

۱۰۔ ہاتھ سے کتائی

کا - تم پوچھ سکتے ہو کہ "ہم اپنا ہاتھ کیوں استعمال کریں" اور کہہ سکتے ہو کہ "ہاتھ سے کام تو انہیں کرنا چاہیے جو ان پڑھ ہیں۔ میں صرف ادب کا مطالعہ کرنے اور سیاسی مقالات پڑھنے میں وقت دے سکتا ہوں۔" میرا خیال ہے کہ ہمیں محنت کی عزت کرنی چاہیے۔ اگر ایک نائی یا موچی کالج جاتا ہے تو اسے نائی یا موچی کا پیشہ نہ چھوڑنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نائی کا پیشہ بھی ایسا ہی اچھا ہے جیسا طب کا۔

۱۱۔ سیاست

سب سے آخر میں یہ کہ جب تم نے ان تمام قواعد کی پابندی کر لی، اس وقت یہ سمجھنا اور اس سے پہلے نہیں کہ تم اب سیاست میں آسکتے ہو اور جی بھر کر اس میں حصہ لے سکتے ہو اور پھر تم یقیناً کبھی غلطی نہیں کرو گے۔ سیاست بغیر مذہب کے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اگر طلبا اس ملک کے سیاسی پلیٹ فارم

پر چھا جائیں تو میرے خیال میں یہ سیاسی نشو و نما کی کوئی صحت مند علامت نہیں ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تم کو اپنی طالب علمی کی زندگی میں سیاست کا مطالعہ نہیں کرنا چاہیئے۔ سیاست ہماری زندگی کا ایک جزو ہے۔ ہمیں اپنے قومی اداروں کو سمجھنا چاہیئے اور ہمیں اپنی سیاسی نشو و نما اور دوسری باتوں کو بھی سمجھنا چاہیئے۔ ہم یہ بچپن سے شروع کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے اسکول میں ہر بچے کو اپنے ملک کے سیاسی اداروں کا سمجھنا سکھایا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ ملک کس طرح نئے جذبات، نئے حوصلے اور نئی زندگی سے معمور ہو رہا ہے۔ لیکن ہم مذہبی اعتقاد کی مستحکم اور پائدار روشنی چاہتے ہیں، ایسا اعتقاد نہیں جس کا تعلق دماغ سے ہو بلکہ ایسا اعتقاد جس کا نقش دل پر ہو۔ سب سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ تم میں مذہبی احساس پیدا ہو اور جونہی تم نے یہ کر لیا میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کا پورا شعبہ ہمارے لیے کھل گیا اور پھر یہ طالب علموں کا اور ہر ایک کا مقدس فرض ہونا چاہیئے کہ اس مکمل زندگی میں حصہ لے تاکہ پھر جب وہ بڑے ہوں اور کالج سے فارغ ہو جائیں تو پھر وہ ان آدمیوں کی طرح زندگی کی اس جنگ میں حصہ لیں جو ہر طرح پر لیس ہوتے ہیں۔ اکثر ہوتا ہے کہ سیاسی زندگی زیادہ تر طالب علمی کے زمانہ تک محدود رہتی ہے۔ جونہی طالب علم کالج چھوڑتے ہیں اور طالب علمانہ زندگی ختم کرتے ہیں، وہ گمنامی میں جا پڑتے ہیں، معمولی ملازمتوں کی تلاش میں پھرتے ہیں، چھوٹے موٹے معاوضوں پر راضی ہو جاتے ہیں، خدا کی حقیقت سے بے بہرہ ہوتے ہیں، تازہ ہوا اور روشنی سے محروم اور اس حقیقی آزادی سے نا آشنا جو ان قوانین کی پابندی سے پیدا ہوتی ہے جن کو میں نے تمہارے سامنے ذکر کیا ہے۔

ماخوذ از "طلباء سے خطاب" مطبوعہ ستمبر ۱۹۴۳ء

(گاندھی جی ۱۹۱۰ء میں جب جنوبی افریقہ میں تھے تو انہوں نے ڈربن سے قریب 'فی نکس' نام کے ایک اسٹیشن سے ۲½ میل پر ایک بستی بسائی تھی، جس میں اپنے ساتھ تمام کام کرنے والوں کو لاکر بسایا تھا۔ اس میں ہندوستانی بھی تھے اور غیر ہندوستانی بھی۔ اس بستی میں کھیتی باڑی کا جہاں کام ہوتا تھا، اسے 'ٹالسٹائے فارم' کہتے تھے۔ اسی فارم پر گاندھی جی نے بچوں کی تعلیم کا ایک تجربہ بھی شروع کر رکھا تھا جس کا تذکرہ ذیل کی سطروں میں کیا گیا ہے۔ (مرتب)

ٹالسٹائے فارم پر تعلیم کا تجربہ

جوں جوں ہمارے فارم کے رہنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی یہ ضروری معلوم ہوا کہ اس کے لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی انتظام کیا جائے۔ ان میں ہندو، مسلمان، پارسی اور عیسائی سب ہی مذہب کے تھے اور چند ہندو لڑکیاں بھی تھیں۔ ان کے لیے خاص استاد رکھنا ممکن نہ تھا اور میں نے اسے ضروری بھی نہ سمجھا۔ مشکل یہ تھی کہ لائق ہندوستانی استاد بہت کم ملتے تھے اور ان میں سے کسی کو کم تنخواہ پر جوہانسبرگ سے ۲۱ میل دور جانا منظور بھی نہیں تھا۔ ادھر ہم لوگوں کے ہاں روپے پیسے کی بھی کمی تھی۔ میرے خیال میں باہر سے استاد بلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں مروجہ نظام تعلیم کا قائل نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ تجربہ اور مشاہدہ سے معلوم کروں کہ صحیح طریقۂ تعلیم کیا ہے؟ اتنا مجھے یقین تھا کہ خاندانی حالات کے اندر بچوں کی صحیح تعلیم والدین ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے اور اس صورت میں باہر سے کم سے کم امداد لی جائے، اور ٹالسٹائے فارم ایک

خاندان کی حیثیت رکھتا تھا جس میں میں بمنزلہ باپ کے تھا اور اس لیے جہاں تک ممکن ہوا بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری مجھے لینی چاہیئے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تصور بھی خامیوں سے خالی نہ تھا۔ تمام بچے بچپن سے میرے ساتھ نہ تھے، ان کی تربیت مختلف حالات اور ماحول کے اندر ہوئی تھی اور وہ سب ایک مذہب کے بھی نہ تھے۔ ایسی صورت میں ان بچوں کی تعلیم کا حق خاندان کا بڑا بن کر بھی کیسے ادا کر سکتا تھا؟

لیکن میں تعلیم میں تہذیب نفس یا تعمیر سیرت کو ہمیشہ مقدم سمجھتا تھا اور چونکہ مجھے اطمینان تھا کہ اخلاقی تربیت سب بچوں کو یکساں دی جا سکتی ہے۔ خواہ وہ کسی عمر اور کسی خاندان کے ہوں، میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں ان کے باپ کی طرح چوبیسوں گھنٹے ان کے ساتھ رہوں گا۔ میں تعمیر سیرت کو ان کی تعلیم کی سب سے بڑی بنیاد سمجھتا تھا اور اگر بنیاد مضبوط پڑ گئی تو مجھے یقین تھا کہ یہ بچے بقیہ سب باتیں خود بخود یا دوستوں کی مدد سے سیکھ لیں گے

لیکن چونکہ مجھے اس کے علاوہ کتابی تعلیم کی ضرورت کا بھی احساس تھا، اس لیے میں نے کیلن باخ اور شری پراگ جی دیسائی کی مدد سے کچھ جماعتیں شروع کر دیں۔ میں جسمانی تربیت کو بھی کچھ کم اہم نہیں سمجھتا تھا۔ یہ انہیں روزانہ کے معمولی کاموں میں مل جاتی تھی، اس لیے کہ فارم پر نوکر تو تھے نہیں۔ لہٰذا کھانا پکانے سے لے کر کوڑا اٹھانے تک سارا کام فارم کے رہنے والے خود کرتے تھے۔ بہت سے پھلدار درختوں کی دیکھ بھال کرنی بھی تھی اور معمولی باغبانی کا کام بھی کرنا ہوتا تھا۔ مسٹر کیلن باخ کو باغبانی کے کام کا بہت شوق تھا اور انھوں نے اس کام کا سرکاری ماڈل گارڈن میں تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ سب کے لیے خواہ جوان ہوں یا بوڑھے باغبانی میں کچھ کام کرنا لازمی تھا، بشرطیکہ وہ باورچی خانہ کے کام

میں لگے نہ ہوں۔ بچوں کا اس کام میں سب سے بڑا حصہ ہوتا تھا جس میں گڑھے کھودنا، درخت کاٹنا اور بوجھ اٹھانا شامل ہوتا تھا۔ اس سے ان کی کافی ورزش ہو جاتی تھی۔ انھیں ان کاموں سے بڑی خوشی ہوتی، اس لیے انھیں عموماً کسی اور ورزش یا کھیل کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے بعض اور کبھی کبھی سب کے سب بیماری کا بہانہ بناتے اور کام سے جی چرایا کرتے۔ بعض وقت میں ان کی ان حرکتوں پر چشم پوشی کرتا لیکن اکثر میں سختی سے پیش آتا تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس سختی کو پسند نہیں کرتے ہوں گے لیکن مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے کبھی مزاحمت کی ہو۔ جب کبھی میں سختی کرتا تو میں انھیں دلیلوں سے سمجھاتا کہ کام سے کھیلنا اچھا نہیں۔ وہ قایل ہو جاتے لیکن محض تھوڑی دیر کے لیے ذرا دیر میں وہ پھر کام چھوڑ کر بھاگ جاتے اور کھیلنے لگتے۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح کام چلتا رہا اور ان کے جسم ایسے بن گئے کہ دیکھنے کے قابل تھے۔ فارم پر مشکل سے کبھی کوئی بیماری پیدا ہوئی ہو۔ اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں اچھی آب و ہوا اور کھانے کے اوقات کی پابندی کو بھی کچھ کم دخل نہ تھا۔

اسی سلسلے میں پیشہ کی تعلیم کا بھی ذکر کردوں۔ میرا ارادہ تھا کہ ہر لڑکا کوئی نہ کوئی مفید ہاتھ کا کام بھی سیکھے۔ مسٹر کیلن باخ ایک ٹریپسٹ خانقاہ میں جاکر جوتے بنانے کا کام سیکھ آئے۔ میں نے ان سے سیکھا اور یہ کام ان لڑکوں کو سکھانے لگا جو اس کو سیکھنے کے لیے تیار تھے۔ مسٹر کیلن باخ کو کچھ بڑھئی کے کام کا بھی تجربہ تھا۔ اور ایک اور صاحب بھی تھے جو اس کام کو جانتے تھے۔ چنانچہ ہم نے بڑھئی کی ایک چھوٹی سی کلاس بھی کھول دی۔ کھانا پکانا تقریباً سب لڑکوں کو آتا تھا۔

یہ سب باتیں ان کے لیے نئی تھیں۔ انھیں کبھی خواب میں بھی نہیں آیا تھا کہ کسی دن انھیں یہ چیزیں سیکھنی پڑیں گی، اس لیے کہ عام طور سے جو چیزیں ہندستانی

بچے جو باقاعدہ طریقے میں سیکھتے تھے، وہ لکھنا، پڑھنا اور حساب ہوتا تھا۔ ٹالسٹائے فارم پر ہم نے یہ قاعدہ بنا رکھا تھا کہ بچوں سے ایسے کام کرنے کے لیے نہ کہا جائے جو استاد خود نہ کریں۔ اور اسی لیے جب کبھی ان سے کسی کام کے لیے کہا گیا تو ہمیشہ ان کے ساتھ ایک استاد بھی مدد دینے اور ان کے ساتھ کام کرنے کے لیے موجود تھا۔ اسی لیے جو کچھ بھی بچے سیکھتے، خوشی خوشی سیکھتے۔

(تلاش حق، جلد دوم صفحہ ۱۲۰ تا صفحہ ۱۲۴)

لیکن ادبی تعلیم کا مسئلہ اس سے مشکل تھا۔ میرے پاس نہ تو ضروری وسائل تھے اور نہ ادبی سامان، اور نہ اتنا وقت کہ میں حسب ضرورت اس مضمون پر توجہ کر سکوں۔ جو جسمانی کام میں کر رہا تھا، اس سے میں دن کے ختم پر تھک کر چور چور ہو جاتا تھا اور ادبی کلاسیں اس وقت ہوتیں جبکہ مجھے آرام کی سخت ضرورت ہوتی۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ میں کلاس لینے کے لیے تازہ دم ہوتا، میں بڑی مشکلوں سے نیند کے باعث آنکھیں کھلی رکھ سکتا تھا۔ صبح کا وقت زراعت کے اور گھر کے کاموں پر صرف ہوتا، اس لیے سکول کا وقت دوپہر کے کھانے کے بعد رکھنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اسکول کے لیے اور کوئی مناسب وقت نہ تھا۔ ہم زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے ادبی کاموں کے لیے دیتے۔ ہندی، تامل، گجراتی اور اردو یہ سب زبانیں سکھائی جاتیں اور تعلیم بچوں کی اپنی زبان کے ذریعہ ہوتی تھی۔ انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ گجراتی اور ہندو بچوں کے لیے تھوڑی سی سنسکرت بھی ضروری تھی اور سب بچوں کے لیے ابتدائی تاریخ، جغرافیہ اور حساب لازم تھا۔

میں نے تامل اور اُردو پڑھانا اپنے ذمہ رکھا تھا۔ تھوڑی بہت تامل جو میں جانتا تھا، وہ میں نے اپنے سمندری سفر اور جیل کے زمانہ میں سیکھی تھی اور میں نے پوپ کی چھوٹی لیکن بہترین کتاب سے زیادہ نہیں پڑھی تھی میرے اُردو رسم خط کا سارا علم صرف ایک سمندری سفر کا رہین منت تھا اور زبان کا علم فارسی اور عربی کے ان چند الفاظ تک محدود تھا جو میں نے اپنے مسلمان دوستوں کی صحبت میں سیکھے تھے۔ سنسکرت میں اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا جو میں نے ہائی اسکول تک پڑھی تھی اور گجراتی کا علم بھی اس سے زیادہ نہ تھا جتنا ایک ہائی اسکول کی تعلیم میں ہوتا ہے۔

یہ کل سرمایہ تھا جس سے مجھے اپنا کاروبار چلانا تھا۔ ادبی لیاقت میں میرے رفقا مجھ سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھے۔

لیکن مجھے اپنے ملک کی زبانوں سے جو محبت تھی، اور بہ حیثیت استاد مجھے اپنے اوپر جو اعتماد تھا، نیز اسی کے ساتھ میرے شاگردوں کی ناواقفیت اور ان سب سے زیادہ ان کی فراخ دلی نے اس مشکل وقت میں بڑا کام دیا۔

تامل کے بچے سب جنوبی افریقہ میں پیدا ہوئے تھے اور اس لیے انہیں بہت کم تامل آتی تھی اور لکھنا تو وہ بالکل نہیں جانتے تھے اس لیے مجھے انھیں رسم خط اور تھوڑی بہت قواعد سکھانی پڑی۔ یہ کام بہت آسان تھا میرے بچے یہ جانتے تھے کہ وہ کسی دن بھی مجھے تامل بولنے میں مات دیدیں گے۔ اور جب ایسے تامل بولنے والے میرے پاس آتے جو انگریزی نہیں جانتے تو وہ ترجمان کا کام دیتے تھے۔ لیکن میرا کام بڑے مزے سے چلتا تھا اس لیے کہ میں نے اپنے شاگردوں سے اپنی ناواقفیت چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہر طرح سے میں نے ان پر اپنے کو اسی طرح ظاہر کرنے کی کوشش کی، جیسا میں تھا۔ اس لیے

باوجود زبان سے قطعی ناواقفیت کے ان کے دلوں میں میری محبت اور عزت میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی۔ مسلمان بچوں کو اردو پڑھانا نسبتاً زیادہ آسان تھا۔ رسم خط وہ جانتے تھے۔ میرا کام بس اتنا تھا کہ ان میں پڑھنے کا شوق پیدا کردوں اور ان کا خط درست کردیا کروں۔

یہ بچے بیشتر ان پڑھ تھے اور انہوں نے کبھی اسکول کا منہ نہیں دیکھا تھا لیکن ہم نے اپنے کام کے سلسلہ میں یہ پایا کہ انھیں پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں، صرف ان کی کاہلی کی عادت کو چھڑانا اور ان کی پڑھائی کی نگرانی کرنا کافی ہے۔ اور چونکہ میں اس پر قانع تھا، اس لیے مختلف عمروں کے بچے ایک ہی کلاس میں بیٹھ کر اور ایک ہی ساتھ مختلف مضامین پڑھ کر کام چلا لیتے تھے

رہا درسی کتابوں کا معاملہ جن کے بارے میں اتنا کچھ کہا جاتا ہے، مجھے ان کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے کبھی ان کتابوں کا کوئی استعمال بھی کیا ہو۔ میں ان کی مطلق ضرورت نہیں سمجھتا کہ لڑکوں پر بہت سی کتابیں لاد دی جائیں۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ طالب علم کیلئے بہترین کتاب اس کا استاد ہے۔ مجھے استاد نے جو کچھ کتابوں سے پڑھایا، وہ بہت کم یاد ہے مگر وہ باتیں مجھے اچھی طرح یاد آتی ہیں جو انھوں نے مجھے کتابوں کے علاوہ پڑھایا۔

بچے اپنی آنکھوں کی بہ نسبت کانوں کے ذریعہ بہت زیادہ اور آسانی سے سیکھتے ہیں، مجھے یاد نہیں کہ میں نے کوئی کتاب اپنے لڑکوں کو شروع سے آخر تک پڑھ کر سنائی ہو۔ لیکن میں اپنی زبان میں انھیں سب وہ باتیں بتا دیتا تھا جو میں مختلف کتابیں پڑھ کر حاصل کرتا تھا اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس کا اثر اپنے دماغوں میں آج تک لیے ہوئے ہیں۔ یہ ان کے لیے بہت مشکل کام

تھا کہ وہ جو کچھ کتابوں سے پڑھیں، انھیں یاد بھی رکھیں لیکن میں جو کچھ انہیں زبانی بتاتا، وہ بہ آسانی یاد کر کے سنا دیتے۔ پڑھنا ان کے لیے سب سے مشکل کام تھا لیکن سننا اتنا ہی خوشگوار بشرطیکہ انداز بیان دلچسپ ہو۔ اور میری گفتگو کی بنیاد پر جو سوالات وہ کرتے، اس سے مجھے اندازہ ہو جاتا کہ ان میں کہاں تک سمجھنے کی قوت ہے۔

ان لڑکوں کی روحانی تعلیم کا معاملہ ان کی جسمانی اور ذہنی تربیت سے ذرا زیادہ مشکل تھا۔ میں نے ان کی روحانی تربیت کے لیے مذہبی کتابوں سے بہت کم مدد لی۔ اگرچہ میں اس کا قائل ضرور تھا کہ ہر طالب علم کو اپنے مذہب کی ابتدائی باتوں سے ضرور واقف ہونا چاہیئے۔ اور اپنی مذہبی کتابوں کا ایک عام علم ہونا چاہیئے اور اس لیے میں نے اس تعلیم کا جس قدر بہتر انتظام ہو سکتا تھا، کر لیا تھا۔ لیکن میرے نزدیک یہ تعلیم ذہنی تربیت کا ایک جزو تھی۔ ٹالسٹائے فارم کے بچوں کی تعلیم کا بار اپنے سر لینے سے بہت پہلے مجھے اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ تربیت بذاتِ خود ایک علیحدہ چیز ہے۔ روح کی تربیت کے معنی ہیں۔ انسان کی سیرت کی تعمیر اور اسے اس قابل بنا دینا کہ وہ خدا کی اور اپنے نفس کی معرفت حاصل کر سکے اور میرے خیال میں بچوں کی تربیت کا ایک اہم حصہ ہے اور تعلیم بغیر اس روحانی تربیت کے بیکار ہے بلکہ شاید مضر بھی۔

میں اس خیال سے واقف ہوں کہ معرفتِ نفس صرف زندگی کی چوتھی منزل یعنی "سنیاس آشرم" ہی میں حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ جو لوگ اس بیش بہا تجربہ کی تیاری زندگی کی آخری منزل کے لیے اٹھا رکھتے ہیں، انھیں معرفت نفس نصیب نہیں ہوتی بلکہ ان کا بڑھاپا بچپن کی ایک دوسری اور قابل رحم تصویر بن جاتا ہے اور وہ زمین پر ایک بار

جو بولتے ہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری یہی رائے اس وقت بھی تھی جبکہ میں پڑھاتا تھا یعنی ۱۲-۱۹۱۱ء میں اگرچہ شاید میں اس وقت ان لفظوں میں ظاہر نہ کر سکتا۔

اب سوال یہ تھا کہ یہ روحانی تربیت کیسے کی جائے۔ میں بچوں کو بھجن اور مناجاتیں یاد کراتا اور انہیں اخلاقی تعلیم دینے والی کتابیں پڑھ کر سناتا لیکن اس سے مجھے کبھی تسکین نہیں ہوتی تھی۔ جوں جوں میں ان سے قریب آتا گیا میں نے محسوس کیا کہ روحانی تربیت کتابوں سے نہیں ہو سکتی ہے جس طرح جسمانی تربیت جسم کی ورزش اور ذہنی تربیت ذہن کی ورزش سے ہی ہو سکتی ہے اسی طرح روحانی تربیت کے لیے بھی روح کی ورزش ضروری ہے اور روح کی ورزش کا تمام تر مدار استاد کی زندگی اور سیرت پر ہے۔ استاد کو ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس سے کوئی نامناسب فعل سرزد نہ ہو خواہ وہ اپنے لڑکوں کے درمیان ہو یا نہ ہو۔

ایک استاد کے لیے یہ ممکن ہے کہ خواہ وہ کوسوں دور ہو لیکن وہ اپنے طرز زندگی سے اپنے شاگردوں کی روحانی نشو و نما پر اثر ڈال سکتا ہے۔ اگر میں خود جھوٹ بولنے کا عادی ہوں تو میں اپنے شاگردوں کو سچ بولنے کی تلقین کیسے کر سکتا ہوں؛ ایک بزدل استاد کبھی اپنے شاگردوں کو بہادر نہیں بنا سکتا ہے اور ایک استاد جو ضبط نفس سے بیگانہ ہو وہ اپنے شاگردوں کو ضبط نفس کی تعلیم نہیں دے سکتا ہے۔ اس لیے میں نے دیکھا کہ مجھے اپنے لڑکے اور لڑکیوں کے سامنے جن کے ساتھ میں رہتا ہوں ہمیشہ ایک نمونہ بن کر رہنا ہے۔ اس طرح وہ میرے استاد بن جاتے ہیں اور میں نے دیکھا کہ مجھے کم از کم ان کی خاطر اچھا اور نیک بننا چاہیے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ ٹالسٹائے فارم پر جتنا میں

نے اپنے اوپر نظم اور ضبط نفس سے کام لیا' وہ زیادہ تر ان لڑکوں کے سبب سے تھا۔
ان لڑکوں میں سے ایک نہایت وحشی 'سرکش' جھوٹا اور جھگڑالو لڑکا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے بڑا فساد برپا کیا۔ میں بہت تنگ آگیا۔ میں اپنے لڑکوں کو کبھی سزا نہیں دیتا تھا لیکن اس مرتبہ مجھے بہت غصہ آگیا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی باتوں پر اڑا رہا اور مجھے چرکا دینے کی کوشش کرنے لگا۔ آخرکار میں نے ایک رول اٹھایا جو قریب پڑا تھا اور اس کے بازو پر دے مارا۔ جس وقت کہ میں نے اسے مارا' میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ ان سب کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ لڑکا رونے لگا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ وہ اس وجہ سے نہیں رویا کہ اس مار سے کوئی تکلیف پہنچی۔ وہ اگر چاہتا تو مجھ پر ہاتھ اٹھا دیتا' اس لیے کہ وہ کوئی سترہ برس کا مضبوط جسم کا لڑکا تھا۔ لیکن اس نے دیکھ لیا تھا کہ مجھے خود اس سزا سے کس قدر اذیت پہنچی ہے۔ اس واقعہ کے بعد اس نے کبھی نافرمانی نہیں کی۔ لیکن مجھے آج بھی اپنے اس تشدد آمیز فعل پر ندامت ہے میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس دن روحانیت کا نہیں بلکہ اپنی بہیمیت کا اظہار کیا۔

میں جسمانی سزا کا ہمیشہ سے مخالف تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اپنے لڑکوں میں سے میں نے ایک کو صرف ایک بار مارا ہے۔ اس لیے میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ میرا رول سے کام لینا صحیح تھا یا غلط۔ غالباً میرا یہ فعل نامناسب تھا' اس لیے کہ اس کا محرک غصہ تھا اور سزا دینے کی خواہش۔ اگر یہ صرف میری بے بسی کا اظہار ہوتا تو میں اسے جائز سمجھتا' لیکن اس صورت میں یہ ملا جلا جذبہ تھا۔

اس واقعہ کے بعد سے میں یہ سوچنے لگا اور اس نے مجھے لڑکوں کی تادیب کا بہتر طریقہ سکھایا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ طریقہ اس موقع پر کہاں تک کامیاب ہوتا۔ وہ لڑکا بھی اس بات کو جلد ہی بھول گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے اس کی زندگی میں بھی کوئی خاص اصلاح نہیں ہوئی۔ لیکن اس واقعہ کے بعد سے میں یہ سمجھنے لگا کہ استاد کے فرائض اپنے شاگردوں کے ساتھ کیا ہیں۔

لڑکوں کی شرارتوں کے واقعات اس کے بعد بھی اکثر پیش آتے رہے مگر میں نے کبھی جسمانی سزا سے کام نہیں لیا۔ اس طرح اپنے ماتحت لڑکے اور لڑکیوں کو روحانی تربیت دینے کی کوشش میں میں روز بروز سمجھتا گیا کہ روح میں کتنی بڑی قوت ہے!

پھر روز بروز یہ بات روشن ہوتی گئی کہ صحیح طریقہ پر لڑکے اور لڑکیوں کی تربیت اور تعلیم دینا کس قدر مشکل کام ہے! اگر میں صحیح طور پر ان کا معلم اور سرپرست بننا چاہتا ہوں تو میرے لیے ضروری ہے کہ ان کے دل میں جگہ کر دوں ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوؤں ان کے مسائل کے حل کرنے میں ان کی مدد کروں اور ان کی جوانی کے ابھرتے ہوئے جوش اور آرزوؤں کو راہ پر لگا دوں۔

میرا خیال ہے کہ طالب علموں کے بعض جرائم پر استاد کے لیے بطور خود بھی علاج کے برت رکھنے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن اس کے لیے نقطۂ نظر کا صاف ہونا اور روحانی صلاحیت بہت ضروری ہے۔ اگر استاد اور شاگرد میں صحیح محبت کا جذبہ نہیں ہے، اگر طالب علم کے جرم نے استاد کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہے اور اگر شاگرد کے دل میں استاد کی عزت نہیں ہے تو برت رکھنا صرف بے کار ہے بلکہ مضر بھی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ایسے واقعات میں برت کی ضرورت میں شبہ کی گنجائش ہے لیکن اسے شاگرد کی غلطی پر استاد کی ذمہ داری ہے

کوئی سوال نہیں ہو سکتا ہے۔

(خود نوشت سوانح حیات
سنہ ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۵ ۔ ۲۰۷، ۲۱۸، ۲۱۹) ؛

تعلیم اور احتساب نفس

جس زمانہ میں میری شادی ہوئی، میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہم تینوں بھائی ایک ہی اسکول میں تھے۔ بڑے بھائی بہت اونچے درجے میں تھے اور جن بھائی کی شادی میری شادی کے ساتھ ساتھ ہوئی، وہ مجھ سے صرف ایک جماعت آگے تھے۔ شادی کی وجہ سے ہم دونوں کا ایک سال ضائع ہوا۔ بلکہ میرے بھائی کے حق میں اس کا نتیجہ اور بھی برا ہوا، اس لیے کہ انھوں نے پڑھنا بالکل ہی چھوڑ دیا۔ خدا جانے کتنے لڑکوں پر یہ مصیبت آئی ہے جو ان پر آئی۔ یہ صرف آج کل کے ہندو سماج ہی کا دستور ہے کہ طالب علمی اور شادی کی زندگی دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

میری تعلیم البتہ جاری رہی۔ ہائی اسکول میں میں غبی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میرے

استادوں کو ہمیشہ مجھ سے محبت رہی۔ تعلیمی ترقی اور چال چلن کے سرٹیفکیٹ ہر سال لڑکوں کے والدین کے پاس بھیجے جایا کرتے تھے۔ مجھے کبھی خراب سرٹیفکیٹ نہیں ملا، بلکہ دوسرا درجہ پاس کرنے کے بعد میں نے انعام بھی حاصل کیے۔ پانچویں جماعت میں مجھے چار روپے کا اور چھٹی جماعت میں دس روپے کا وظیفہ ملا۔ اس میں میری قابلیت سے زیادہ میری خوش نصیبی کو دخل تھا، اس لیے کہ یہ وظیفے عام طلبا کے لیے نہ تھے بلکہ کاٹھیاواڑ کے علاقہ سورٹھ کے لڑکوں میں جو سب سے اچھے طالب علم تھے ان کے لیے مخصوص تھے۔ اور ان دنوں پچاس ساٹھ طالب علموں کی جماعت میں سورٹھ کے لڑکے کچھ زیادہ نہ رہے ہوں گے۔

مجھے تو یہ یاد پڑتا ہے کہ میرا خیال اپنی قابلیت کے متعلق کچھ اچھا نہ تھا۔ مجھے انعام اور وظیفے پا کر بہت تعجب ہوا کرتا تھا۔ لیکن اپنے چال چلن کی دیکھ بھال میں بہت سختی سے کرتا تھا۔ اس پر اگر ہلکا سا دھبہ بھی آ گیا تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ جب کبھی میری کوئی حرکت واقعی یا استاد کے خیال میں قابل سرزنش ہوتی تو مجھے ایسا دکھ ہوتا کہ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار مجھے جسمانی سزا دی گئی۔ سزا کی مجھے اتنی پروا نہ تھی جتنی اس بات کی کہ میں سزا کا مستحق ٹھہرا۔ میں اس رنج میں بہت رویا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے، جب میں پہلی یا دوسری جماعت میں تھا۔ ساتویں جماعت میں مجھے اس قسم کا ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ان دنوں دوراب جی ایدل جی گیمی ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ آداب اور قاعدے میں بہت سخت اور اپنے اصول کے بڑے پابند تھے اور پڑھاتے بھی خوب تھے۔ اس لیے لڑکے ان سے خوش رہتے تھے۔ انھوں نے اونچی جماعتوں کے لڑکوں کے لیے ورزش اور جمناسٹک کو لازمی کر دیا تھا۔ مجھے دونوں چیزیں ناپسند تھیں۔ میں کبھی ورزش یا کرکٹ، فٹ بال میں ان کے لازمی ہونے سے پہلے کبھی شریک

نہیں ہوا تھا۔ اس علیحدگی کی جس کے بے جا ہونے کا مجھے اب احساس ہے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں بڑا جھینپو تھا۔ ان دنوں میں اس خیال خام میں مبتلا تھا کہ جمناسٹک کو تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔ اب مجھ پر یہ روشن ہو گیا ہے کہ نصاب تعلیم میں جسمانی تربیت کو بھی اتنا ہی حصہ ہونا چاہیے، جتنا ذہنی تربیت کا۔

لیکن ورزش میں شریک نہ ہونے سے میری صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے کتابوں میں کھلی ہوا میں ٹہلنے کے فوائد پڑھے تھے اور یہ ہدایت مجھے پسند آ گئی تھی، اس لیے میں نے ٹہلنے کی عادت ڈال لی تھی؛ جو اب تک چلی جاتی ہے۔ پابندی سے ٹہلنے کی وجہ سے میرا جسم خاصا مضبوط ہو گیا۔

میں جمناسٹک کو اس لیے ناپسند کرتا تھا کہ مجھے اپنے والد کی تیمارداری کی دل سے خواہش تھی۔ اسکول بند ہوتے ہی میں سیدھا گھر پہنچتا تھا اور ان کی خدمت میں لگ جاتا تھا۔ لازمی ورزش اس خدمت میں حائل ہونے لگی۔ میں نے جیمی صاحب سے درخواست کی کہ مجھے جمناسٹک سے مستثنیٰ کر دیں تاکہ میں اپنے والد کی تیمارداری کر سکوں۔ لیکن انھوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ سنیچر کو صبح کا مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ ایک سنیچر کو ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے سہ پہر کو ۴ بجے جمناسٹک کے لیے گھر سے اسکول جانا تھا۔ میرے پاس گھڑی نہ تھی اور ابر کی وجہ سے وقت کا اندازہ غلط ہوا۔ جب میں اسکول پہنچا تو دیکھا سب لڑکے جا چکے ہیں۔ دوسرے دن جیمی صاحب نے حاضری کا رجسٹر دیکھا تو مجھے غیر حاضر پایا۔ جب انہوں نے مجھ سے غیر حاضری کا سبب پوچھا تو میں نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ انھیں میری بات کا یقین نہیں آیا اور انہوں نے مجھ پر ایک آنہ یا دو آنے (مجھے ٹھیک یاد نہیں) جرمانہ کر دیا۔

مجھ پر جھوٹ کا الزام: اس بات سے مجھے سخت دکھ پہنچا۔ میں اپنی

بے گناہی کیسے ثابت کرتا؟ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی مجھے معلوم ہو گیا کہ سچے آدمی کو چوکس بھی رہنا چاہیئے۔ اسکول میں میری غفلت کی یہ پہلی مثال تھی اور یہی آخری بھی۔ مجھے کچھ ہلکا سا خیال ہے کہ آخر میاں میں نے جرمانہ معاف کرالیا۔

میں ورزش سے مستثنیٰ کر دیا گیا' اس لیے کہ خود میرے والد نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو لکھ دیا کہ ان کی مدرسہ کے بعد گھر پر مجھے ضرورت ہوتی ہے۔ ورزش میں غفلت کرنے سے تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن ایک اور غفلت کی سزائیں اب تک بھگت رہا ہوں۔ خدا جانے میرے دماغ میں یہ خیال کہاں سے آگیا کہ خط اچھا ہونا تعلیم کا کوئی ضروری جزو نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ انگلستان جانے تک میں اس خیال پر قائم رہا۔ آگے چل کر خصوصاً جنوبی افریقہ میں جب وہاں کے وکلاء اور خاص وہاں کے رہنے والے نوجوانوں کا خوبصورت خط دیکھا تو مجھے بڑی شرم آئی اور اپنی غفلت پر بہت پچھتایا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے خط کو ناقص تعلیم کی علامت سمجھنا چاہیئے۔ میں نے اپنا خط درست کرنے کی کوشش کی لیکن وقت گزر چکا تھا۔ لڑکپن کی غفلت کی کبھی تلافی نہ ہو سکی۔ ہر نوجوان مرد اور عورت کو میری مثال سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے اور یہ جان لینا چاہیئے کہ اچھا خط تعلیم کا لازمی جزو ہے۔ اب میری رائے یہ ہے کہ بچوں کو لکھنا سکھانے سے پہلے ڈرائنگ سکھانا چاہیئے۔ وہ حرفوں کو مشاہدے سے اسی طرح پہچانیں' جیسے مختلف چیزوں مثلاً پھولوں، پرندوں وغیرہ کو پہچانتے ہیں اور لکھنا اس وقت سیکھیں جب انہیں چیزوں کی تصویر بنانا آجائے۔ پھر ان کا خط خوبصورت ہو گا۔

مجھے اسکول کے زمانہ کی جو باتیں یاد ہیں' ان میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں: میں نے اپنی شادی کے سبب سے ایک سال ضائع کر دیا

سکتا۔ اور میرے اُستاد کی خواہش تھی کہ میں اس کی تلافی میں ایک سال میں دو درجے چڑھا دیا جاؤں۔ یہ رعایت عموماً محنتی لڑکوں کے ساتھ کی جاتی ہے، اس لیے میں تیسرے درجہ میں صرف چھ مہینے رہا اور ششماہی امتحان پاس کر کے جس کے بعد گرمیوں کی چھٹی ہوتی ہے، چوتھے درجہ میں چڑھا دیا گیا۔ اس درجہ میں اکثر مضمون انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں۔ میں پریشان ہو گیا۔ جیومیٹری بالکل نیا مضمون تھا جس میں میں کمزور تھا اور چونکہ پڑھائی انگریزی میں ہوتی تھی، اس لیے اور بھی دقت تھی۔ استاد اپنا مضمون اچھا پڑھاتا تھا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ اکثر میرا جی چھوٹ جاتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ پھر تیسرے درجہ میں چلا جاؤں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو سال کی پڑھائی ایک سال میں سمیٹنا میرے بس کی بات نہیں۔ مگر اس میں نہ صرف میری ذلت تھی بلکہ میرے استاد کی بھی سبکی تھی، اس لیے کہ انھوں نے میری محنت پر بھروسہ کر کے میری ترقی کی سفارش کی تھی۔ اس دوہری ذلت کے خوف سے میں میدان میں جما رہا۔ آخر جب بڑی کوششوں سے میں جومیٹری کی تیرہویں شکل تک پہنچا تو مجھ پر یک بہ یک یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ مضمون بالکل سہل اور سادہ ہے۔ جس مضمون میں انسان کو محض اپنی سمجھ سے کام لینا ہو، وہ ہرگز مشکل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد سے جومیٹری مجھے سہل بھی معلوم ہونے لگی اور دلچسپ بھی۔

البتہ سنسکرت ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ جومیٹری میں کوئی چیز زبانی یاد کرنے کی نہ تھی، سنسکرت میں میں سمجھتا تھا کہ سب کچھ زبانی یاد کرنا پڑتا ہے۔ یہ مضمون بھی چوتھے درجہ سے شروع ہوتا تھا۔ چھٹے درجہ میں پہنچ کر میری ہمت نے جواب دے دیا۔ جو استاد اس مضمون کو پڑھاتے تھے، وہ کام لینے میں

بہت سخت تھے اور مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکوں پہ بڑا جبر کرتے ہیں۔ سنسکرت اور فارسی کے استادوں میں باہم ایک طرح کی رقابت رہتی تھی۔ فارسی کے استاد لڑکوں کے ساتھ نرمی کرتے تھے۔ لڑکے آپس میں باتیں کیا کرتے تھے کہ فارسی بہت آسان ہے۔ اور فارسی کے استاد بڑے اچھے آدمی ہیں اور طالب علموں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس آسانی نے مجھے لبھا لیا اور ایک دن میں فارسی کی جماعت میں جا بیٹھا۔ سنسکرت کے استاد کو اس لیے بڑا رنج ہوا۔ انھوں نے مجھے بلا کر کہا "تم یہ بھول گئے کہ تم ویشنو باپ کے لڑکے ہو۔ اپنے مذہب کی زبان نہیں پڑھو گے؟ اگر تمہیں کوئی بات مشکل معلوم ہوتی ہے تو میرے پاس آکر کیوں نہیں پوچھتے؟ میں تم سب طالب علموں کو سنسکرت پڑھانے میں اپنے مقدور بھر پوری کوشش کرتا ہوں۔ جب تم آگے بڑھو گے تو اس میں بڑی دلچسپ چیزیں نظر آئیں گی۔ دیکھو ہمت نہ ہارو۔ آؤ پھر سے سنسکرت کی جماعت میں شریک ہو جاؤ۔"

اس گفتگو نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ مجھے استاد کی اس محبت کا لحاظ نہ ہوتا۔ اب میں کرشن شنکر پانڈیا کو ہمیشہ شکر گزاری کے ساتھ یاد کرتا ہوں۔ اس لیے کہ جو تھوڑی بہت سنسکرت میں نے اس زمانہ میں سیکھ لی، اگر وہ نہ سیکھتا تو ہندو مذہب کی مقدس کتابوں میں میرا دل مشکل سے لگتا۔ بلکہ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس سے زیادہ استعداد کیوں نہیں حاصل کی، اس لیے کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہر ہندو لڑکے اور لڑکی کو سنسکرت اچھی طرح جاننا چاہیے۔

اب میری رائے یہ ہے کہ ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں مقامی زبانوں کے علاوہ ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی، انگریزی کی بھی جگہ ہونی چاہیے

کوئی صاحب زبانوں کی اس لمبی فہرست کو دیکھ کر نہ ڈریں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہماری تعلیم کے نظام پر زیادہ توجہ کی جائے اور لڑکوں پر سارے مضامین غیر زبان کے ذریعہ پڑھنے کا بوجھ نہ ڈالا جائے تو ان زبانوں کے حاصل کرنے میں دقت نہ ہوگی بلکہ ہنستے کھیلتے سیکھ لی جائیں گی۔ اگر کوئی شخص ایک زبان علمی اصول کے مطابق سیکھ لے تو دوسری زبانیں آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔

اصل میں ہندی، گجراتی اور سنسکرت کو ہم ایک زبان سمجھ سکتے ہیں اور اسی طرح عربی و فارسی کو بھی۔ اگرچہ فارسی آریائی اور عربی سامی خاندان السنہ سے ہے لیکن عربی و فارسی دونوں کی پوری نشوونما اسلام کی ترقی کے طفیل میں ہوئی اس لیے ان دونوں میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اردو کو میں کوئی علیحدہ زبان نہیں سمجھتا ہوں کیونکہ اس نے صرف و نحو ہندی کی اختیار کی ہے اور الفاظ زیادہ تر عربی، فارسی سے لیے ہیں، اس لیے جو شخص اچھی اردو سیکھنا چاہے، اسے لازم ہے کہ عربی فارسی پڑھے اور جو شخص اچھی ہندی، گجراتی، بنگالی یا مرہٹی سیکھنا چاہے، اسے لازم ہے کہ سنسکرت پڑھے۔

("تلاش حق" جلد اول صفحہ ۲۸ تا ۳۰)

قومی تعلیم کے اجزائے ترکیبی

گاندھی جی نے قومی تعلیم کا جو خاکہ پیش کیا ہے، اس کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں:

۱۔ تعلیم مادری زبان کے ذریعہ ہونی چاہیے۔

۲۔ بچہ جو تعلیم مدرسہ میں پاتا ہے، اس میں اور اس کے گھر کے ماحول میں مطابقت ہونی چاہیے۔

۳۔ اس کی تشکیل اس طرح ہو جو اکثریت کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

۴۔ ابتدائی جماعتوں کے استاد پہلی جماعت سے لے کر آخر تک اچھے کیریکٹر کے لائق اشخاص ہونے چاہئیں۔

۵۔ تعلیم مفت ہونی چاہیے۔

۶۔ اس کا پورا انتظام لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔

سچی قومی تعلیم

ہمارے استاد اعلیٰ اخلاقی کردار کے آدمی ہونے چاہئیں۔ ہمیں ایسے حالات پیدا کرنے چاہئیں کہ غریب سے غریب ہندوستانی بھی اچھی تعلیم حاصل کر سکے۔ علم اور مذہب کا ایک خوشگوار امتزاج ہونا چاہیے۔ ہمارے ملک میں

تعلیم کو زندگی سے گہرا تعلق ہونا چاہیئے۔ اور ہمارے نوجوانوں کے دماغوں پر بدیسی زبان کے ذریعہ تعلیم استعمال کیے جانے پر جو بوجھ ہے، وہ دور ہونا چاہیئے۔ جب تک ہم اپنی تعلیم کی از سر نو تشکیل نہ کریں گے جس سے ہمارا مقصد پورا ہو سکے، اُس وقت تک لوگوں کی زندگی کی سطح بلند نہیں ہو سکتی۔

یہی قومی تعلیم ہر صوبہ کی اپنی اپنی زبان میں دی جانی چاہیئے۔

استادوں کو بڑی اعلیٰ قابلیت کا ہونا چاہیئے۔ اسکول ایک ایسی جگہ ہونا چاہیئے جہاں طالب علموں کو صاف پینے کا پانی، تازہ ہوا اور ایک پرسکون فضا ملے۔ آس پاس کی جگہ بالکل صحت مند ہونی چاہیئے۔ نظام تعلیم میں طلبا کے لیے خاص خاص پیشوں اور ہندوستان کے مذاہب کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے۔

ایک دوست نے اس قسم کے اسکول کے قائم کرنے کا سارا خرچ برداشت کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ احمد آباد کے بچے اس اسکول میں مفت تعلیم پائیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس قسم کے اور بھی اسکول احمد آباد میں کھلے جائیں۔ بہرحال، احمد آباد میں اس مقصد کے لیے زمین کا ملنا یا اسکول کے لیے عمارت بنانا مشکل نہ ہوگا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اچھے تعلیم یافتہ استادوں کا ملنا جو اس کے ساتھ اعلیٰ اخلاقی کردار بھی رکھتے ہوں، آسان نہ ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ گجراتیوں میں جو تعلیم یافتہ ہیں، وہ اس اہم کام کی طرف توجہ کریں۔ گجرات کا تعلیم یافتہ طبقہ اس قربانی کا ایک چوتھائی بھی نہیں دے رہا ہے جو مہاراشٹر کا تعلیم یافتہ طبقہ دے رہا ہے۔ ہمارے دوست کی اسکیم میں یہ بات نہیں ہے کہ استادوں کو کچھ نہ ملے گا۔ استادوں کو یقیناً اپنی گزر اوقات کے لیے کافی ملے گا۔ لیکن استادوں کو اپنی ضرورتیں محدود رکھنی پڑیں گی۔ یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسا نہیں کر سکتے ہیں، وہ اس قسم کے ادارے میں اپنے کو وقف نہیں کر سکتے ہیں۔

(نوجیون، ۲۱ ستمبر ۱۹۱۹ء)

قومی تعلیم

میں قومی تعلیم کو صرف سوراج کے معنوں میں سوچ سکتا ہوں، اس لیے میں کالج کے طلبا کو بھی چاہوں گا کہ وہ کتائی کے کام اور اس سے متعلق تمام باتوں میں مہارت پیدا کریں۔ میں چاہوں گا کہ وہ کھدر کی معاشیات اور اس سے متعلق دوسرے مسائل کا مطالعہ کریں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک کارخانہ قائم کرنے میں کتنا وقت اور کتنا روپیہ لگتا ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کارخانوں کی لامحدود توسیع کے بھی حدود ہوتے ہیں۔ انھیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ کارخانوں کے ذریعہ دولت کی تقسیم کا کیا طریقہ ہے اور ہاتھ کی کتائی اور بنائی کے ذریعہ تقسیم کا کیا طریقہ ہے؟ انھیں اس کا بھی علم ہونا چاہیے کہ ہاتھ کی کتائی اور ہندوستانی کپڑوں کی صنعت کس طرح تباہ کی گئی؟ انھیں یہ بھی سمجھنا چاہیے اور دوسروں کو بتا سکنا چاہیے کہ ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں کسانوں کے گھروں میں اگر ہاتھ کی کتائی ہونے لگے تو اس کا کیا اثر ہوگا؟ انھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس گھریلو صنعت کا پورے طور پر دوبارہ زندہ ہونا سیکڑوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں کو ایک فرد کی زندگی سے وابستہ کر دیگا۔

(ینگ انڈیا، ۱۱ دسمبر ۱۹۲۷ء)

قومی تعلیم بمقابلہ سرکاری تعلیم

ہمارے طلباء میں سے ایک بزدلی جیل گیا ہے اور بہت سے ابھی
جائیں گے۔ یہ ودیاپیٹھ کے مایۂ ناز فرزند ہیں۔ لیکن کیا سرکاری اداروں کے
طلباء اگر ایسا کرنا بھی چاہیں تو کر سکتے ہیں؟ انھیں تمہاری طرح اس کی آزادی
نہیں کہ وہ بزدلی جائیں اور ولبھ بھائی کی مدد کریں۔ وہ صرف چھپا کر
ہمدردی کر سکتے ہیں۔ ادبی تعلیم کس کام کی اگر وہ قومی زندگی کے اس نازک
وقت میں ہمیں پیچھے کر اور دبا کر رکھے۔ علم اور ادبی تعلیم نامردی کے مرادف نہیں
ہو سکتے۔

اس کے علاوہ ہمارے اور ان کے طریقہ تعلیم میں زمین آسمان کا فرق
ہے۔ مثال کے طور پر ہم انگریزی اس طرح نہیں پڑھا سکتے جس طرح وہ پڑھاتے
ہیں۔ ہم اس زبان کی اتنی تعلیم دے سکتے ہیں، جتنی ہمارے روزمرہ کے کاموں
میں ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن ہم قومی خودکشی کیے بغیر مادری زبان کو نظرانداز
نہیں کر سکتے اور انگریزی کو اپنے تمام خیالات کے اظہار کا ذریعہ نہیں بنا
سکتے۔ اس قومی ادارے میں ہم اس مہلک طریقہ کار کی اصلاح کرنا چاہتے
ہیں۔ ہمیں اپنے تمام مضامین گجراتی زبان کے ذریعہ پڑھنے ہیں۔ ہمیں اس
زبان کو مالا مال کرنا ہے اور ہر قسم کے خیالات اور جذبات کے اظہار کے قابل
بنانا ہے۔

پھر معاشیات کی تعلیم کو لیجیے۔ سرکاری اداروں میں جو طریقہ مروج ہے

وہ بہت مضر ہے۔ ہر ملک کی اپنی معاشیات ہوتی ہے۔ جرمنی کی درسی کتابیں انگلستان کی درسی کتابوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ آزاد تجارت میں ممکن ہے انگلستان کی نجات ہو لیکن اس میں ہماری تباہی ہے۔ ہمیں خود ہندستانی معاشیات کا ایک نظام مرتب کرنا ہے۔

یہی حال تاریخ کا ہے۔ ایک فرانسیسی اگر ہندوستان کی تاریخ لکھے گا تو وہ اپنے نقطۂ نظر سے لکھے گا۔ انگریز بالکل دوسرے طریقے سے لکھے گا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جو لڑائیاں ہوئی ہیں، ان کا حال مختلف مصنفوں کے لحاظ سے مختلف ہوگا۔ ہندستان کی تاریخ جو ایک ہندستانی محب وطن اصل ماخذ سے لکھے گا، وہ ایک انگریز حکمراں کی تاریخ سے مختلف ہوگی، اگرچہ دونوں ہی ایماندار ہوں۔ ہم نے اپنی قومی زندگی میں واقعات کو انگریزی نقطۂ نظر سے تسلیم کرکے سخت غلطی کی ہے۔ یہاں تمہارے اور تمہارے استادوں کے لیے تحقیق کا ایک بڑا میدان ہے۔

حساب جیسے مضمون پڑھانے میں بھی یہی اختلاف ہو سکتا ہے۔ ہمارا حساب کا استاد اپنے سوالات ہندستانی حالات میں تیار کرے گا۔ وہ حساب کے ساتھ ہندوستان کا جغرافیہ بھی سکھا دے گا۔

اس کے علاوہ ہم دست کاری اور صنعتی تعلیم پر بھی خاص زور دے رہے ہیں۔ یہ خیال ہرگز نہ کرنا کہ اس تعلیم سے تمہارا ذہن اور سست پڑ جائے گا۔ واقعات رٹ کر اپنے دماغ کو گودام بنانے سے ہماری سمجھ نہیں بڑھے گی۔ کچھ بوجھ کر صنعتی تعلیم حاصل کرنا بہ نسبت بے سمجھے بوجھے ادب کے مطالعے سے کہیں زیادہ مفید ہے۔

(ینگ انڈیا۔ ۲۱ جون ۱۹۲۸ء)

قومی مدرسے

قومی مدرسے، اگر انھیں سوراج کے معنی میں لیا جائے جس کے حاصل کرنے کے لیے وہ وجود میں آئے ہیں، اس طرح چلائے جانے چاہئیں کہ ان کے ذریعہ قومی پروگرام جن کا تعلق تعلیمی اداروں سے ہو سکتا ہے پورے کیے جا سکیں۔ اس طرح مثال کے طور پر قومی مدرسوں کو چرخے کے پیغام پھیلانے، ہندو، مسلمان اور دوسرے فرقوں کو قریب تر لانے، اچھوتوں کو تعلیم دینے اور مدرسوں سے چھوت چھات کی لعنت دور کرنے کا سب سے موثر ذریعہ ہونا چاہیے۔ اس معیار سے اگر دیکھا جائے تو یہ تجربہ اگر ناکام نہیں کہا جا سکتا تو اس کی کامیابی کچھ بہت نمایاں بھی نہیں ہے۔ تقریباً ۳۰۰۰ لڑکے اور لڑکیوں میں سے بمشکل ایک ہزار ۱۰۰۰ چرخوں پر ½ گھنٹہ روزانہ کے حساب سے کتائی کا کام کرتے ہیں۔ سیکڑوں چرخے بے کار اور کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اصولی طور پر یہ مدرسے اچھوتوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بہت کم مدرسوں میں اچھوت بچے ہوتے ہیں۔ مسلمان طلبا کی حاضری بھی ان مدرسوں میں بہت کم ہے۔ مجھے اس کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اب ہم کو ان مدرسوں میں کمیت نہیں بلکہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ داخلوں کی جانچ رفتہ رفتہ سخت کرنی چاہیے۔ جو والدین نہیں چاہتے کہ ان کے بچے کتائی سیکھیں یا اچھوت بچوں کے ساتھ پڑھیں، وہ اگر چاہیں تو اپنے بچوں کو اٹھا سکتے ہیں۔ مجھے ان

مدرسوں کے استادوں سے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اگر ان مدرسوں کے قائم رہنے کی یہ شرط ہے کہ ان میں نہ اچھوت آئیں اور نہ ترخا، تو ان کے بند کر دیئے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہی کافی نہیں کہ اگر چوری چھپے اچھوت بچے ان مدرسوں میں آجائیں تو انھیں آنے دیا جائے بلکہ اس سے زیادہ یہ ضروری ہے کہ انھیں پیار اور محبت سے ان مدرسوں میں بلایا جائے۔ استادوں کو یہ انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ مسلمان اور پارسی والدین اپنے بچوں کو بھیجیں تو وہ آئیں بلکہ ان والدین سے درخواست کرنی چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو بھیجیں۔ ایک قومی مدرسے کے استاد کو اپنے حلقہ کے اندر سوراج کا مبلغ ہونا چاہیے۔ اسے ہر بچہ کی جو اس کی نگرانی میں ہے، تاریخ سے واقف ہونا چاہیے اور جو بچے اس کے اسکول میں نہیں ہیں، ان سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ اسے ان کے والدین سے بھی واقف ہونا چاہیے اور یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ اس کے اسکول میں اپنے بچے کیوں نہیں بھیج رہے ہیں۔ اسے یہ سب باتیں جبراً نہیں بلکہ شوق سے کرنی چاہئیں۔ اس طرح اور صرف اسی طرح یہ قومی مدرسے صحیح معنوں میں کانگریس کی قرارداد کے مطابق قومی ہوں گے۔

اس کام کی دشواری سے انکار نہیں۔ اس حکومت نے ہر چیز کو پیسے کے تابع کر دیا ہے۔ سیرت کسی چیز کا کوئی معیار نہیں۔ کسی علمی نصاب کو پیسے کی طور پر پورا کرنے کی صلاحیت واحد معیار ہے۔ ہر پیشہ روزی کمانے کا ایک ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ ہم وکیل، ڈاکٹر اور معلم اپنے اہل وطن کی خدمت کے لیے نہیں ہوتے بلکہ روپیہ پیدا کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ودیاپیٹھ کو ایسے روح فرسا حالات میں استاد ڈھونڈنے پڑے۔ اکثر اساتذہ کو اپنے اور اپنے حالات سے نمٹنا پڑا۔ سب سے تعجب کی بات یہ ہے کہ ان سب نے بے چون

چرا ملک کی آواز پر لبیک کہا۔

لیکن اس وقت تقریباً چار سال کے تجربہ کے بعد ہمیں ایک نیا ورق الٹنا ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک جگہ ٹھہرے رہیں اور پھر نہ ڈوبیں۔ اس لیے ہمیں لڑکے اور لڑکیوں پر یہ پابندی عائد کرنا چاہیے کہ وہ کم سے کم آدھ گھنٹہ روزانہ چرخا کاتیں۔ یہ کوئی تیس ہزار لڑکے اور لڑکیوں اور آٹھ ہزار استادوں کے لیے معمولی درجہ کی تعلیم نہیں ہے کہ وہ ہر روز آدھ گھنٹے کے لیے کتائی یعنی ملک کے لیے محنت کا کام کرتے رہیں۔ یہ حب وطن مفید محنت اور قربانی کا روزانہ عملی سبق ہے۔ یہ بات کہ ایک لڑکا اپنی تعلیم کے زمانہ میں بھی بغیر معاوضہ کی توقع کے کچھ دینا شروع کرے، ایثار اور قربانی کا ایک ایسا سبق ہے جسے وہ اپنی بعد کی زندگی میں کبھی نہیں بھولیگا اور قوم کے لیے یہ ہر ماہ ۱۸۷۵ من سوت کا ایک عطیہ ہے۔ اس سے کم سے کم ۵۰۰۰ کے لیے ایک کو ایک دھوتی ملے گی۔ اور باتوں کو چھوڑ کر ہر استاد اس سبق کی قیمت نکالے کہ ہر بچہ پانچ اور بچوں کے ساتھ ایک مہینہ میں اتنا سوت کاتتا ہے جس سے اس کے اس ہم وطن کو جو مدراس کے حالیہ سیلاب میں لُٹ گیا ہے کپڑوں کے بجائے کم سے کم ایک دھوتی مل رہی ہے۔

('ینگ انڈیا'۔ ۷ر اگست ۱۹۲۴ء)

قومی دارالاقاموں میں ذات پات کا سوال

باباصاحب کی ڈاک میں مختلف قسم کے خطوط آتے ہیں جن میں ان سے ہر قسم کے سوالات کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک سوال قومی مدرسوں کے دارالاقاموں میں ذات پات کا امتیاز برتنے کے متعلق بھی تھا۔ انھوں نے اپنے جواب کی ایک نقل مجھے بھیجی ہے۔ اس مسئلہ پر ان کے خیالات ایسے دارالاقاموں کے نگرانوں کے لیے رہنمائی کا کام دے سکتے ہیں، اس لیے میں اس جواب کو بغیر کسی تغیر و تبدل کے یہاں نقل کر رہا ہوں۔

"آپ نے بہت اچھا کیا ہے جو پوچھا ہے کہ آیا ودیاپیٹھ کے دارالاقامہ میں ذات پات کا امتیاز برتا جاتا ہے یا نہیں؟ میرا خیال ہے کہ آپ جانتے ہوں گے کہ ودیاپیٹھ کے مقاصد میں حسب ذیل دفعہ رکھی گئی ہے:-

"ان اداروں میں جو اس کے ماتحت چلائے جائیں گے، تمام مروجہ مذاہب کا مناسب خیال رکھا جائے گا اور طلبا کی روحانی نشو و نما کے لیے ان مذاہب کی تعلیم حق اور اہنسا کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے دی جائیگی۔"

"آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ودیاپیٹھ چھوت چھات کو ہندو مذہب پر ایک کلنک کا ٹیکہ اور ایک گناہ سمجھتی ہے۔ ودیاپیٹھ تمام طلبا کے لیے کھلی ہے جو اس قسم کی تعلیم جو یہاں دی جاتی ہے، حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم مذہب یا ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں برتتے ہیں۔ ہم طلبا کو عمومًا

کی جنگ کے لیے تیار کرتے ہیں اور انھیں کتائی اور کھادی بننا بھی سکھاتے ہیں، اس لیے کہ ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ اس سے ہماری قومی ترقی میں مدد ملے گی زدیا پیتھ کا یہ مقصد نہیں کہ وہ اچر دھرم (جسم کی پاکی سے متعلق قوانین) کی حفاظت کرے جو آج ہماری قوم کے عام لوگوں میں برتا جاتا ہے۔ اس لیے دارالاقامہ میں کھانا ایک برہمن باورچی پکاتا ہے غرض اس طرح جہاں تک کھانا پکانے کا تعلق ہے، ہم عام دستور کی پیروی کرتے ہیں۔ مگر کھانے میں امتیاز، جہاں تک کھانے والوں کے بیٹھنے کا تعلق ہے، ان قوانین کا جزو نہیں ہے جو پاکی سے تعلق رکھتے ہیں، بلکہ وہ ذات پات کے امتیاز اور اسی کے ساتھ سماجی عدم مساوات کا ایک حصہ ہیں۔ میں جس وقت کھاتا ہوں، اس وقت یقیناً میں خیال کرتا ہوں کہ میں کس قسم کا کھانا کھا رہا ہوں جو مجھے مل رہا ہے اور اس کے تیار کرنے میں کہاں تک صفائی کا خیال رکھا گیا ہے۔ لیکن میں ان کے مذہبی خیالات کا کچھ بہت خیال نہیں کرتا جو میرے ساتھ بیٹھ کر کھا رہے ہیں۔ اور یہ اس وجہ سے کہ میں اس برتری کے احساس کا قایل نہیں جو ذات پات کے امتیاز سے پیدا ہوتی ہے۔ اس غلط برتری کا احساس پیدا کرنے یا اس کے برتنے میں کوئی مذہبیت نہیں ہے۔ امریکہ میں ایک سفید رنگ والا آدمی اپنی توہین سمجھے گا اگر کوئی حبشی اس کے پاس بیٹھ جائے۔ ہم اسی قسم کا امتیاز اپنے اندر پیدا کرتے ہیں، اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ برتری اور کمتری کا سلوک کریں۔ یہ اتنا افسوسناک نہ ہوتا، پھر بھی مضحکہ خیز ضرور ہوتا۔

ہمارے ہاں کوئی قاعدہ نہیں کہ لڑکے کھانے کے لیے کس طرح اور کس ترتیب سے بیٹھیں۔ وہ آپس میں بغیر کسی ہدایت کے بیٹھتے ہیں۔ جہاں تک استادوں کا تعلق ہے، وہ بھی اس قسم کے امتیازات پر کوئی اعتقاد نہیں

سکتے۔ لیکن ودیا پیٹھ میں طالب علم ہیں جو وہاں بیٹھ کر کھاتے ہیں، جہاں کھانا پکانے والے کھاتے ہیں۔ یہ ان کے والدین کے اصرار کی بناء پر ہے جو کٹر قسم کے ہیں لیکن ودیا پیٹھ اس قسم کی باتوں کو آئندہ نہیں بڑھانا چاہتی ہے۔ ہم آئندہ کھانے کی صفائی کی طرف بھی اب سے زیادہ توجہ دیں گے۔ لیکن کھانے کے معاملے میں بیٹھنے کا امتیاز صرف اس وجہ سے کبھی گوارا نہیں کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ ودیا پیٹھ ان امتیازات کو برتری کے خیالات پر مبنی سمجھتی ہے۔ یہ ہمیشہ مذہبی پاکی کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہے گی۔"

کاکا صاحب جو کچھ بھی کہتے ہیں، اس میں وہ اس بات کا بڑا خیال رکھتے ہیں کہ طلبا اور ان کے والدین کے جذبات کو غیر ضروری طور پر ٹھیس نہ پہنچے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "...... دارالاقامہ میں کھانا ایک برہمن باورچی پکاتا ہے۔ اسی طرح جہاں تک کھانا پکنے کا تعلق ہے، ہم تمام دستور کی پابندی کرتے ہیں۔" میرا خیال ہے کہ ایک برہمن باورچی رکھنے کا دستور بھی عرصہ تک ممکن نہ ہو سکے گا۔ یہ واقعہ نہیں ہے کہ صرف برہمن ہی جس معنی میں یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے اگر اس معنی میں لیا جائے، پاکیزگی کے قواعد برتتے ہوں اور نہ وہ ایسا ہمیشہ کرتے ہیں۔ میں نے بہت سے برہمن باورچیوں کو دیکھا ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک نہایت غلیظ ہوتے ہیں۔ اور جو حفظان صحت اور تندرستی کے تمام قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ جن لوگوں کے دونوں آنکھیں ہیں، انہوں نے خود یہ بات دیکھی ہوگی۔ اسی طرح میں نے بہت سے غیر برہمن باورچیوں کو دیکھا ہے جو پاکیزگی کے قواعد کا بھی خیال رکھتے ہیں اور حفظان صحت اور تندرستی کے قوانین بھی جانتے ہیں اور برتتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم 'برہمن' لفظ کے ضروری معنی کو خیال میں رکھیں اور ہر اس شخص کو 'برہمن' خیال کریں جو پاکیزگی کے قاعدے برتتا ہے، تو

پھر تمام قومی مدرسوں کے دارالاقاموں کے لیے اس دستور پر عمل کرنا ممکن ہو جائے گا جو کاکا صاحب نے اس قدر آسانی سے اختیار کیا ہے۔ لیکن اگر برہمن کی اصطلاح صرف انہی تک محدود رکھی جائے جو پیدائشی برہمن ہیں، تو پھر ہمیں اچھی قسم کے بہت برہمن باورچی نہیں ملیں گے اور چند ایک جو ہمیں مل جاتے ہیں، وہ بہت پیسے مانگیں گے اور ایسا ناک بھوں چڑھائیں گے کہ ان کا رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

ودیا پیٹھ سچائی اور اہنسا کے لیے قائم کی گئی ہے، اس لیے ہم کو اپنے دارالاقاموں کے وہی حالات بتانے چاہییں جو اصل میں موجود ہیں ہم انھیں ان لوگوں سے جو ان میں رہتے ہیں یا ان سے باہر ہیں، چھپا نہیں سکتے ہیں۔ اسی لیے کاکا صاحب نے صاف بتادیا ہے کہ ودیا پیٹھ کے دارالاقامہ میں ذات پات کے امتیاز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

('نوجیون' ۹ ستمبر ۱۹۲۸ء)

ہاتھ کا کام

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ہم اپنے ہاتھ کیوں استعمال کریں؟ اور کہہ سکتے ہیں کہ 'ہاتھ کا کام انھیں کرنا ہے جو بے پڑھے لکھے ہیں۔ ہم صرف اپنے وقت کو ادب اور سیاسی مقالات کے مطالعہ میں صرف کر سکتے ہیں۔' میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں محنت کا احترام کرنا چاہیے۔ اگر ایک نائی یا موچی کالج جاتا ہے، اسے اپنے نائی یا موچی کے پیشے کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ میں ایک نائی کے پیشہ کو ایسا ہی اچھا سمجھتا ہوں، جیسا طبابت کے پیشہ کو۔"

(مہاتما گاندھی کی تقریریں اور تحریریں ص ۳۳۸-۳۳۹، ۱۶ فروری ۱۹۱۶ء)

کتائی ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے

مستقبل کے کسی نصاب میں کتائی کو بطور لازمی مضمون کے رکھنا ہوگا

١ جس طرح ہم بغیر سانس لیے اور بغیر کھانے کے زندہ نہیں رہ سکتے ہیں، اسی طرح ہمارے لیے بغیر کتائی کو زندہ کیے معاشی آزادی حاصل کرنا اور اس قدیم ملک سے افلاس دور کرنا ناممکن ہے۔ میں چرخے کو بھی ہر گھر کے لیے ایسا ہی ضروری خیال کرتا ہوں، جیسا چولھے کو۔ کوئی اور تدبیر ہماری قوم کی بڑھتی ہوئی غربت کو دور نہیں کر سکے گی۔

پھر ہر گھر میں چرخا کیسے رائج کیا جائے؟ میں ہر قومی مدرسے میں چرخے کے رواج اور سوت کی باقاعدہ پیداوار کے بارے میں لکھ چکا ہوں۔ ایک مرتبہ ہمارے لڑکے اور لڑکیوں نے جہاں کتائی سیکھ لی، وہ اسے آسانی سے اپنے گھروں میں بھی لے جا سکتے ہیں۔

(ینگ انڈیا، ١٩ جنوری ١٩٢١ء)

کتائی اور مختلف علوم کی تعلیم

میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے تعلیمی اداروں کو صرف کتائی اور بنائی کے ادارے ہونے چاہئیں۔ لیکن میں کتائی اور بنائی کو کسی قومی نظام تعلیم کا ایک ضروری جزو ضرور خیال کرتا ہوں۔ میں بچوں کا تمام وقت اس کے لیے لینا نہیں چاہتا ہوں۔ ایک ماہر فن طبیب کی طرح میں بیمار عضو پر اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ اور اعضاء کے حق میں یہی بہترین طریقہ ہے۔ میں بچہ کے اندر اس کے ہاتھ، اس کے دماغ اور اس کی روح کو نشو و نما دینا چاہتا ہوں اس کے ہاتھ تقریباً مفلوج ہو گئے ہیں۔ اس کی روح کو تمام تر پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اس لیے میں اپنی تعلیم میں ان نقائص کو دور کرنے کے لیے یہی دیں وقت بے وقت دیا کرتا ہوں۔ کیا آدھ گھنٹہ روزانہ کتائی ہمارے بچوں پر بہت بڑا بار ہے؟ کیا اس سے ان کا دماغ مفلوج ہو جائے گا۔؟

میں مختلف علوم کی تعلیم کی قدر کرتا ہوں۔ ہمارے بچے جتنی کیمسٹری اور فزکس پڑھتے ہیں کم ہے۔ اور اگر ان علوم کی طرف ان اداروں میں توجہ نہیں دی گئی ہے جن سے میری براہ راست دلچسپی سمجھی جاتی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پڑھانے کے لیے ہمارے پاس اساتذہ نہیں ہیں اور اس لیے کہ ان علوم کے عملی تجربہ کے لیے بہت قیمتی لیبورٹیوریاں چاہئیں، جن کے لیے ہم اس ابتدائی اور غیر متعین حالات میں تیار نہیں ہیں۔

(ینگ انڈیا۔ ۱۱ مارچ ۱۹۲۹ء)

خودکفالتی پہلو

اگر ہر اسکول میں کتائی ہونے لگے، تو تعلیم کے خرچ سے متعلق ہمارے خیالات میں ایک انقلاب پیدا ہو جائے۔ ہم ایک اسکول کو دن میں چند گھنٹے چلا سکتے ہیں اور طلبا کو تعلیم مفت دے سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک بچہ دن میں چار گھنٹے کتائی کرتا ہے تو وہ ہر روز ۱۰ تولے سوت پیدا کرے گا اور اس طرح اپنے اسکول کے لیے ایک آنہ یومیہ کما کر دے گا۔ پھر فرض کیجیے کہ وہ پہلے مہینے میں کچھ نہیں پیدا کرتا ہے اور اسکول مہینے میں صرف ۲۶ گھنٹے کام کرتا ہے تو پہلے مہینے کے بعد ایک روپیہ دس آنے کمانے لگے گا۔ تیس لڑکوں کی ایک جماعت پہلے مہینہ کے بعد ۴۸ روپیہ ۱۲ آنے فی مہینہ کمانے لگے گی۔

میں نے ادبی تعلیم کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ یہ چند گھنٹے میں سے دو گھنٹے ہوا کرے گی۔ یہ کتنا آسان معلوم ہوتا ہے کہ ہر اسکول بغیر کسی خاص زحمت کے خود کفیل ہو جائے اور قوم اپنے اسکولوں کے لیے تجربہ کار استاد رکھ سکے۔

لیکن اس اسکیم کے چلنے میں سب سے بڑی مشکل چرخے کی ہے۔ اگر یہ کام چلنے لگے تو ہم کو ہزاروں چرخوں کی ضرورت ہوگی۔ خوش قسمتی سے گاؤں کا ہر بڑھئی چرخے بنا سکتا ہے۔ آشرم سے یا کسی اور جگہ سے منگانا سخت غلطی ہے۔ کتائی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ بہت آسان ہے۔ یہ آسانی سے آ جاتی ہے اور بہت تھوڑے خرچ سے ہر گاؤں میں رائج ہو سکتی ہے۔

ہیں نے جو نصاب تجویز کیا ہے، وہ اِس تزکیہ نفس اور تیاری والے سال کے لیے ہے۔ جب حالات معمول پر آجائیں اور سوراج قائم ہو جائے تو صرف ایک گھنٹہ کتائی کے لیے دیا جا سکتا ہے اور بقیہ وقت ادبی تعلیم کے لیے۔

(ینگ انڈیا۔ ۲ر فروری ۱۹۲۱ء)

تعلیم کا خرچ

ہماری تعلیم کا خرچ نہ آبکاری کی آمدنی سے چلنا چاہیے اور نہ زمین کے لگان سے۔ سوراج کے ماتحت اس کا خاص بار چرخے پر ہوگا۔ اگر ہر اسکول اور کالج میں چرخا اور کرگھا چلنے لگیں تو ہماری تعلیم آسانی سے اپنا خرچ نکال لے گی۔ آج میں چاہتا ہوں کہ ہمارے لڑکے اپنا سارا وقت کتائی پر صرف کریں۔ جب سوراج مل جائے تو کم سے کم ایک گھنٹہ دینا کافی ہوگا۔ سوراج کا ہماری زندگی کے ہر ایک شعبہ پر اثر پڑنا ضروری ہوگا۔ ہمارے اسکول آج غلام پیدا کرنے کے کارخانے ہیں۔ سوراج کے اندر جو تعلیم ہوگی اس کا مقصد لڑکوں کو بچپن سے خود کفیل بنانا ہوگا۔ اور کوئی پیشہ بھی انھیں سکھایا جا سکتا ہے لیکن کتائی لازمی ہوگی۔ چرخا ہمارے دکھیوں کا سہارا ہوگا۔ کسی اور چیز میں اس جیسی خوبیاں نہیں ہیں، اس لیے کہ یہی زراعت کے لیے مددگار بن سکتا ہے۔ سب نہ بڑھئی بن سکتے ہیں اور نہ لوہار لیکن سب بُنکر ہو سکتے ہیں اور انھیں

یا تو اپنے ملک کے لیے کاتنا ہوگا یا اپنی آمدنی پورا کرنے کے لیے چونکہ کپڑے کی ضرورت عام ہے، چرخے کی ضرورت بھی عام ہونی چاہیے۔

ہمیں آج سے کتائی کو ادبی تعلیم کا ایک ضروری جزو بنا دینا چاہیے تاکہ سوراج ہونے کے بعد ہمیں اس مسئلہ پر از سر نو غور نہ کرنا پڑے۔

(ینگ انڈیا، ۳۰ مارچ ۱۹۲۱ء)

تعلیم اور شراب کی آمدنی

میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ملک کے لیے بڑی ذلت کی بات ہے کہ اس کے بچے شراب کی آمدنی سے تعلیم حاصل کریں۔ ہماری آنے والی نسلیں ہمیں کوسیں گی اگر ہم نے شراب نوشی کی برائی نہ روکی، خواہ اس کے لیے ہمیں اپنے بچوں کی تعلیم کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔ لیکن ہمیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میں سے بہتوں نے اسکولوں اور کالجوں میں کتائی جاری کر کے تعلیم کو خود کفیل بنانے کا مذاق اڑایا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تعلیم کو جتنا اس سے حل ہو سکتا ہے اتنا اور کسی چیز سے نہیں ہو سکتا۔ ملک نئے ٹیکس کا بار نہیں اٹھا سکتا ہے۔ موجودہ ٹیکس بھی برداشت سے باہر ہے۔

ہمیں نہ صرف افیون اور شراب کی آمدنی کو ختم کرنا ہے بلکہ

اگر مستقبل قریب میں عوام کی بڑھتی ہوئی غریبی کو دور کرنا ہے تو آدر آمدنیوں کو بھی کافی کم کرنا ہوگا۔

(ینگ انڈیا۔ ۸ رجون ۱۹۲۱ء)

کتائی کے تین پہلو

کون نہیں جانتا کہ خاندان کے باپوں نے جنھیں اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے، کون سی قابل اعتراض باتیں کرنی اپنا فرض نہیں سمجھا ہے مجھے یقین ہے کہ جب تک ہم اپنی تعلیم کے پورے نظام کو نہ بدلیں گے ہمیں اور بھی برے دن دیکھنے ہوں گے۔ ہم نے بچوں کے وسیع سمندر کا صرف کنارا چھوا ہے۔ ہمارے عوام کی بڑی تعداد بغیر کسی تعلیم کے ہے اور یہ کسی اپنے ارادے کی کمی کی وجہ سے نہیں بلکہ والدین کی قابلیت اور علم کی کمی سے ہے۔ اس میں کوئی بڑی بنیادی غلطی ہے اور بالخصوص ایک ایسی غریب قوم کے معاملہ میں جیسی ہماری ہے، جہاں والدین کو بہت سے بڑے بڑے بچوں کی کفالت کرنی ہوتی ہو اور انھیں اتنی خرچیلی تعلیم دینی ہوتی ہو جس کا بچے فوری طور پر کوئی صلہ نہ دے سکتے ہوں۔ میں اس میں بچوں کا کوئی ہرج نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی تعلیم کا خرچ شروع ہی سے کام کے ذریعہ پورا کریں۔ سب سے آسان دستکاری جو سب کے لیے موزوں ہو اور جو سارے ہندوستان میں چل سکتی ہو وہ

بلا شبہ کتائی ہے مع اپنے دوسرے کاموں کے، جو اس سے پہلے کیے جاتے تھے۔ اگر ہم اسے اپنے تعلیمی اداروں میں جاری کر سکیں تو ہم تین مقاصد پورے کر سکتے ہیں۔ تعلیم کو خود کفیل بنا سکتے ہیں، بچوں کے جسم اور دماغ دونوں کی تربیت کر سکتے ہیں اور بدیسی سوت اور بدیسی کپڑے کے مکمل مقاطعے کے لیے راستہ ہموار کر سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے اس طرح بچے جو تیار ہوں گے، ان میں خود اعتمادی اور آزادی بھی ہوگی۔

(ینگ انڈیا۔ ۱۵ر جون ۱۹۲۱ء)

لازم اور مفت تعلیم کا خرچ

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر لڑکا اور لڑکی جو اسکول جانے کی عمر کا ہے، سرکاری مدرسوں میں جانے لگے تو ہمارے پاس موجودہ تعلیم کے خرچ کے لیے وسائل نہیں اور نہ لاکھوں والدین ایسے ہیں جو وہ فیسیں ادا کر سکیں جو آج لی جاتی ہیں۔ اس لیے تعلیم کو اگر عام ہونا ہے تو اسے مفت بھی ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ ایک مثالی نظام حکومت میں بھی ہم ذرائع رزد لیے ان سب بچوں کی تعلیم کے لیے جو اسکول جانے کی عمر کو پہنچ گئے ہیں، خرچ نہ کر سکیں گے۔ اس لیے اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے کہ کہ ہمارے بچوں کو اس تعلیم کے لیے جو انھیں

ملے گی۔ جزءً یا کلیتاً محنت کے ذریعہ ادا کرنا ہوگا۔ ایسی عام محنت جو نفع بخش بھی ہو (میرے خیال میں) صرف ہاتھ کی کتائی اور ہاتھ کی بنائی ہو سکتی ہے لیکن میری تجویز کا منشا پورا کرنے کیلئے اس میں کوئی فرق نہیں کہ خواہ ہم کتائی رکھیں یا کام کی کوئی اور شکل ہو، بشرطیکہ اس کا حساب ہو سکے، یہ صرف جانچ پڑتال کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ عملی، نفع بخش اور بڑے پیمانہ پر کوئی اور پیشہ نہیں ہو سکے گا، سوائے اس کے کہ وہ کپڑا پیدا کرنے کے کاموں سے تعلق رکھتا ہو اور جو ہندوستان بھر میں تمام اسکولوں کے اندر رائج کیا جا سکتا ہو۔ ہاتھ کا کام شروع کرنے سے ہمارے جیسے غریب ملک کے لیے دو مقصد حاصل ہوں گے۔ ایک تو اس سے اپنے بچوں کی تعلیم کا خرچ پورا ہوگا، اور دوسرے وہ ایسا کوئی کام سیکھ لیں گے جو انھیں بعد کی زندگی میں اگر وہ چاہیں تو روزی کمانے کا بھی ذریعہ بن سکے۔ ایسے نظام سے ہمارے بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ ہماری قوم کے لیے اس سے زیادہ ذلت کی اور کوئی چیز نہیں کہ ہم محنت کو حقارت کی نظر سے دیکھیں۔

(ینگ انڈیا، ۱ر ستمبر ۱۹۲۱ء)

محنت کی عزت

دوسرے ملکوں کے بارے میں خواہ کچھ بھی صحیح ہو، لیکن ہندوستان میں جہاں اسی فیصد آبادی زراعت پیشہ ہو اور دس فیصد صنعت پیشہ،

ایسی صورت میں یہاں کی تعلیم کو صرف ادبی رکھنا جرم ہے اور لڑکے اور لڑکیوں کو بعد کی زندگی میں ہاتھ کے کام کے لیے نا قابل بنا دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ چونکہ ہمارے وقت کا بڑا حصہ ہمیں اپنی روزی کمانے کے لیے محنت کرنے میں صرف کرنا پڑتا ہے، ہمارے بچوں کی ایسی تعلیم نہ ہونی چاہیے کہ وہ محنت کو حقارت کی نظر سے دیکھیں۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک کسان کا لڑکا مدرسہ جانے کے بعد مزدور ہو کر بے کار ہو جائے، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے اسکول کے لڑکے ہاتھ کے کام کو اگر حقارت سے نہیں تو پسندیدگی کی نظر سے بھی نہیں دیکھتے ہیں

(ینگ انڈیا، یکم ستمبر ۱۹۲۱ء)

مدرسوں میں کتائی

اگر کتائی کو ایک ضروری صنعت کے طور پر دوبارہ زندہ کرنا ہے تو اسے نہایت سنجیدگی کے ساتھ لینا چاہیے اور اسے صحیح اور سائنٹیفک طریقہ پر سکھانا چاہیے جس طرح کسی اچھے مدرسے میں اور مضامین سکھائے جاتے ہیں تو اس وقت چرخے صحیح اور اچھی حالت میں ہوں گے اور اس جانچ پر پورے اتریں گے جن کا ذکر ان صفحات میں وقتاً فوقتاً آتا رہا ہے اور بچوں کے کام کی روزمرہ اور باقاعدہ اسی طرح جانچ ہوتی رہے گی جس طرح ان کی

اور شغلوں کی ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔

چرخے پر کاتنا انھیں اس وجہ سے سکھانا چاہیے کہ اگر لڑکے اور لڑکیاں چاہیں تو انھیں اپنے گھروں میں چلا سکتے ہیں، لیکن درجہ میں کاتنے کے لیے تکلی سب سے سستا اور سب سے نفع بخش آلہ ہے۔

('ینگ انڈیا' ۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۵ء)

آزادی لیکن ضبط کے اندر

بچوں میں اپج ہونی چاہیے۔ انھیں صرف نقال نہیں بننا ہے۔ انھیں اپنے طور پر خود سوچنا اور کام کرنا ہے اور اسی کے ساتھ پورے طور پر اطاعت گزار اور ضبط کا پابند بھی ہونا ہے۔ آزادی کی اعلیٰ سے اعلیٰ شکل ضبط اور انکسار کی بھی زیادہ سے زیادہ خوبیاں اپنے اندر رکھتی ہے۔ جو آزادی ضبط اور انکسار سے پیدا ہوتی ہے، اس کو کوئی شخص روک نہیں سکتا ہے۔ مطلق آزادی بازاری پن کی علامت ہے جو خود کو بھی نقصان پہنچاتی ہے اور پڑوسی کو بھی۔

('ینگ انڈیا' ۳ر جون ۱۹۲۶ء)

دوسرا باب

موجودہ نظامِ تعلیم

موجودہ نظامِ تعلیم

ہماری تعلیم تمام تر بدیسی ہے۔ بغیر ایک قومی نظامِ تعلیم کے ہماری تمام کوششیں بے کار ہوں گی۔ جب کبھی بھی ہم سوراج حاصل کریں گے۔ خواہ آج ہو یا اب سے کچھ عرصہ بعد، یہ یاد رکھنا ہوگا کہ بغیر قومی تعلیم کے وہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکے گا۔ بچے کے ابتدائی پانچ سال کے علاوہ اس کی بقیہ تعلیم ایک بدیسی زبان کے ذریعہ ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے پہلے پانچ سالوں میں جو بعض حیثیتوں سے بہت مفید اور بڑا اہم زمانہ ہوتا ہے، تعلیم بالعموم بہت معمولی قسم کے استادوں کے ہاتھوں دی جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد انگریزی شروع ہو جاتی ہے۔ اس منزل پر لڑکے گویا ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ جو تعلیم انہیں دی جاتی ہے، اس کا ان کے گھر کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لڑکے جو اس وقت نہایت خوش خوش زمین پر بیٹھ کر اپنے سبق پڑھتے تھے، اب وہ بنچوں پر بیٹھنے لگے ہیں۔ آج بھی بہت سے گھروں میں فرش پر بیٹھنے کا دستور ہے۔ اس وقت تک لڑکا اگر ہندو کا ہے، تو وہ دھوتی کرتہ اور انگرکھا پہنتا تھا۔ اور اگر وہ مسلمان کا ہے تو دھوتی کی جگہ پاجامہ پہنتا تھا۔ لیکن اب وہ کوٹ اور پتلون پہنتا ہے۔ اس وقت تک وہ سرکنڈے کے قلم سے لکھتا تھا لیکن اب وہ فونٹین پین یا آہنی نب کا استعمال کرتا ہے غرض اس کی خارجی زندگی میں بہت سی نمایاں تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ اور گھر اور مدرسہ کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی ہے آہستہ

آہستہ لیکن یقینی طور پر یہ تبدیلی اس کی اندرونی زندگی میں بھی داخل ہو رہی ہے۔ لڑکے کی اس خارجی زندگی اور اس کی اندرونی ذہنی ساخت کی یہ تبدیلیاں اس کے گھر اور گھر کے لوگوں پر اثر انداز ہوں گی۔ اسکے والدین کو کچھ نہیں معلوم ہے کہ ان کا لڑکا کس قسم کی تعلیم پا رہا ہے اور اس تعلیم پر ان کے اعتقاد کو توڑ کر رکھ دیا!

والدین صرف یہ جانتے ہیں کہ اس تعلیم سے اسے کچھ روپیہ کمانے کا مدد ملے گی اور یہ ان کے اطمینان کے لیے کافی ہے۔ اگر یہی صورت حال عرصہ تک قائم رہی تو ممکن ہے ہم سب بدیسی ہو جائیں! لیکن جو اس سے زیادہ برا ہوگا وہ یہ کہ جس سوراج کے لیے ہم لڑ رہے ہیں وہ جب ہم پالیں گے تو اندیشہ ہے کہ نوعیت میں ایک بدیسی راج نہ ہو اور جس کا نتیجہ یہ ہو کہ جس بوجھ تلے ہم آج دبے جا رہے ہیں وہ سوراج کے بعد بھی قائم رہے۔ اس خطرے سے بچنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہمیں اپنے نظام تعلیم کو از سر نو بدلنا ہے۔

(ایک مذہبی ماہنامہ آموختہ سے لیا گیا)

انگریزی تعلیم

یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ انگریزی تعلیم جس طریقے سے دی گئی ہے، اس نے انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی کو آختہ کر دیا ہے اس نے

ہندوستانی طلبا کی اعصابی قوت پر بہت بوجھ ڈالا ہے اور اس نے ہمیں نقال بنا دیا ہے۔ دیسی زبانوں کی بجائے کس طرح انگریزی کو جگہ دی گئی ہے، یہ برطانوی حکومت کا ایک بہت افسوسناک باب ہے۔ رام موہن رائے اور بڑے مصلح ہوتے، اور لوکمانیہ تلک کہیں بلند پایہ فاضل ہوتے، اگر انہوں نے انگریزی میں سوچنا شروع نہ کیا ہوتا اور پھر بعد میں اپنے خیالات خاص طور پر انگریزی میں ظاہر نہ کیے ہوتے۔ اگر ان کی تعلیم و تربیت ایک غیر فطری نظام میں نہ ہوئی ہوتی تو ان کے اثرات اپنی قوم پر جیسے حیرت انگیز تھے، وہ اور بھی زیادہ حیرت انگیز ہوتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان دونوں نے انگریزی ادب کے خزانہ سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن یہ ذخیرہ انھیں اپنی دیسی زبانوں کے ذریعہ بھی مل سکتا تھا۔ کوئی ملک نقالوں کی نسل پیدا کر کے قوم نہیں بن سکتا ہے۔ غور کیجیے کہ اگر ان کے پاس انجیل کا ایک مستند ترجمہ نہ ہوتا تو انگریزی زبان کا کیا حال ہوا ہوتا۔ میرا عقیدہ ہے کہ چیتنیہ، کبیر، نانک، گرو گوبند سنگھ، شیواجی اور پرتاپ، رام موہن رائے اور تلک سے کہیں بڑے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ مقابلہ کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنے اپنے طور پر سب بڑے تھے۔ لیکن نتائج کے اعتبار سے، اگر دیکھا جائے تو رام موہن رائے اور تلک کا اثر عوام پر اتنا مستقل اور دور رس نہیں ہے، جتنا اور دوں کا جو ان سے زیادہ خوش نصیب پیدا ہوئے تھے۔ ان دشواریوں کے مقابلہ میں دیکھا جائے جن کا انھیں سامنا کرنا پڑا تو وہ بے شک قوی ہیکل دیو تھے اور دونوں اپنے نتائج حاصل کرنے میں اور زیادہ بڑے ہوتے اگر انھیں اس نظام کا نقصان نہ اٹھانا ہوتا جس کے ماتحت رہ کر انہوں نے اپنی تربیت حاصل کی۔ میں اسے ہرگز نہیں تسلیم کر سکتا۔

کہ راجہ (رام موہن رائے) اور لوکمانیہ تلک انگریزی زبان کی تعلیم کے بغیر ان خیالات کو نہیں سوچ سکتے تھے۔ ان تمام توہمات میں جو ہندستان میں موجود ہیں کوئی اس سے بڑا توہم نہیں ہے کہ انگریزی زبان کا جاننا آزادی کے خیالات جذب کرنے اور صحیح طور پر سوچنے کی عادت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گزشتہ پچاس سال سے ملک کے سامنے صرف ایک ہی نظام تعلیم رہا ہے اور صرف ایک ہی اظہار خیال کا ذریعہ ہمارے ملک پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ہمارے پاس کوئی اعداد و شمار نہیں کہ بغیر موجودہ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کے دوسری صورت میں ہم کیا ہوتے، لیکن اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ ہندستان آج پچاس برس پہلے سے زیادہ غریب ہے، وہ آج اپنے کو حملوں سے بچا نہیں سکتا اور اس کے بچوں میں طاقت و توانائی کی پہلے سے زیادہ کمی ہے۔ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے نظام حکومت کی خرابی کی وجہ سے ہے اور نظام تعلیم اس کا سب سے ناقص حصہ ہے۔

اس کا تصور غلط طور پر ہوا اور اس کی پیدائش بھی غلط طور سے ہوئی اس لیے کہ ہمارے انگریز حکمرانوں کا دیانتداری سے خیال تھا کہ ہمارا دیسی نظام قطعی بے کار ہے۔ اس کی پرورش بھی غلط ہوئی ہے، اس لیے کہ کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ ہندستانی جسم، دماغ اور روح کو کسی طرح پنپنے نہ دیا جائے۔

(ینگ انڈیا، ۲۷ اپریل ۱۹۲۱ء)

موجودہ تعلیم

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ تعلیم لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے؟
جس طرح تمام ہندوستان کا حال ہے، وہی بڑودہ کا بھی ہے، غالب آبادی زراعت
پیشہ لوگوں کی ہے۔ کیا ان کسانوں کے بچے بہتر کسان ہو سکتے ہیں؟ کیا اس تعلیم
کے بدلے جو انھوں نے حاصل کی ہے، ان میں اخلاقی اور مادی ترقی ظاہر ہوئی ہے
پچاس سال کا زمانہ نتائج ظاہر ہونے کے لیے کافی طویل زمانہ ہوتا ہے۔ مجھے
اندیشہ ہے کہ تحقیقات کا نتیجہ اطمینان بخش نہیں ہو سکتا ہے۔ بڑودہ کے کسان
اپنے اور کہیں کے بھائیوں سے نہ زیادہ خوش ہیں اور نہ زیادہ بہتر۔ قحط کے زمانہ میں
وہ ایسے ہی مجبور ہیں جیسے اور کوئی۔ ان کے گاؤں کی صفائی کی حالت ایسی ہی
خراب ہے جیسی ہندوستان کے اور حصوں کی۔ وہ اپنے کپڑے بنانے تک کی قدر و
قیمت سے واقف نہیں۔ بڑودہ میں ہندوستان کی بعض زرخیز ترین زمینیں ہیں
اسے اپنا کیا س باہر بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ یہ آسانی سے ایک خود کفیل ریاست
بن سکتی ہے جس کے کسان بہت خوش حال ہوں گے۔ لیکن یہاں کے تمام لوگ
بدیسی کپڑوں میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ جو ان کی غریبی اور انحطاط کی کھلی نشانی
ہے۔ نہ یہ لوگ شراب کے معاملہ میں کچھ زیادہ بہتر ہیں۔ غالباً یہ دوسروں
سے بھی برے ہیں۔ بڑودہ کی تعلیم بھی شراب کی آمدنی سے ایسی ہی رنگین ہے،
جیسی انگریزی حکومت کی تعلیم۔ کالی پرجا کے بچے شراب نوشی کی لعنت سے
باوجود اس تعلیم کے جو انھیں ملے گی، تباہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بڑودہ کی تعلیم

برنیادی تعلیم کی ایک علامانہ نقل ہے۔ اعلیٰ تعلیم ہمیں خود اپنے دیس میں بدیسی بنا دیتی ہے اور ابتدائی تعلیم جو اب دی جاتی ہے عملاً کسی کام نہیں آتی، تقریباً بے کار رہتی ہے۔ اس میں نہ کوئی جدت پسندی ہے اور نہ کوئی فطرت پسندی۔ اسے جدت پسند ہونے کی ضرورت نہیں اگر یہ صرف دیسی ہو۔

(ینگ انڈیا۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۲۹ء)

ہمارے تعلیمی مسئلہ کے چند اہم پہلو

آپ نے مجھے اس کانفرنس کا صدر منتخب کر کے میری بڑی عزت افزائی کی ہے، اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس عہدے کی اہلیت نہیں رکھتا ہوں میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اپنے ملک کی خدمت میں نے جن جن دائروں میں کی ہے وہ بھی مجھے اس بڑے اعزاز کا مستحق نہیں بنا سکتا ہے جو آج آپ نے مجھے بخشا ہے۔ میں صرف اس کی ایک وجہ سمجھتا ہوں اور وہ میری گجراتی زبان سے محبت ہے۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ میں نے صرف اسی بنیاد پر یہ اہم ذمہ داری قبول کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ جس فیاضی سے آپ نے مجھے یہ عزت بخشی ہے اسی فیاضی سے آپ میری خامیوں کو بھی نظر انداز کر دیں گے اور اس کام میں میری امداد فرمائیں گے جو اسی قدر آپ کا ہے جتنا میرا ہے۔

یہ کانفرنس گزشتہ مسائل کے جائزہ لینے کے لیے منعقد کی گئی ہے جس

طرح کسی بڑے شخص کے معاملہ میں ہم اکثر اس کے بڑے ہونے کے آثار اس کے بچپن ہی میں دیکھتے ہیں، اسی طرح اس کانفرنس کا حال بھی ہے۔ میں نے اس کے گزشتہ سال کے کاموں کی روئداد پڑھی ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس ادارے کے لیے موجب فخر ہے۔ اس کے سکریٹری صاحبان مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایسی اچھی رپورٹ تیار کی اور اس موقع پر اسے پیش کیا۔ یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہمیں ایسے لائق سکریٹری ملے جن لوگوں نے اب تک یہ رپورٹ نہیں پڑھی ہے، میں ان سے سفارش کروں گا کہ وہ ضرور اسے پڑھیں اور اس پر غور کریں۔

شری رنا جیت رام دادا بھائی کا گزشتہ سال انتقال ہمارے لیے بہت افسوس کا مقام ہے۔ یہ ہمارے لیے بڑے رنج کی بات ہے کہ ایک ایسا تعلیم یافتہ اور روشن خیال شخص عین جوانی میں ہم سے چھین لیا گیا۔ خدا ان کی آتما کو شانتی بخشے۔ میں ان کے خاندان والوں سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ صبر سے کام لیں اور یہ یقین دلاتا ہوں کہ ہم سب ان کے اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔

جس انجمن نے یہ کانفرنس مدعو کی ہے، اس نے اپنے سامنے تین مقصد رکھے ہیں۔

۱۔ تعلیم کے مسائل پر رائے عامہ پیدا کرنا۔

۲۔ گجرات کے تعلیمی مسائل کا مناسب ذرائع سے پروپگنڈا کرنا۔

لہ یہ گجرات ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارتی تقریر ہے جو ۱۹۰۷ء میں بھروچ میں ہوئی تھی۔ (مرتب)

۴۔ گجرات میں تعلیم کی ترقی کے لیے عملی تدابیر اختیار کرنا۔

میں نے ان مقاصد پر کافی غور کیا ہے اور چند خاص نتائج پر پہنچا ہوں جنہیں میں آپ کے سامنے اس خیال سے پیش کروں گا کہ آپ کو ان سے اتفاق ہوگا۔

ذریعہ تعلیم کا مسئلہ

ہمیں یہ صاف طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات جو ہمیں کرنی ہے وہ یہ ہے کہ ذریعہ تعلیم کے متعلق ہم کسی متعین فیصلہ پر پہنچیں جب تک یہ نہ ہوگا، مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری اور سب کوششیں تقریباً بے سود ثابت ہوں گی۔ ذریعہ تعلیم پر غور کرنے سے بیشتر تعلیم دینا ایسا ہی ہوگا جیسے بغیر بنیاد کے عمارت کھڑی کرنا۔

اس مسئلہ پر اس وقت تعلیم کے ماہروں میں دو رائیں ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ تعلیم مادری زبان میں دی جانی چاہیے، یعنی گجراتی میں۔ دوسرے یہ کہتے ہیں کہ انگریزی میں ہونی چاہیے۔ دونوں فریق ایمانداری سے اپنا اپنا خیال رکھتے ہیں، اس لیے کہ دونوں کے پیش نظر ملک کا مفاد ہے۔ لیکن جس مقصد کے لیے ہم کام کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے صرف نیک نیتی کافی نہیں ہے۔ یہ دنیا کا تجربہ ہے کہ نیک نیتی بعض وقت ہمیں ایسی منزلوں تک لے جاتی ہے، جہاں ہم جانا نہیں چاہتے۔ اس لیے ہمیں دونوں رایوں کے اچھے اور برے پہلوؤں پر پورے طور سے غور کر لینا چاہیے، اور اس بڑے اور اہم مسئلہ کو حسب منشا حل کرنا چاہیے اور ممکن ہو سکے تو اتفاق رائے سے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ

یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور ہم اس پر جس قدر بھی غور کریں کم ہے۔

ذریعہ تعلیم کا مسئلہ تمام ہندوستان کا مسئلہ ہے، لیکن ہر صوبہ یہ مسئلہ اپنے اپنے طور پر حل کر سکتا ہے۔ یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ جب تک اس کے متعلق سب میں اتفاق رائے نہ ہو جائے، گجرات اپنے طور پر آگے قدم نہیں اٹھا سکتا ہے۔

ہم اگرچہ دوسروں سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی بعض مشکلیں کو دور کر سکتے ہیں، اس بنا پر کہ اور صوبوں میں لوگوں نے اس کے متعلق کیا کیا ہے۔ تقسیم بنگال کے وقت جب سودیشی کی تحریک بہت زوروں سے چل رہی تھی اس وقت بنگال میں بنگالی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کی کوشش کی گئی۔ قومی مدرسے اور کالج بھی قائم ہوئے۔ روپے کی کوئی کمی نہ تھی، ہر طرف سے روپوں کی بارش ہو رہی تھی، لیکن یہ تجربہ ناکام رہا۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اس تحریک کے چلانے والوں میں اپنے تجربہ پر اعتقاد کی کمی تھی۔ یہی بات ان استادوں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے جو اس میں شریک ہوئے۔ بنگال میں تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی کا گرویدہ ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بنگالی ادب نے اس زمانہ میں جو ترقی کی ہے، وہ خاص طور سے اس وجہ سے ہے کہ بنگالی لوگوں کو انگریزی زبان اور ادب پر بہت عبور ہے۔ لیکن اس ظاہری قرینہ کی واقعات تردید کرتے ہیں۔ ہمارے محبوب شاعر، رابندر ناتھ ٹیگور کا ساحرانہ اسلوب ان کے اپنے انگریزی علم کا رہین منت نہیں ہے۔ اس کا اصل سبب خود ان کا اپنی زبان سے عشق ہے۔ گیتانجلی اصل میں بنگالی زبان میں لکھی گئی ہے۔ وہ بنگال میں ہمیشہ اپنی مادری زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ عظیم الشان تقریر جو انہوں نے ابھی حال میں موجودہ حالات کے متعلق کلکتہ میں کی ہے، وہ بنگالی زبان میں کی ہے جو لوگ ان کی یہ تقریر سننے کے لیے گئے تھے، وہ بنگال کے بعض ممتاز مرد اور عورتوں

تھا تھے۔ اور مجھے ان لوگوں نے بتایا ہے، جو اس موقع پر موجود تھے کہ انھوں نے واقعتاً اپنے سامعین کو ڈیڑھ گھنٹے تک اپنے لفظوں کی حیات بخش بارش سے مسحور کر رکھا تھا۔ انھوں نے اپنے خیالات انگریزی ادب سے نہیں لیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ملک کے ماحول اثر سے حاصل کیے ہیں۔ یہ ہمارا شاندار ہندوستانی آکاش ہے جس نے انھیں متاثر کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہی بات دوسرے بنگالی مصنفوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ٹیگور پر اپنشدوں کا بھی بہت اثر پڑا ہے۔

جب مہاتما منشی رام جو ہمالیہ کی طرح سڈول اور سیدھے جسم کے ہیں ہندی میں تقریر کرتے ہیں تو مرد، عورت اور بچے سب ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی انگریزی اپنے انگریز دوستوں کے لیے اٹھا رکھی ہے۔ اور وہ اپنی ہندی کو انگریزی الفاظ کا ہندی میں ترجمہ کر کے مسخ اور خراب نہیں کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ اس شریف النفس مدن موہن مالوی کی انگریزی جس نے ملک کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے، چاندی کی طرح چمکتی ہے۔ مالوی جی جو کچھ کہتے ہیں اس پر وائسرائے کو بھی سوچنا پڑتا ہے، اس لیے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن اگر ان کی انگریزی چمکتی ہوئی چاندی کی طرح ہے تو ان کی ہندی خالص سونے کی مانند ہے۔ کہتے ہیں کہ گنگا جب مانسرور سے نیچے اترتی ہے تو سونے کی طرح چمکتی ہے، اسی طرح ان کی تقریریں بھی نہایت روشن، مجلّا اور بے داغ دھبے کے ہوتی ہیں۔

یہ ان تینوں بڑے مقررین نے اپنی قوتِ بیان میں کمال انگریزی کی بدولت حاصل نہیں کیا ہے بلکہ یہ اپنی اپنی زبانوں سے محبت اور تعلق کی

بنا رہے ہے۔ سوامی دیانند نے ہندی کی بڑی خدمت کی ہے، اس لیے نہیں کہ
وہ انگریزی جانتے تھے، بلکہ اس لیے کہ انھیں ہندی سے محبت تھی۔ نکا رام
اور رام داس جنھوں نے مرہٹی زبان کو رونق بخشی، ان کا انگریزی سے
کوئی تعلق نہ تھا۔ پرمانند اور شام لال بھٹ اور دلپت رام جو آج اس زمانہ
کے ہیں، انھوں نے گجراتی ادب کو بہت مالا مال کیا ہے۔ ان کی اس شاندار
کامیابی کو ان کے انگریزی جاننے پر محمول نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اوپر دی ہوئی مثالوں سے یہ بات بلاشبہ ثابت ہو جاتی ہے کہ مادری
زبان کو مالا مال کرنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے، وہ انگریزی جاننا نہیں
ہے، بلکہ خود اپنی زبان کی عزت اور اس سے محبت ہے۔

اگر ہم مختلف زبانوں کے نشو و نما اور ترقی کا مطالعہ کریں گے تو ہم اسی
نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ اصل میں ان لوگوں کی عکاسی کرتی ہے جو انھیں استعمال
کرتے ہیں۔ زبان خود کو ان کے اوصاف اور اعمال کے مطابق ڈھال لیتی
ہے جو اس کے بولنے والے ہوتے ہیں۔ ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ وہ لوگ جن
کی زبان میں بہادری، ایمانداری اور رحم کے اوصاف نہیں پائے جاتے ہیں
ان میں خود یہ اوصاف بھی نہیں ہوتے۔ دوسری زبانوں سے بہادری اور رحم
کے الفاظ لینے سے اس زبان کے اندر یہ خوبیاں پیدا نہیں ہو سکتی ہیں اور نہ
اس کے بولنے والوں کو بہادر اور رحم دل بنا سکتی ہیں۔ بہادری کسی شخص پر
لادی نہیں جا سکتی ہے، یہ اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ ہاں اگر اس پر زنگ آ
گیا ہو تو زنگ رفع ہونے سے یہ چمکنے لگ جاتی ہے۔ خود ہماری مادری زبان
میں ہمیں بہت سے ایسے الفاظ ملیں گے جن سے انتہائی بزدلی کا اظہار ہوتا
ہے، اس لیے کہ ہم بہت عرصہ تک محکوم رہے ہیں۔ اسی طرح دنیا کی کسی

اور زبان میں اتنے الفاظ نہیں ملیں گے جو جہاز یا جہاز سے متعلق چیزوں کو ظاہر کرتے ہوں جتنے انگریزی میں ہیں۔ فرض کرو کہ کوئی من چلا گجراتی مصنف انگریزی سے گجراتی میں فن جہاز رانی پر کتابیں ترجمہ کرنے لگے تو اس سے ہماری زبان کی طاقت اور وسعت میں ایک ذرہ اضافہ نہیں ہوگا اور نہ اس سے ہمارا کسی طرح جہازوں کا علم بڑھ جائے گا۔ لیکن جب ہم جہاز بنانے لگ جائیں اور ایک بیڑہ تیار کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کے لیے یہ ضروری اصطلاحات از خود پیدا ہو جائیں گی۔ ریورینڈ ٹیلر آنجہانی نے یہی رائے اپنی گجراتی گرامر کی کتاب میں بھی ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ہم اکثر اس سوال پر بحث سنتے ہیں کہ آیا گجراتی زبان مکمل ہے یا نامکمل۔ ایک مثل ہے "جیسا بادشاہ ویسی رعایا"، دوسری مثل ہے: جیسا استاد ویسے شاگرد۔ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں:۔ جیسا بولنے والا ویسی اس کی زبان۔ یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ شامل بھٹ اور دوسرے شعراء کو اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار میں گجراتی زبان کے نامکمل ہونے کی وجہ سے کوئی دقت محسوس ہوئی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے جدید اور قدیم الفاظ کے استعمال میں ایسے لطیف امتیاز سے کام لیا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا یا لکھا، وہ چل گیا اور لوگوں کے روزمرہ میں شامل ہو گیا۔

بعض حیثیتوں سے دنیا کی تمام زبانیں نامکمل کہی جا سکتی ہیں۔ بہت سی چیزیں ہیں جو انسان کے محدود دماغ اور قوت بیان سے باہر ہیں۔ مثال کے طور پر خدا اور ابدیت کو لیجیے۔ زبان کی ترقی کا انحصار انسان کے ذہن پر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ذہن اس حد تک نہیں پہنچ پاتا ہے یا کسی مضمون کا پورے طور پر احاطہ نہیں کر سکتا ہے تو اس کا عکس زبان میں ظاہر

ہوتا ہے اور وہ اس حد تک نامکمل کہی جا سکتی ہے۔ زبان کا عام اصول یہ ہے کہ اس میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، وہ، وہ خیالات ہیں جن سے اس زبان کے بولنے والوں کے دماغ پُر تھے۔ اس لیے قدرتاً زبان کی حیثیت وہ ہوگی جو اس کے بولنے والوں کی ہے۔ اگر لوگ عقل مند ہیں تو ویسی ہی ان کی زبان بھی ہوگی۔ اگر لوگ بیوقوف ہیں تو ان کی زبان بھی ویسی ہی ہوگی ایک انگریزی مثل ہے: ایک خراب کاریگر اپنے اوزاروں سے لڑتا ہے۔ جو لوگ اپنی زبان کے نامکمل ہونے کی شکایت کرتے ہیں وہ اس کاریگر کی طرح ہیں۔ ایک طالب علم جس نے انگریزی کی سطحی قابلیت حاصل کی ہے وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ گجراتی ناقص زبان ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی سے مادری زبان میں صحیح صحیح ترجمہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ قصور اصل میں زبان کا نہیں ہے بلکہ ان کا ہے جو اسے استعمال کرتے ہیں جب تک لوگوں نے نئے محاورے نئے مضامین اور نئے اسلوب بیان کے سمجھنے کی عادت پیدا نہیں کی ہے، لکھنے والا ڈرتا ہے کہ کہیں اس کی محنت ضائع نہ جائے۔ مصنف کبھی لکھنے کے لیے آمادہ نہ ہوگا، جب تک کہ پڑھنے والے یعنی لوگ اچھے اور بُرے یا نئے اور پرانے کے درمیان تمیز کرنے کے لیے تیار نہ ہوں یا اس کی کوششوں کی داد نہ دے سکیں۔

بعض لوگ جو انگریزی سے ترجمہ کرتے ہیں، وہ اس خیال میں بھولے ہوئے ہیں کہ انھوں نے گجراتی گویا اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ پی ہے۔ اور انگریزی مطالعہ سے حاصل کی ہے، اور اس طرح وہ دونوں زبانوں کے بڑے ماہر ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ گویا ان کو گجراتی کے باقاعدہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن خود اپنی زبان میں مہارت پیدا کرنی اس سے زیادہ اہم ہے۔

جتنا ایک غیر زبان کے حاصل کرنے میں کوشش کرنا۔ غالب اور دوسرے شعرار کے کلام کو دیکھو تو تم پاؤگے کہ انھوں نے اپنی مادری زبان پر قدرت حاصل کرنے کے لیے کتنی کوششیں کی ہیں۔ اس شخص کے لیے جس نے ہماری زبان کے فن کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، اسے گجراتی ناقص ہی معلوم ہوگی۔ لیکن ایک مرتبہ جہاں اس نے اس میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کی، وہ اس کے لیے مکمل ہو جائے گی۔ اگر یہ کوششیں دل سے نہیں کی گئی ہیں تو اس کی یہ قدرت ناقص ہوگی، اور اگر کوششیں مکمل کی گئی ہیں تو زبان نہ صرف مکمل بلکہ اور خوبصورت نظر آئے گی۔ گجراتی آریائی زبانوں کے زمرے سے تعلق رکھتی ہے، وہ سنسکرت کی بیٹی ہے اور بہت سی ترقی یافتہ زبانوں کی بہن۔ کون اسے ناقص کہنے کی جرأت کرسکتا ہے؟

"خدا اسے اپنی برکتوں سے نوازے۔ اور خدا کرے وہ ہمیشہ صحیح علم اور صحیح مذہب کا ایک اچھا آلہ بنی رہے۔"

غرض ہم دیکھتے ہیں کہ بنگال میں بنگالی کے ذریعہ تعلیم دینے کی تحریک کی ناکامی خود اس زبان میں کسی بنیادی کمزوری یا ایسی کوشش کے بے سود ہونے کا نتیجہ نہیں ہے۔ اگر اس سے کوئی بات ثابت ہوتی ہے تو وہ ان لوگوں کی نااہلی جنھوں نے یہ کوشش شروع کی، یا ان کے اعتقاد کی کمی تھی۔

شمالی ہند میں ہندی یقیناً اچھی ترقی کر رہی ہے لیکن اسے بہ طور ذریعہ تعلیم کے استعمال کرنے کی صرف آریہ سماج کے لوگوں نے کوشش کی ہے گروکلوں میں یہ کوشش برابر کی جا رہی ہے۔

مدراس میں مادری زبان کے استعمال کرنے کی تحریک ابھی چند سال سے شروع ہوئی ہے۔ تیلگو لوگ اس مطالبہ تامل والوں سے زیادہ

بیدار ہیں جو انگریزی کے اثر سے اس قدر مغلوب ہیں کہ ان میں تامل کو ذریعہ تعلیم بنانے کا کوئی جذبہ نہیں رہا ہے۔ تیلگو بولنے والے علاقہ میں انگریزی تعلیم اتنی آگے نہیں گئی ہے جتنی تامل والے علاقہ میں۔ اس لیے اس علاقہ کے لوگ تامل والوں سے زیادہ مادری زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ تیلگو کے لوگ نہ صرف اپنی مادری زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کے تجربے کر رہے ہیں بلکہ انھوں نے زبان کی بنیاد پر ہندوستان کی دوبارہ تقسیم کی ایک تحریک بھی اٹھائی ہے یہ تحریک ابھی تھوڑے دنوں سے شروع ہوئی ہے اور اپنی ابتدائی منزل میں ہے لیکن ان کی کوشش توجہ کے قابل ہے اور یہ ناممکن نہیں ہے کہ جلد ہی ہم اس کو عملی شکل اختیار کرتے دیکھیں۔ راہ میں دشواریاں ہیں لیکن ان کے رہنماؤں نے مجھ پر یہ اثر چھوڑا ہے کہ وہ ان دشواریوں سے عہدہ برآ ہونے کی اور ان پر غلبہ پانے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مہاراشٹر بھی وقت کے ساتھ چل رہا ہے۔ پروفیسر کارنے اور شری نائیک دونوں اس کی تائید میں ہیں۔ بہت سے نجی مدارس نے مادری زبان کا بطور ذریعہ تعلیم کے استعمال شروع کر دیا ہے۔ پروفیسر جے پور کر جنھوں نے اس سلسلہ میں اپنی کوششوں کی بدولت کافی نقصان اٹھایا ہے، اب انھوں نے پھر کام کرنا شروع کر دیا ہے اور ہم جلد ہی دیکھیں گے کہ ان کا اسکول دوبارہ قائم ہو گیا ہے۔ انھوں نے درسی کتابوں کی تیاری کا بھی ایک خاکہ تیار کیا ہے۔ ان میں سے بعض کتابیں چھپ بھی گئی ہیں دوسری طباعت کے لیے تیار ہیں۔ اس اسکول کے استادوں نے کبھی اپنے عقیدہ میں کمزوری نہیں دکھائی۔ اگر بدقسمتی سے ان کا اسکول بند نہ ہو گیا ہوتا تو اس وقت تک یہ ثابت ہو گیا ہوتا کہ آیا مرہٹی اعلیٰ تعلیم کے لیے ذریعہ کے طور پر کام دے

سکتی ہے یا نہیں؟

گجرات میں بھی یہ تحریک شروع ہو گئی ہے۔ ہم اس کے متعلق آدبی ہرگوبند داس کینٹا والا کی تحریروں سے معلوم کر سکتے ہیں۔ پروفیسر گجر اور دیوان بہادر منی بھائی جسبھائی آنجہانی اس تحریک کے رہنما کہے جا سکتے ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے کہ جو بیج ان لوگوں نے بویا ہے، اس کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے میں ہمیں مدد دینی چاہیئے یا نہیں۔ میرے خیال میں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جتنی ہی ہم دیر کریں گے، اسی قدر نقصان اٹھائیں گے۔

انگریزی ذریعہ تعلیم سے ہائی اسکول تک تعلیم پوری کرنے میں ۱۲ سے ۱۳ سال تک لگتے ہیں۔ اگر یہی مضامین مادری زبان کے ذریعہ پڑھائے جائیں تو تقریباً ۱۰ سال لگیں گے۔ یہ بہت سے تجربہ کار معلمین کی رائے ہے۔ ۲ سے ۳ سال تک کی بچت ان ہزارہا بچوں کے معاملے میں جو اسکول میں پڑھتے ہیں، قوم کے بہت بڑے وقت، روپے اور محنت کی بچت ہے۔

ایک غیر ملکی زبان کے ذریعہ تعلیم سے بچوں پر بہت زیادہ بار پڑتا ہے اور ہمارے لڑکوں کو اس کی بڑی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔ بڑی حد تک وہ کسی اور بار کے اٹھانے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں، اس لیے وہ بیکار محض ہو جاتے ہیں جو جسمانی حیثیت سے کمزور، کام کرنے کے جذبے سے عاری اور صرف مغرب کے نقال ہوتے ہیں۔ انہیں نہ تحقیق کے کاموں سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ گہرے غور و فکر سے اور نہ ان میں ہمت، استقلال، بہادری اور بے خوفی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نہ کوئی پلان بنا سکتے ہیں اور نہ اپنے مسائل حل کرنے کے لیے کوئی پروجیکٹ چلا

سکتے ہیں۔ اگر ہم بناتے بھی ہیں تو ہم ان پر عمل نہیں کر سکتے۔ جن میں کچھ آثار نظر آتے ہیں، وہ کم عمری میں اس دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ ایک انگریز نے کہیں لکھا ہے کہ یورپ کے لوگوں اور دوسرے ملکوں کے لوگوں میں وہی فرق ہے جو ایک اصل تحریر اور جاذب پر اس کے عکس میں ہوتا ہے۔ اس بیان میں جو حقیقت ہے اُسے ایشیا والوں کی کسی قدرتی یا خلقی نااہلی پر محمول نہ کرنا چاہیئے۔ اصل سبب بڑی حد تک ذریعہ تعلیم کا ہے۔ جنوبی افریقہ کے حبشی لوگوں میں ہمت، جسمانی طاقت اور کیریکٹر ہوتا ہے۔ ان میں اس قسم کی برائیاں جیسے اوائل عمر کی شادی وغیرہ نہیں ہوتی ہیں، پھر بھی ان کی حالت ہماری جیسی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کی تعلیم کا ذریعہ بھی ڈچ زبان ہے۔ ہماری طرح وہ بھی تھوڑے عرصہ میں اس زبان پر قدرت حاصل کر لیتے ہیں اور ہماری طرح وہ بھی اپنی تعلیم کے ختم پر جسمانی اور دماغی حیثیت سے کمزور ہو جاتے ہیں اور اکثر اپنے غیر ملکی آقاؤں کے محض نقال ہوتے ہیں۔ ان کے معاملہ میں بھی زندگی کی بنیادی حقیقتیں ختم ہو جاتی ہیں اس لیے کہ ان کی تعلیم بھی ایک اجنبی زبان کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ہم انگریزی تعلیم یافتہ تنہا اُس نقصانِ عظیم کا اندازہ نہیں کر سکتے جو اس وجہ سے اُٹھانا پڑتا ہے۔ ہمیں اس کی شدت کا کچھ اندازہ اُس وقت ہو سکتا ہے جب ہم یہ دیکھیں کہ ہم نے اپنے عوام کو کس قدر کم متاثر کیا ہے۔ ہمارے والدین ہماری تعلیم کے بے کار ہونے پر کبھی کبھی جو اظہار خیال کرتے ہیں، وہ اس لحاظ سے قابل غور ہے۔ ہم بوس اور رائے کے کمالات پر وجد میں آجاتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ہماری تعلیم اپنی مادری زبان کے ذریعہ ہوتی تو آج ہم میں کتنے بوس اور رائے ہوتے۔

ستم ظریفی دیر کے لیے یہ خیال نظر انداز کر دیا جائے کہ اس وقت

جاپانیوں کا نیا جذبہ اور قوت صحیح راستے پر ہے یا نہیں، ان کے کارنامے واقعتاً بہت حیرت انگیز ہیں! انہوں نے اپنی قوم کے اندر اپنی مادری زبان کے استعمال سے بیداری پیدا کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جو بات کرتے ہیں اس پر حقیقت کی مہر ہوتی ہے۔ انھوں نے اتنی عظیم الشان ترقی کر لی ہے کہ وہ اب اپنے مغربی استادوں کو پڑھا سکتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا کہ غیر یورپین قومیں محض جاذب ہوتی ہیں۔ جاپانی لوگوں کی زندگی تحقیق اور عمل کی روح سے لبریز ہے اور دنیا ان کی طرف حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ ایک غیر ملکی زبان کے ذریعہ تعلیم کا نظام ناقابل تلافی نقصان کا موجب ہوتا ہے۔

مدرسہ کو گھر کی ایک توسیع ہونا چاہیے۔ بچہ جو اثرات گھر پر قبول کرتا ہے اور جو مدرسہ میں اس پر پڑتے ہیں، ان میں تطابق ہونا چاہیے، بشرطیکہ بہترین نتائج حاصل کرنے مقصود ہوں۔ ایک اجنبی زبان کے ذریعہ تعلیم اس تطابق کو توڑ دیتی ہے جو ان میں ہونا چاہیے۔ جو لوگ اس تعلق کے توڑ دینے کے ذمہ دار ہیں، وہ دراصل قوم کے دشمن ہیں خواہ ان کی نیتیں نیک کیوں نہ ہوں۔ اس نظام تعلیم کا از خود شکار ہونا ایسا ہی ہے جیسا اپنی ماں کے فرائض کو ترک کر دینا۔ اس بدیسی نظام تعلیم سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ یہیں پر آکر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اور آگے بھی جاتا ہے۔ اس نے تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام میں ایک خلیج پیدا کر دی ہے۔ لوگ ہم کو اس طرح دیکھتے ہیں گویا ہم ان سے جدا حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ہم پر بھروسہ نہیں رکھتے، وہ ہمیں صاحب سمجھ کر ہم سے ڈرتے ہیں۔ اگر یہ صورت حال زیادہ عرصہ قائم رہی تو لارڈ کرزن کا یہ الزام صحیح ثابت ہو جائے گا کہ تعلیم یافتہ طبقہ عام لوگوں کی نمائندگی

نہیں کرتا ہے۔
خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ نیند سے جاگ گیا ہے۔ اب جبکہ وہ لوگوں سے قریب آتے جا رہے ہیں، وہ خود ان غلطیوں کو محسوس کرنے لگے ہیں، جن کا اوپر ذکر ہوا۔ ہم لوگوں تک وہ بیداری اور جوش کیسے پہنچائیں جو تعلیم یافتہ طبقہ میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس عظیم الشان کام میں انگریزی مدد نہیں دے سکتی ہے اور گجراتی کے ذریعہ کرنے کی ہمیں مشق اور مہارت نہیں ہے۔ میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ انھیں مادری زبان میں اپنے خیالات لوگوں کے سامنے رکھنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ یہی دشواری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ میکالے کا انگریزی تعلیم رائج کرنے میں جو جذبہ تھا، وہ صحیح تھا۔ وہ ایمانداری کے ساتھ ہمارے ادب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ بدقسمتی سے جس مرض میں وہ مبتلا تھا، وہ ہم میں بھی پیدا ہو گیا ہے اور ہم بھی اپنے ادب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہم نے اس باب میں اپنے انگریز آقاؤں کو بھی بہت پیچھے ڈال دیا ہے۔ میکالے چاہتا تھا کہ ہم عوام میں مغربی تہذیب پھیلانے کا ذریعہ بن جائیں۔ اس کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم ہم میں پختہ کیریکٹر پیدا کرے گی اور پھر ہم میں سے بعض لوگ عوام میں نئے خیالات پیدا کریں گے۔ ہمیں صرف ذریعہ تعلیم کے سوال پر غور کرنا ہے۔ ہم نے انگریزی تعلیم میں پیسہ پیدا کرنے کا موقع دیکھا اور اس لیے اس کے استعمال کو ہم نے اس قدر اہمیت دی۔ بعض لوگوں میں اس تعلیم نے بے شک مادر وطن کے ساتھ محبت کا جذبہ پیدا کیا۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی اصل خیال کی ثانوی حیثیت رہی اور انگریزی تعلیم میکالے کے اصل ارادے سے کہیں آگے جا پڑی۔ اس نے ہم سب کو بڑا نقصان پہنچایا۔
اگر ہمارے ہاتھ میں حکومت کی قوت ہوتی تو ہم نے اس نقصان کو جلدی

روک لیا ہوتا اور مادری زبان کو نظر انداز کیا ہوتا جیسا کہ اب کیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ لیکن سرکاری حکام نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔ بہت سے لوگ شاید نہیں جانتے ہیں کہ ہماری عدالتوں کی زبان گجراتی سمجھی جاتی ہے حکومت قوانین بھی گجراتی میں بناتی ہے۔ درباروں میں جو تقریریں ہوتی ہیں وہ انگریزی میں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ان کا گجراتی میں ترجمہ ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ نوٹوں میں انگریزی کے ساتھ گجراتی بھی ہوتی ہے۔ ریاضی کے پیمانے جو آراضیات کے سروے کرنے والوں کو یاد کرنا پڑتا ہے، مشکل ہوتے ہیں۔ اگر یہ کام انگریزی میں ہوتا تو مال کے محکمہ کا کام بہت مہنگا پڑتا۔ چنانچہ انھوں نے سروے کرنے والوں کے لیے گجراتی اصطلاحیں بنائیں۔ یہ اصطلاحیں دیکھ کر ہمیں حیرت ہوگی اور خوشی بھی۔ اگر ہمیں اپنی زبان سے سچی محبت ہو تو ہم ان ذرائع کو کام میں لا سکتے ہیں۔ اگر وکلا گجراتی میں کام کرنے لگیں تو موکلوں کا بہت سا پیسہ بچ جائے۔ موکلوں کو بھی قانون کی ضروری واقفیت ہو جائے اور وہ اپنے حقوق جاننے لگیں۔ اس سے ان کا وہ خرچ بھی بچ جائے جو انھیں ترجمہ کے کاموں پر دینا پڑتا ہے۔ قانونی اصطلاحیں عام طور پر استعمال ہونے لگیں گی اور اس طرح ہماری زبان کے الفاظ کا ذخیرہ بڑھ جائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کام میں وکلا کو کچھ کوشش کرنی ہوگی۔ میرا خیال ہے۔ اور یہ خیال تجربہ پر مبنی ہے کہ اس سے موکلوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا بلکہ آگے چل کر فائدہ ہی ہوگا۔ اس میں اس خیال کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو بحثیں گجراتی میں ہوں گی، ان کا عدالتوں پر انگریزی کی بہ نسبت کم اثر ہوگا۔ کلکٹروں اور سرکاری افسروں کے لیے گجراتی جاننا لازمی ہے۔ لیکن ہم کو انگریزی کا جو بے وجہ خبط ہے، اس سے وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انگریزی پڑھنے اور اسے روپیہ کمانے کے لیے استعمال کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے، خاص کر اس وجہ سے کہ اس نے ہمارے ہم وطنوں میں حب وطن کا جذبہ بھی پیدا کیا ہے۔ لیکن یہ خیال اس بات کی دلیل کے طور پر نہیں پیش کیا جا سکتا ہے کہ انگریزی زبان کو بہ طور ذریعہ تعلیم کے بھی استعمال کیا جائے۔ اگر کوئی شخص روپیہ کمانے یا ملک کی بھلائی کے لیے انگریزی سیکھتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس سے انگریزی کے بہ طور ذریعہ تعلیم استعمال کئے جانے کی ضرورت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے انھی دونوں خیالات کی وجہ سے انگریزی بہ طور ایک ذریعہ تعلیم کے مسلّم ہو گئی ہے۔ بعض لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف انگریزی داں ہی محب وطن ہوئے ہیں۔ لیکن گزشتہ چند مہینوں سے ہم کچھ اور ہی دیکھ رہے ہیں۔ پھر بھی ہم یہ دعویٰ اس ترمیم کے ساتھ تسلیم کر سکتے ہیں کہ دوسروں کو وہ مواقع کبھی نہیں ملے جو انگریزی داں لوگوں کو حاصل ہوئے ہیں۔ جو حب وطن انگریزی جاننے کی وجہ سے پیدا ہوا، وہ بہت پھیلا نہیں۔ حقیقی حب وطن ایک ایسی قوت ہے جو ہمیشہ پھیلتی رہتی ہے۔ جو حب وطن انگریزی جاننے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، اس میں یہ تاثیر نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ دلیلیں خواہ کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں، لیکن وہ آج قابل عمل نہیں ہیں۔ یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ دوسرے مضامین کی تعلیم کو انگریزی کی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اور یہ بھی بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس کی مہارت حاصل کرنے میں ہماری دماغی قوت کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ لیکن میری ناقص رائے یہ ہے کہ انگریزی کے معاملے میں ہماری جو حالت ہے، اس میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم

موجودہ انتظام کو قبول کرلیں اور پھر کوئی راستہ نکالیں۔ یہ رائے کسی معمولی اہل قلم کی نہیں ہے بلکہ گجرات کے ممتاز ترین فاضل اور ہماری مادری زبان کے ایک بڑے محب کی ہے۔ ہم آچاریہ دھرو جیسے مشہور شخص کی رائے کو نظر انداز نہیں کرسکتے ہیں۔ بہت کم لوگ ان کے برابر تجربہ کا دعوےٰ کرسکتے ہیں۔ انھوں نے تعلیم کی اور ایک اچھے ادب کی ضرورت کے لیے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ انھیں مشورہ دینے اور نکتہ چینی کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ ایسی صورت میں مجھے اپنی جداگانہ رائے ظاہر کرنے سے پیشتر دوبارہ غور کرنا پڑے گا۔ شری آنند شنکر بھائی نے انگریزی کے حامیوں کی جو رائے ہے اسے نہایت میٹھے لفظوں میں ظاہر کیا ہے۔ اس لحاظ سے اس نقطہ نظر پر غور کرنا ہمارا فرض ہے۔ علاوہ اس کے میری حیثیت اس معاملہ میں کچھ عجیب سی ہے۔ میں ان کی نگرانی اور رہنمائی میں قومی تعلیم کا ایک تجربہ چلا رہا ہوں۔ اس تجربہ میں ہم مادری زبان بطور ذریعہ تعلیم کے استعمال کررہے ہیں۔ ایسے قریبی تعلقات کے ہوتے ہوئے مجھے ان کے خیالات پر نکتہ چینی کرنے میں قدرتاً تامل ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے آچاریہ دھرو کو انگریزی کے ذریعہ اور مادری زبان کے ذریعہ دونوں طرح سے تعلیم دینے کا ذاتی تجربہ ہے اور انہوں نے اب تک ایک کو دوسرے پر ترجیح کے بارے میں کوئی آخری اور متعین رائے ظاہر نہیں کی ہے اس لیے میں اپنا اختلاف ظاہر کرنے میں اس قدر تامل محسوس نہیں کرتا جتنا کہ میں دوسری صورت میں کرتا۔

ہم انگریزی کے بارے میں اپنی حیثیت پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس کانفرنس میں ایسے لوگ آزادی کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث نہیں کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ ان کے لیے بھی جو سیاسی معاملات میں حصہ

نہیں لے سکتے ہیں، سوچنا اور کہنا نامناسب نہیں ہے کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں ہمارے ملک کے لیے موجب برکت ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی اس کے قیام کی بنیاد نہیں ہو سکتی ہے۔ برطانوی حکمراں خود تسلیم کرتے ہیں کہ ایک قوم کے لیے دوسری قوم پر حکومت کرنا غلط ہے۔ یہ دونوں کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہ اصول ایسے تمام لوگ جو دوسروں کی بہبود سے تعلق رکھتے ہیں، تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے اگر یہ بات حاکم اور محکوم دونوں پر ثابت ہو جائے کہ انگریزی بطور ذریعہ تعلیم لوگوں کی دماغی قوت کو نقصان پہنچاتی ہے، پھر ذریعہ تعلیم بدلنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔ اور اس وقت قابل تعریف بات یہ ہوگی کہ اس مقصد کے حاصل کرنے میں جو رکاوٹیں مانع ہیں وہ دور کی جائیں اگر یہ مقصد تسلیم کر لیا جائے تو آچاریہ دھرو جیسے لوگوں کو قابل کرنے کے لیے مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہوگی، جو موجودہ نظام تعلیم میں دماغی قوت کے بے جا ضائع ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ نظام تعلیم جو برطانوی طرز پر مبنی ہے اور جس میں انگریزی بطور ذریعہ تعلیم کے استعمال کی جاتی ہے۔

میں اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ آیا مادری زبان کے ذریعہ تعلیم اختیار کرنے سے انگریزی کی تعلیم پر کوئی ناگوار اثر پڑے گا یا نہیں۔ تمام تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے لیے اس اجنبی زبان پر قدرت حاصل کرنی ضروری نہیں ہے نہ صرف یہ بلکہ میں تو یہاں تک تسلیم کرتا ہوں کہ اس کا شوق پیدا کرنا اور حوصلہ افزائی بھی غیر ضروری ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کچھ ہندوستانیوں کو انگریزی سیکھنی ضروری ہوگی۔ آچاریہ دھرو نے اس مسئلہ پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑے ماہر تعلیم کی حیثیت سے غور کیا ہے لیکن اگر ہم تمام نقطہ نظر سے اس پر غور کریں تو ہم نتیجہ یہ نکالیں گے کہ صرف دو طبقے

کہ لوگوں کو انگریزی سیکھنے کی ضرورت ہوگی :۔

۔ ایک طبقہ تو ایسے لوگوں کا ہوگا جنھیں اپنے ملک سے محبت ہے اور جنھیں مزید برآں زبانوں کا خاص ذوق ہے، جن کے پاس وقت ہے اور جو انگریزی ادب کا مطالعہ اس غرض سے کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے علم کا حاصل اپنی قوم کے سامنے پیش کر سکیں یا اسے حکمرانوں کے ساتھ تعلقات کے بہتر کرنے میں استعمال کر سکیں۔

دوسرے وہ لوگ جو اپنی انگریزی کی واقفیت کو سرکاری یا دوسری بڑی تنخواہوں کی ملازمتوں کے حاصل کرنے میں استعمال کر سکیں۔

ان دونوں طبقوں کے لیے انگریزی کی اچھی تعلیم دینے میں یعنی انگریزی بطور ایک اختیاری مضمون کے ہو، کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ہم اس کے لیے ضروری سہولتیں بھی مہیا کر سکتے ہیں۔ لیکن ذریعہ تعلیم مادری زبان ہی ہونا چاہیے۔ آچاریہ دھرو کو اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے انگریزی کو بطور ذریعے کے اختیار نہ کیا اور صرف ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت سے سیکھا تو اس سے انگریزی کا معیار فارسی اور سنسکرت وغیرہ کی طرح بہت نیچا ہوگا۔ میں آچاریہ دھرو کی خدمت میں با ادب عرض کروں گا کہ یہ ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ بہت سے انگریز ہیں جو نہایت اچھی فرانسیسی جانتے ہیں اور اپنے کاموں کے لیے اسے اچھی طرح استعمال کر سکتے ہیں، اگرچہ انھوں نے اپنی تعلیم انگریزی میں پائی ہے۔ ہندوستان میں بھی بہت سے ہندوستانی ہیں جن کی فرانسیسی کی استعداد اچھی خاصی ہے، اگرچہ انہوں نے یہ زبان انگریزی کے ذریعے حاصل کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب انگریزی دوسرے درجے پر کر دی جائے گی اور مادری زبان کو تعلیمی نظام میں اپنا صحیح مقام مل جائے گا تو ہمارے دماغ جو اس وقت غیر ضروری باتوں

کی وجہ سے زیر بار ہیں، وہ زیادہ ضروری علوم حاصل کرنے کے لیے آزاد ہو جائیں گے۔ انگریزی سیکھنا بھی ہمارے لیے کچھ بہت دشوار نہ ہوگا۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ ایسی صورت میں ہم جو انگریزی حاصل کریں گے وہ اس سے بہتر ہوگی اور اس بنا پر ہمارے لیے زیادہ قابل تعریف ہوگا، بہ نسبت اس کے کہ اس وقت جو ہماری موجودہ حالت ہے۔ اور اس سے زیادہ یہ کہ ہمارا ذہن چونکہ اُس وقت زیادہ قوی اور تازہ ہوگا، ہم اس سے اور زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔ غرض نفع و نقصان کے عام نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مادری زبان کے استعمال کا فیصلہ ہماری مطلوبہ ترقی کا موجب ہوگا۔

جب ہم اپنی زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتے ہیں تو ہمارے اپنے لوگوں سے تعلقات کی نوعیت جدا حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ آج ہم اپنی بیویوں کو اپنا صحیح رفیقۂ حیات نہیں بنا سکتے ہیں۔ انھیں اس کا بہت کم علم ہوتا ہے جو کچھ ہم باہر کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے والدین کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ ہم اسکولوں میں کیا پڑھتے ہیں لیکن اگر ہماری تعلیم مادری زبان میں ہونے لگے تو ہم جو کچھ اسکول میں پڑھتے ہیں نہایت آسانی سے اپنے نوکروں یعنی دھوبی، نائی، بھنگی وغیرہ تک پہنچا سکتے ہیں اور اس طرح انھیں بھی تعلیم دے سکتے ہیں۔ انگلستان میں ہم اپنے نائی سے بھی جس وقت ہم اپنے بال منڈاتے ہیں، سیاسی مسائل پر گفتگو کر سکتے ہیں۔ یہاں اپنے گھر کے لوگوں سے بھی ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ وجہ نہیں کہ وہ جاہل ہوتے ہیں۔ وہ بھی بہت سی باتیں جانتے ہیں جو غالباً ہم سے مختلف ہوتی ہیں۔ ہم ان سے مہا بھارت، رامائن، اور مقدس مقامات کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، اس

لیے کہ یہ لوگ انہی باتوں کے بارے میں زیادہ سنتے اور جانتے ہیں۔ لیکن جو علم ہم اسکول میں حاصل کرتے ہیں، وہ دوسروں تک بلکہ اپنے خاندان کے لوگوں تک بھی نہیں پہنچتا ہے، اس لیے کہ ہم جو کچھ انگریزی میں پڑھتے ہیں، وہ ان لوگوں کو نہیں بتا سکتے ہیں۔

اس وقت ہماری قانون ساز مجلسوں میں تمام کام انگریزی کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہی حال دوسرے محکموں میں بھی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سا علم جو لوگ نہایت آسانی سے حاصل کر سکتے تھے، ضائع جاتا ہے، اس بخیل کی دولت کی طرح جو زمین میں گڑی رہتی ہے۔ یہی ہماری عدالتوں میں بھی ہوتا ہے۔ جج صاحبان جب مقدمات ان کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو اچھی اچھی باتیں اور مفید مشورے دیتے ہیں۔ لوگ جو عدالتوں میں جاتے ہیں، وہ اس کے جاننے کے مشتاق ہوتے ہیں، لیکن چونکہ تمام کارروائیاں انگریزی میں ہوتی ہیں اس لیے انھیں آخر میں سوائے نرے فیصلوں کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ یہی حال ڈاکٹروں کا بھی ہے جو اپنے مریضوں کو مناسب ہدایتیں اور ضروری معلومات نہیں دے سکتے ہیں اس لیے کہ انھوں نے اپنا علم انگریزی کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔ وہ جسم کے حصے بھی گجراتی میں نہیں جانتے۔ اس لیے ان کا مشکل سے اپنے مریضوں سے کوئی تعلق ہو پاتا ہے اور وہ صرف نسخے لکھ دیتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی جہالت کی وجہ سے بارش کے پانی اور پہاڑ سے چمکتے بہتے چشموں سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم لاکھوں روپے کا قیمتی کھاد پیدا کرتے ہیں لیکن چونکہ ہم یہ نہیں جانتے کہ اس کا صحیح استعمال کیسے ہونا چاہیے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے مختلف قسم کی بیماریوں کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں جن سے ہماری آبادی

کا ایک بڑا حصہ بیماری اور موت کی نذر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم انگریزی کے بارے ایسا دیے ہوئے ہیں اور دوراندیشی کی کمی سے ہم اپنے ملک تو لوگوں نہیں دے سکتے ہیں جس کے وہ مستحق ہیں۔ یہ کوئی مبالغہ سے نہیں کہا جا رہا ہے۔ اس سے صرف اس مسئلہ پر میرے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ میں آپ کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اگر اپنی مادری زبان کے ساتھ یہی بے توجہی رکھی تو ہمیں اس کی بڑی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ ہم اب بھی کافی نقصان اٹھا چکے ہیں۔ میں تعلیم یافتہ طبقہ کا اولین فرض سمجھتا ہوں کہ وہ اس سلسلہ میں ہمارے عوام کو مزید نقصان سے بچائیں

گجراتی ایک بڑی زبان ہے جو اپنا ایک شاندار ماضی اور اس سے زیادہ روشن مستقبل رکھتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑے بزرگ نرسنگھ مہتا کی زبان ہے۔ اس کو بہت سے بڑے بڑے مصنفین نے جو یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے، مالا مال کیا ہے۔ نند شنکر نے اپنا ناول "کرن گھیلو" گجراتی ہی میں لکھا گوفارون رام، نند شنکر، منی لال، مالاباری وغیرہ نے اسی زبان میں لکھا ہے اور اس کے ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ شاعر راجہ چندر نے اپنی رس بھری تعلیمات اسی زبان میں پیش کی ہیں۔ اس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور پارسیوں کی بڑی بڑی جماعتیں ہیں جو اس کی حمایت میں ہیں۔ سنت، سادھوؤں نے اسے تقدس بخشا ہے۔ اس کے بولنے والوں میں سرمایہ دار، تاجر اور وہ بیوپار کرنے والے ہیں جو سمندر پار دُور دُور کے ملکوں تک جاتے ہیں۔ یہ وہ زبان ہے جس میں کاٹھیاواڑ کی پہاڑیوں کے مولو مانک اور جودھا مانک کی شجاعت اور بہادری کے کارنامے، قصوں اور گانوں کی شکل میں پلے ہوئے جاتے ہیں۔ اس زبان کی وسعت کی کوئی حد نہیں۔ گجراتی لوگوں سے ایک شخص

اور کیا اُمید کر سکتا ہے اگر وہ ایسی حسین زبان کو اپنا ذریعہ تعلیم نہیں بناتے ہیں! افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمیں آج اس کا موزوں ہونا ثابت کرنے کی ضرورت پڑ رہی ہے۔

سب سے آخر میں اس بحث کو ختم کرتے ہوئے میں آپ کی توجہ ان مضامین کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو ڈاکٹر پربھجیون داس مہتا نے اس موضوع پر لکھے ہیں۔ ان مضامین کا گجراتی میں ترجمہ چھپ گیا ہے اور میں ان کے مطالعہ کی پُرزور سفارش کروں گا۔ آپ ان مضامین میں ان خیالات کے متعلق جو اوپر ظاہر کیے گئے ہیں، بہت سی زائد دلیلیں پائیں گے۔

غرض اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مادری زبان کو بطور ذریعہ تعلیم کے اختیار کرنا بہتر ہے تو دوسرا قدم یہ سوچنا ہے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ بغیر بحث میں پڑے ہوئے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ تدبیریں کیا ہونی چاہئیں۔ میں انھیں ایک ایک کرکے پیش کر رہا ہوں جس طرح وہ میرے ذہن میں آتی جا رہی ہیں:۔

۱۔ انگریزی داں گجراتیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اپنے کاروبار میں انگریزی کا استعمال بند کر دینا چاہیے۔

۲۔ جو لوگ انگریزی اور گجراتی دونوں زبانوں کی اچھی استعداد رکھتے ہیں، انھیں انگریزی سے گجراتی میں اچھی اچھی کتابوں اور خیالات کا ترجمہ کرنا چاہیے اور انھیں لوگوں تک پہنچانا چاہیے۔

۳۔ تجربہ کار ماہرین تعلیم کی انجمنوں کو اچھی اچھی درسی کتابیں گجراتی میں تیار کرا کے شائع کرنی چاہئیں۔

۴۔ ہم میں جو لوگ صاحب دولت ہیں، انھیں مختلف مقامات پر

اسکول کھولنے چاہئیں، جو گجراتی کے ذریعہ تعلیم دیتے ہوں۔

۵۔ اس کے علاوہ کانفرنسوں اور تعلیمی انجمنوں کو حکومت پر زور ڈالنا چاہیئے کہ وہ ذریعہ تعلیم کے لیے ہماری مادری زبان اختیار کرے۔ عدالتوں اور قانون ساز مجلسوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی تمام کارروائیاں گجراتی میں کریں اور لوگوں کو بھی اپنے کاموں میں گجراتی کا استعمال کرنا چاہیئے۔ عام دستور یہ ہے کہ اچھی اچھی جگہوں کے لیے صرف ایسے لوگ لیے جاتے ہیں، جو انگریزی جانتے ہیں۔ یہ دستور بدل جانا چاہیئے اور امیدوار اپنی قابلیت کے لحاظ سے منتخب ہونے چاہئیں، بلا لحاظ اس کے کہ وہ انگریزی جانتے ہیں یا نہیں۔ حکومت سے بھی درخواست کرنی چاہیئے کہ وہ ایسے اسکول کھولے جہاں سرکاری ملازمین گجراتی کی ضروری استعداد حاصل کر سکیں۔

جو پروگرام اوپر دیا گیا ہے، اس میں استثنا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ کہا جائے گا کہ مجلس قانون ساز میں مرہٹی، سندھی اور گجراتی ممبران ہیں، اور آگے چل کر کسی وقت میں کرناٹک کے ممبر بھی ہو سکتے ہیں۔ اس عذر کی یقیناً حقیقت ہے لیکن اس کا حل بھی ہو سکتا ہے۔ تیلگو بولنے والوں نے یہ سوال اٹھایا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک دن زبانوں کی بنیاد پر صوبوں کی دوبارہ تقسیم کرنی ہوگی۔ لیکن اس عرصہ میں اسمبلی کے ممبران کو یا تو ہندی میں یا اپنی مادری زبان میں بولنے کا حق ہوگا۔ اگر آج آپ کو یہ خیال مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، تو میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ شروع شروع میں تمام انقلابی خیالات ایسے ہی مضحکہ خیز نظر آتے ہیں۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ ہمارے ملک کی ترقی بڑی حد تک ذریعہ تعلیم کے مسئلے کے صحیح فیصلہ پر منحصر ہے۔ اس لیے مجھے اپنی اس تجویز میں بڑی اہمیت دکھائی

دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب اس طرح مادری زبان کی عزت کی جائیگی اور اس کو ایک سرکاری زبان کا درجہ دیدیا جائیگا تو اس سے ان قوتوں اور صلاحیتوں کو تقویت ہوگی جن سے ہم اس وقت واقف بھی نہیں ہیں۔

قومی زبان کا مسئلہ

آیئے اب قومی زبان کے مسئلہ پر غور کریں۔ اگر انگریزی کو ہماری قومی زبان بننا ہے تو اسے ہمارے اسکولوں میں ایک لازمی مضمون ہونا چاہیے۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ آیا انگریزی ہماری قومی زبان ہو بھی سکتی ہے۔ ہمارے بعض لائق اشخاص جو اچھے محب وطن بھی ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس سوال کا اٹھانا بھی ہماری جہالت کا ایک ثبوت ہے۔ ان کی رائے میں اس کا آج بھی یہی درجہ ہے۔ ہزایکسیلینسی وائسرائے نے اپنی حال کی تقریر میں صرف یہ امید ظاہر کی ہے کہ وہ یہ درجہ اختیار کرلے گی۔ لیکن وہ اپنے اس جوش میں یہاں تک نہیں پہنچے ہیں کہ یہ کہتے کہ یہ ہماری قومی زبان ہو گئی ہے اور اب اس کے متعلق کسی سوال کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ بہرحال وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی روز بروز ملک میں بڑھیگی ہمارے گھروں میں داخل ہوگی اور آخر میں قومی زبان کے بلند مرتبہ تک پہنچ جائے گی۔ سرسری طور پر دیکھا جائے تو یہ رائے بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اگر ہم اپنی آبادی کے تعلیم یافتہ طبقہ کو لیں تو ایک شخص یہ اثر لے سکتا ہے کہ انگریزی کے نہ ہونے کی صورت میں ہمارا تمام کاروبار بند ہو جائے گا۔ لیکن مزید غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انگریزی نہ ہماری قومی زبان ہو سکتی ہے اور نہ اسے ہونا چاہیے۔

آیئے دیکھیں کہ ایک قومی زبان کی کیا شرائط ہونی چاہئیں :-

۱۔ اس کا سیکھنا سرکاری عمال کے لیے آسان ہونا چاہیئے۔
۲۔ اسے تمام ہندوستان میں مذہبی، معاشی اور سیاسی معاملات کا ایک ذریعہ ہونا چاہیئے۔
۳۔ یہ ہندوستان کے باشندوں کی اکثریت کی زبان ہونی چاہیئے۔
۴۔ ہر شخص کو اس کا سیکھنا آسان ہونا چاہیئے
۵۔ ایسی زبان کے انتخاب میں عارضی اور وقتی مفاد کا خیال سامنے نہ ہونا چاہیئے۔

انگریزی ان شرائط میں سے کوئی بھی پورا نہیں کرتی ہے۔
پہلی شرط کو سب سے آخر میں آنا چاہیئے۔ لیکن میں نے عمداً ترتیب الٹ دی ہے، اس لیے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی گویا اسے پورا کر رہی ہے۔ مزید غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ آج بھی عمال کے لیے اس کا سیکھنا اور برتنا آسان نہیں ہے جس دستور کے مطابق ہم پر حکومت کی جا رہی ہے، اس میں یہ لکھا ہے کہ برطانوی عمال کی تعداد تدریجاً کم ہوتی جائیگی۔ یہاں تک کہ آخر میں صرف وائسرائے اور چند افسران باقی رہ جائیں گے۔ آج بھی سرکاری عمارتوں میں اکثر ملازمین ہندوستانی ہیں اور ان کی تعداد آگے بڑھتی ہی جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کریگا کہ ان کے لیے انگریزی کا سیکھنا کسی اور زبان سے زیادہ مشکل ہے۔
جہاں تک دوسری شرط کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ انگریزی کے ذریعہ مذہبی معاملات بالکل ناممکن ہیں۔ جب تک کہ تمام ملک کے لوگ انگریزی بولنے نہ لگ جائیں، انگریزی کا اس حد تک عوام میں پھیل جانا

ظاہر ہے کہ ناممکن ہے۔

تیسری شرط انگریزی پوری نہیں کر سکتی ہے، اس لیے کہ ہندوستان میں اکثریت اس زبان کو نہیں بولتی ہے۔

چوتھی بھی انگریزی سے نہیں پوری ہوتی ہے، اس لیے کہ ہمارے ملک میں تمام لوگوں کے لیے اس زبان کا سیکھنا آسان نہیں ہے۔

پانچویں شرط پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انگریزی جو حیثیت آج اختیار کیے ہوئے ہے، وہ عارضی ہے۔ جو واقعہ ہے وہ یہ کہ مستقبل کے ہندوستان میں قومی معاملات میں انگریزی کی ضرورت اگر ہوگی تو بہت کم ہوگی۔ اس کی ضرورت یقیناً سلطنت برطانیہ کے ساتھ معاملات رکھنے میں ہوگی اور سلطنت کے اندر مختلف ممالک کے درمیان سفارتی زبان ہوگی۔ انگریزی کی ضرورت صرف ان اغراض کے لیے ہوگی۔ ہم انگریزی سے نفرت نہیں کرتے ہیں۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں، وہ یہ کہ وہ اپنے مناسب حدود سے باہر نہ جائے اور چونکہ انگریزی سلطنت برطانیہ کی زبان باقی رہے گی، ہم اپنے ماوی، اپنے شاستری اور اپنے بنرجی کو اس کے سیکھنے پر مجبور کریں گے اور ان سے امید رکھیں گے کہ وہ جہاں کہیں بھی جائیں گے، ہمارے ملک کی شان و شوکت کو بڑھائیں گے۔ لیکن انگریزی ہندوستان کی قومی زبان نہیں بن سکتی ہے۔ اسے یہ درجہ دینے کے یہ معنی ہوں گے کہ گویا ہم اپنے ملک میں اسپرینٹو کو رواج دے رہے تھے۔ یہ خیال کرنا کہ انگریزی ہماری قومی زبان ہو سکتی ہے، ہماری کمزوری کی دلیل ہے اور ہماری جہالت کا ثبوت ہے۔

ہندی اُردو کا مسئلہ

پھر کون سی زبان ہے جو اوپر دی ہوئی سب شرطیں پوری کرتی ہے —
ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ 'ہندی' ہے۔ میں ہندی اُس زبان کو کہتا ہوں
جسے شمال میں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں اور جو یا تو دیوناگری رسم خط میں لکھی
جاتی ہے یا اُردو رسم خط میں۔ بعض لوگوں کو میری اس تعریف پر اعتراض ہے
وہ کہتے ہیں کہ ہندی اور اُردو دو مختلف زبانیں ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ہندو
اور مسلمان دونوں شمالی ہند میں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ جو فرق ہے، وہ
صرف تعلیم یافتہ لوگوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تعلیم یافتہ ہندو اپنی ہندی میں اس
قدر سنسکرت کے الفاظ بھر دیتے ہیں کہ مسلمان اسے سمجھ نہیں سکتے۔ اسی طرح
لکھنؤ کے مسلمان اپنی اُردو میں فارسی کے الفاظ اس قدر لے آتے ہیں کہ وہ
ہندوؤں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ عوام کے لیے یہ دونوں زبانیں پرائی ہیں، اس
لیے ان کے لیے بے کار ہے۔ میں شمالی ہند میں رہا ہوں اور ہندو اور مسلمانوں
دونوں کے ساتھ نہایت آزادی سے ملتا جلتا رہا ہوں، لیکن میں نے ان کے
ساتھ اس زبان کے ذریعہ بات چیت کرنے میں کبھی کوئی دشواری محسوس
نہیں کی ہے۔ اس لیے خواہ آپ اسے ہندی کہیں یا اُردو، لیکن جو زبان شمالی
ہند میں لوگ بولتے ہیں، وہ بنیادی طور سے ایک ہی چیز ہے۔ اسے اُردو رسم
خط میں لکھیے تو اسے اُردو کہہ لیجیے اور اسے ہندی رسم خط میں لکھئے تو اسے
ہندی کہہ لیجیے۔

اب سوال رسم خط کا رہ جاتا ہے۔ اس وقت مسلمان یقیناً اُردو رسم خط

استعمال کریں گے اور بہت سے ہندو دیوناگری رسم خط استعمال کرتے ہیں۔ میں "بہت سے" کہتا ہوں اس لیے کہ ہزارہا ہندو آج بھی اُردو رسم خط میں لکھتے ہیں اور بعض تو ناگری رسم خط جانتے بھی نہیں۔ آخر میں جب دونوں جماعتوں کے درمیان بے اعتمادی کے تمام اسباب دور ہو جائیں گے تو جس رسم خط کا دائرہ سب سے زیادہ وسیع ہوگا اور جو زیادہ مقبول ہوگا، وہی زیادہ استعمال میں آئے گا اور اس طرح قومی رسم خط بن جائے گا۔ اس عرصہ میں ہندو اور مسلمان جو اپنی عرضیاں اُردو رسم خط میں لکھنا چاہیں وہ لکھ سکتے ہیں اور یہ تمام سرکاری دفتروں میں قبول کی جائیں گی۔

اوپر دی ہوئی پانچوں شرطوں کو پورا کرنے میں 'ہندی' کے سوا کوئی اور زبان مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ ہندی کے بعد بنگالی کا نمبر آتا ہے۔ لیکن خود بنگالی بھی بنگال سے باہر ہندی کا استعمال کرتے ہیں۔ ہندی بولنے والا جہاں کہیں جاتا ہے، ہندی ہی بولتا ہے۔ ہندی بولنے والا ہندو پرچارک اور اُردو بولنے والا اسلامی مبلغ دونوں اپنی اپنی تقریریں ہندوستان بھر میں ہندی اور اُردو ہی میں کرتے ہیں اور ان پڑھ عوام بھی انہیں سمجھ لیتے ہیں۔ ایک بے پڑھا لکھا گجراتی بھی جب وہ شمال میں جاتا ہے تو وہ چند ہندی ہی کے لفظ بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن شمال کا رہنے والا بھیّا، جو بمبئی کے سیٹھ کے ہاں دربانی کرتا ہے، وہ گجراتی نہیں بولتا اور یہ سیٹھ اس کا مالک ہی ہے، جو ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بات کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے دور جنوبی صوبوں میں بھی لوگوں کو ہندی بولتے سنا ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ مدراس میں انگریزی کے بغیر چارہ نہیں۔ میں برابر اپنے تمام کاموں کے لیے ہندی کا استعمال کرتا رہا ہوں۔ ریلوں

میں میں نے مدراسی مسافروں کو دوسرے مسافروں سے ہندی میں باتیں
کرتے سنا ہے۔ اس کے علاوہ مدراس کے مسلمان بھی اتنی ہندی جانتے
ہیں کہ وہ اس کا کافی استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے
کہ مسلمان تمام ہندوستان میں اُردو بولتے ہیں اور وہ ہر صوبہ میں بڑی
تعداد میں ملتے ہیں۔

ہندی اب ہندوستان کی قومی زبان بن گئی ہے۔ ہم اسکا استعمال
اس حیثیت سے ایک عرصہ سے کر رہے ہیں۔ اُردو کا جنم بھی اسی سے ہوا ہے
مسلمان بادشاہ فارسی یا عربی کو قومی زبان نہیں بنا سکتے تھے انھوں
نے ہندی کی طرف نحو اختیار کی لیکن وہ اپنی روزمرہ میں فارسی کے الفاظ
استعمال کرتے رہے اور لکھنے کے لیے اُردو کا رسم خط اختیار کیا۔ انھوں
نے دیکھا کہ عوام کے ساتھ وہ سماجی اور کاروباری معاملات غیر ملکی زبان
کے ذریعہ نہیں کر سکتے ہیں۔ یہی حال انگریزی حکمرانوں کا بھی ہے۔ جن لوگوں
کو اس بات کا کچھ بھی علم ہے کہ فوج میں سپاہیوں سے کس طرح تعلق رکھا جا
سکتا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس غرض کے لیے ہندی یا اُردو اصطلاحوں کی
ضرورت ہوتی ہے جنھیں انھوں نے قبول کر لیا ہے اور انگریزی میں شامل
کر لیا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صرف ہندی ہی ہماری قومی زبان ہو سکتی ہے۔
اس میں شبہ نہیں کہ اس میں مدراس کے تعلیم یافتہ طبقوں کے لیے کچھ دشواریاں
ہوتی ہیں۔ لیکن مہاراشٹری، گجراتی، سندھی اور بنگالی لوگوں کے لیے یہ بہت
آسان ہونا چاہیے۔ چند مہینوں میں وہ اتنی ہندی جان سکتے ہیں کہ وہ قومی
اغراض کے لیے اس کا استعمال کر سکیں۔ تامل والوں کے لیے یہ اتنا آسان

نہیں ہے۔ تامل اور جنوب کی دوسری زبانیں دراوڑی زبانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی زبان کی ساخت اور صرف و نحو سنسکرت سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں اگر کوئی چیز مشترک ہے تو وہ سنسکرت کے الفاظ ہیں لیکن ہندی کا سیکھنا صرف موجودہ تعلیم یافتہ طبقوں تک محدود ہے۔ ہم ان کے جذبہ حب وطن سے یہ اپیل کر سکتے ہیں کہ وہ ہندی سیکھنے کی خاص کوشش کریں۔ اگر ہندی اپنے پورے مقام کو پہنچتی ہے، تو پھر یہ مدراس کے تمام اسکولوں میں پڑھائی جائے گی اور مدراس اس قابل ہوگا کہ وہ دوسرے صوبوں کے ساتھ اپنا تعلق بڑھا سکے۔ انگریزی عوام تک نہیں پہنچ سکی ہے لیکن ہندی فوراً پہنچ جائے گی۔ تیلگو لوگوں نے اس طرف قدم بڑھانا شروع کر دیا ہے۔ اگر یہ کانفرنس اس مسئلہ میں کہ کون زبان ہماری قومی زبان بننے کے قابل ہے، کسی فیصلہ پر پہنچ سکتی ہے، تو پھر ہم اس فیصلہ کی تعمیل کے لیے مناسب تدبیریں اختیار کر سکتے ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی اگر پچھلے تو جو طریقہ مادری زبان کو ترقی دینے کا تجویز کیا گیا ہے، وہی مناسب ترمیم و تنسیخ کے بعد قومی زبان کی ترقی کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ گجراتی کو اس صوبہ کے اندر ذریعہ تعلیم بنانے کی ذمہ داری تمام تر ہمیں اٹھانی ہوگی، لیکن قومی زبان کو مقبول بنانے کی تحریک میں پورے ملک کو کام کرنا ہوگا۔

موجودہ نظام تعلیم کے نقائص

ہم نے اب تک ذریعہ تعلیم اور قومی تعلیم کے مسئلہ سے بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہماری تعلیم میں انگریزی کا کیا مقام ہوگا۔ اب ہمیں اس پر

غور کرنا ہے کہ ہمارے اس نظام تعلیم میں جو آج کل ہمارے اسکولوں میں رائج ہے کیا نقائص ہیں؟ حکومت اور عام لوگ اس مسئلہ پر آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ نظام میں کوئی بہت بڑی خرابی ہے۔ لیکن جو اختلاف رائے ہے وہ یہ کہ اس نظام کا کون سا پہلو محفوظ رکھنے کے قابل ہے اور کون سا مسترد کرنے کے لائق ہے۔ میں ان اختلافات پر بحث کرنے کا اہل نہیں ہوں، اس لیے میں صرف وہ باتیں آپ کے سامنے رکھوں گا جن پر میں غور و فکر کے بعد پہنچا ہوں۔

چونکہ تعلیم میرا میدان نہیں ہے، اس لیے اس موضوع پر کچھ کہتے ہوئے میں ذرا تامل کرتا ہوں۔ جب میں کسی شخص کو کسی ایسے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، جس کا اسے کوئی عملی تجربہ نہیں ہے اور اس لیے اس کے علم سے باہر ہے، تو میں اسے کچھ بہت اچھا نہیں سمجھتا۔ یہ ایک وکیل کے لیے قدرتاً بہت تکلیف اور غصہ کی بات ہوگی جو کسی طبیب کو وکیل کا فرض انجام دیتے ہوئے دیکھے۔ اسی طرح میں بھی سمجھتا ہوں کہ جن کو تعلیم کا کوئی تجربہ نہیں ہے، انھیں اس پر نکتہ چینی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس لیے میں چند لفظ اس سلسلہ میں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس موضوع پر کچھ کہنے کا حق کس طرح حاصل ہے۔

میں نے جدید تعلیم پر سوچنا اب سے کوئی پچیس برس پہلے شروع کیا۔ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک بار مجھے اپنے بچوں اور اپنے بھائیوں اور بہنوں کے بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری اٹھانی پڑی۔ میں اس سے واقف تھا کہ ہمارے مدرسوں میں کیا خرابیاں ہیں۔ لہٰذا میں نے اپنے بچوں پر تجربے شروع کر دیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مجھے اس تجربہ میں انھیں بہت دوڑانا پڑا۔ بعضوں کو میں نے

ایک بچے کو بھیجا اور بعضوں کو دوسری جگہ۔ چند کو میں نے خود پڑھانا شروع کیا۔ میری موجودہ نظامِ تعلیم سے بیزاری اُس وقت بھی قائم رہی جب میں جنوبی افریقہ گیا وہاں مجھے اس پر مزید غور کا موقع ملا۔ انڈین ایجوکیشن سوسائٹی[1] کے معاملات کا انتظام ایک عرصہ تک میرے ہاتھ میں رہا۔ میں نے اپنے لڑکوں کو اسکول نہیں بھیجا۔ میرا سب سے بڑا لڑکا تعلیم میں میرے تجربہ کی مختلف منزلوں اور ان تبدیلیوں کو جو وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھیں، برابر دیکھتا رہا اسے یہ پسند نہیں آئیں اور اس لیے وہ مجھے چھوڑ کر احمد آباد چلا گیا اور وہاں کچھ دنوں تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔ لیکن اس نے بعد میں یہ سمجھا کہ اس سے اس کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ جن لڑکوں کو میں نے اسکول نہیں بھیجا، اس سے ان کو کچھ نقصان بھی نہیں پہنچا ہے اور انہوں نے اچھی خاصی تعلیم پائی ہے۔ میں انکی کمزوریوں سے بھی واقف ہوں لیکن وہ اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ ان کی تربیت میرے تجربوں کی ابتدائی منزل میں ہوئی تھی۔ اس لیے اگرچہ یہ سب تجربے ایک ہی زنجیر کی کڑیاں تھیں لیکن انھیں نقصان ان تبدیلیوں سے ہوا جو وقتاً فوقتاً کرنی پڑتی تھیں۔ جنوبی افریقہ میں ستیاگرہ کے وقت کوئی پچاس لڑکے جو میری نگرانی میں تعلیم پا رہے تھے جو نظامِ تعلیم کا اسکول میں اختیار کیا گیا تھا وہ سب میرا بنایا ہوا تھا۔ یہ اس نظام سے بالکل مختلف اور جدا تھا جو سرکاری اسکولوں یا دوسرے مدرسوں میں رائج تھا۔ اسی قسم کی کوشش اب یہاں کی جا رہی ہے اور یہ تجربہ زیادہ اور دوسرے فضلاء کی مدد سے احمد آباد میں ایک

---

[1] یہ ایک انجمن تھی جو جنوبی افریقہ میں وہاں کے ہندوستانی بچوں کی تعلیم کے لیے قائم کی گئی تھی۔ — مرتب۔

نیشنل اسکول شروع کیا گیا ہے۔ اس کو قائم ہوئے اب پانچ ماہ ہو گئے ہیں۔ پروفیسر شُکل چند شاہ جو پہلے گجرات کالج میں تھے، اس کے پرنسپل ہیں۔ انہوں نے اپنی تعلیم پروفیسر گجر کے ماتحت پائی ہے اور ان کے ساتھ اور بھی بہت سے گجراتی زبان کے حامیوں میں ہیں۔ اس کوشش کی تنظیم کی بڑی ذمہ داری میرے سر ہے لیکن اس کو ان تمام اساتذہ کی تائید حاصل ہے جو اس کے ساتھ ہیں۔ البتہ انہوں نے خود کو اس کام کے لیے وقف کر دیا ہے اور ایک معمولی تنخواہ پر کام کر رہے ہیں جو بمشکل ان کے گزارہ کے لیے کافی کہی جا سکتی ہے۔ مجھے چونکہ اور کاموں کی وجہ سے وقت نہیں ملتا ہے، اس لیے اصل تعلیم کا کام میں اپنے ذمہ نہیں لے سکتا ہوں، پھر بھی مجھے اس کا برابر خیال رہتا ہے۔ اس طرح اس اسکول میں میرا حصہ صرف پلان بنانے والے کا ہے، لیکن اس پر بھی میں نے بہت غور و فکر سے کام لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ موجودہ نظام تعلیم کی جو خامیاں میں بیان کروں گا، اس سلسلہ میں آپ میری ان باتوں کو پیش نظر رکھیں گے۔

مجھے ہمیشہ ایسا محسوس ہوا ہے کہ ہمارے موجودہ نظام میں ہندوستانی گھروں کے ماحول پر کبھی کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ انگریزوں نے جب اپنا تعلیمی خاکہ تیار کیا تو انہوں نے ہماری مخصوص ضروریات کا کوئی خیال نہیں رکھا۔

میکالے نے ہمارے ادب کی مذمت کی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہم لوگ تمام تر توہمات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ خاکہ تیار کیا، ان میں سے اکثر ہمارے مذہب سے بالکل ناواقف تھے۔ ہماری مذہبی کتابیں ان کے نزدیک توہمات کا پلندہ تھیں۔ ہماری تہذیبیں انھیں برائیوں سے بھری نظر آتی تھیں۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ چونکہ ہم ایک کمزور اور پسماندہ قوم ہیں اس

لیے ہمارے سماجی اور دوسرے اداروں میں لازمی طور پر بہت سی خرابیاں ہوں گی۔ بہرحال خواہ ان کی نیتیں نیک رہی ہوں لیکن انہوں نے جو خاکہ بنایا، وہ بالکل غلط تھا۔ وہ مسئلہ کی بہت گہرائی میں نہیں گئے، اس لیے کہ ان کی توجہ صرف ان ضروریات تک محدود تھی جو ان کے گرد و پیش سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے خاکے کے پیچھے جو جذبہ تھا، وہ یہ کہ نئے حکمرانوں کی مدد کے لیے وکیلوں، ڈاکٹروں اور کلرکوں کی ضرورت ہوگی اور لوگوں کو اس نئے علم کی تعلیم کی ضرورت ہوگی جو ان کے پاس تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی کتابیں لکھی گئیں جس میں ہماری ضرورتوں اور ہمارے ماحول کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ اس طرح بقول ایک انگریزی مثل کے "گاڑی گھوڑے کے آگے لگا دی گئی۔"

تاریخ و جغرافیہ

شری مالا باری نے لکھا ہے کہ بچوں کو تاریخ اور جغرافیہ پڑھانے میں سب سے پہلے انھیں خود اپنے ملک کی تاریخ اور جغرافیہ پڑھانا چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مجھے سب سے پہلے جغرافیہ پڑھایا گیا تو مجھے انگلستان کی سب کاؤنٹیاں، (تحصیلیں) زبانی یاد کرائی گئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جغرافیہ جیسا دلچسپ مضمون میرے لیے زہر بن گیا۔ اسی طرح تاریخ بھی بالکل غیر دلچسپ طریقے سے پڑھائی گئی۔ تاریخ اپنے ملک سے محبت اور اس پر فخر کے جذبات پیدا کرنے کا ایک موثر آلہ ہے۔ لیکن مجھ میں اپنے ملک کی بابت یہ باتیں پیدا نہیں ہوئیں، اس لیے کہ جب مجھے اسکول میں تاریخ پڑھائی

گئی تو جو طریقہ استعمال کیا گیا، وہ غلط تھا۔ میں ان کتابوں کے علاوہ جو اس کے لیے تجویز کی گئی تھیں، اور کتابیں پڑھنے پر مجبور تھا۔

حساب

حساب اور اس قسم کے دوسرے مضمونوں میں بھی پرانے طریقہ کو مشکل سے کوئی جگہ دی گئی تھی۔ چونکہ حسابی قاعدوں کے پرانے طریقہ کو بالکل ترک کر دیا گیا تھا، ہم حسابات اس تیزی سے نہیں کر سکتے تھے جس تیزی سے کہ پرانی نسلوں کے لوگ کر سکتے تھے۔

سائنس

سائنس آج جس طرح اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے، وہ بہت خشک اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے بچوں کو اس مضمون میں جو کچھ سکھایا جاتا ہے، ان کا وہ کوئی مفید استعمال نہیں کر سکتے ہیں۔ ایک ایسا سائنس کا مضمون جیسے فلکیات، جسے لڑکوں کو باہر کھلے آسمان میں ستارے دکھا کر پڑھانا چاہیے، کتابوں کے ذریعہ سکھایا جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کتنے لڑکوں کو اسکول چھوڑنے کے بعد پانی کے اجزاء کا تجزیہ کرنا یاد رہتا ہوگا۔

صحت

جہاں تک صحت کے علم کا تعلق ہے، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس

کی کوئی تعلیم ہی نہیں ہوتی ہے۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ۶۰ سال کی تعلیم کے بعد بھی ہم نے اپنے کو ہیضے اور طاعون جیسی وبائی بیماریوں سے محفوظ کرنا نہیں سیکھا ہے۔ میں اپنے ہاں کی تعلیم صحت پر اسے بہت بدنما دھبہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے ڈاکٹر ان بیماریوں کو ختم نہیں کر سکے ہیں۔ میں نے سیکڑوں گھر دیکھے ہیں اور پھر بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ ان گھروں میں علم صحت نے قدم بھی رکھا ہے۔ مجھے بہت شبہ ہے کہ آیا ہمارے گریجویٹ بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ اگر سانپ کاٹ لے تو کیا کرنا چاہئے؟ اگر ہمارے ڈاکٹروں کو اپنے بچپن سے قوانین صحت سیکھنے کا موقع ملا ہوتا تو وہ آج ایسے ناکام ثابت نہ ہوتے۔ یہ ایک غیر ملکی نظام تعلیم کا نہایت تباہ کن نتیجہ ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں لوگوں نے کسی نہ کسی طرح وبائی امراض ختم کر دیئے ہیں، لیکن یہاں وہ جاتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں اور ہزارہا ہندوستانی قبل از وقت موت کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اگر اس کا سبب افلاس سمجھا جائے تو اس کا جواب بھی محکمہ تعلیم کو دینا ہوگا کہ ۶۰ سال کی تعلیم کے بعد ہندوستان میں اس قدر عام افلاس کیوں ہے؟

سیرت کی تعمیر

آیئے اب ان مضامین کی طرف توجہ کریں جو بالکل سکھائے نہیں جاتے ہیں۔ تمام تعلیم کا مقصد سیرت کی تعمیر ہونا چاہیئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ بغیر مذہب کے سیرت کی تعمیر کیسے ہو سکتی ہے؟ ہم بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچنے والے ہیں کہ ہم نہ گھر کے رہیں اور نہ گھاٹ کے۔ میں اس بارے میں اس لئے

زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ لیکن میں سیکڑوں استادوں سے ملا ہوں اور انہوں نے مجھے اپنا تجربہ بڑے افسوس کے ساتھ بتایا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر اس کانفرنس کو بہت سنجیدگی سے غور کرنا ہے۔ اگر اسکول جانے والے لڑکے اور لڑکیوں کی اس طرح تربیت ہوئی کہ وہ اخلاق سے بے پرواہ رہے تو ایسا نقصان اٹھانا پڑے گا جس کی تلافی نہ ہوسکے گی۔

زراعت

ہمارے ملک میں ۸۵ سے ۹۰ فیصد لوگ زراعت کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس مخصوص شعبہ کا کوئی علم بھی ضرورت سے زاید نہیں کہا جا سکتا ہے۔ پھر بھی بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہائی اسکول تک کے نصاب میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ یہ صرف ہندوستان ہی میں ایسی صورتِ حال گوارا کی جا سکتی ہے!

بُنائی کا کام

ہماری بُنائی کی صنعت کو بھی بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ یہ ایک بہت پھیلتا پھولتا گھریلو دھندا تھا جس سے کسانوں کو ایسے زمانہ میں جبکہ زمین کو بغیر جوتے ہوئے چھوڑ دینا ہوتا، اور اسے کوئی اور کام نہ ملتا تو اس سے کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔ بُننا بھی نصاب میں کہیں نہیں ہے۔ ہماری تعلیم صرف کلرک پیدا کر سکتی ہے۔ سونار، لوہار اور چمار بھی جب وہ اس جال میں پھنس

جاتے ہیں تو کلرک بن جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سب کو ایک اچھی تعلیم پانے کا موقع حاصل ہو۔ لیکن اگر قوم کی قوم کلرک بن جائے تو اس قوم کا کیا انجام ہوگا؟

ملیٹری سائنس

ہماری تعلیم میں ملیٹری سائنس کی کوئی جگہ نہیں، ذاتی طور سے مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں اسے بلکہ ایک اتفاقیہ فائدہ تصور کرتا ہوں لیکن اگر ہم میں سے کچھ لوگ ہتھیار کا استعمال سیکھنا چاہتے ہیں، تو انھیں اس کے سیکھنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ اسے بھی ہماری تعلیم میں نظر انداز کیا گیا ہے۔

موسیقی

یہی حال موسیقی کا ہے۔ اس کا ہم پر بہت اثر پڑتا ہے۔ ہم نے اس اہم فن کا کافی خیال نہیں رکھا، ورنہ ہم نے اپنے لڑکے اور لڑکیوں کے لیے اس کی تعلیم کا انتظام کیا ہوتا۔ ویدکے ترانے موسیقی کی بنیاد پر مرتب کیے گئے ہیں۔ ہم آہنگ موسیقی میں یہ طاقت ہے کہ وہ روح کے کرب کو کم کر سکتی ہے۔ بعض وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے مجمعوں میں بہت زیادہ بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر سب مل کر قومی ترانہ گانے لگیں تو یہ رک جاتی ہے۔ جب ایک بڑی جماعت مل کر گاتی ہے تو اس سے ایک بڑا اثر اور کیف پیدا ہوتا ہے۔ سیکڑوں لڑکوں کا مل کر ایک نظم گانا جو شجاعت اور بہادری کے

کارناموں سے بھری ہو، کس قدر اثرانگیز منظر ہوگا۔ یہ ایک عام بات ہے کشتی کھینے والے اور دوسرے محنت کرنے والے اپنے کام کرتے ہوئے "ہری ہر" اور "اللہ بیلی" کے نعرے لگاتے ہیں۔ اس سے ان کے کاموں میں آسانی ہو جاتی ہے۔ یہ موسیقی کی طاقت کی چند مثالیں ہیں۔ میں نے اپنے انگریز دوستوں کو دیکھا ہے کہ وہ سردی کے اثر کو کم کرنے کے لیے گانے گاتے ہیں۔ ہمارے لڑکے نہایت آسانی سے عام ڈراموں اور ناٹکوں کے گانے یاد کر لیتے ہیں اور ہارمونیم جیسے معمولی باجوں کا بجانا سیکھ لیتے ہیں۔ اس سے ایک اچھی موسیقی کا مذاق پیدا کرنے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ اس کی بجائے اگر ان کی کلاسیکی موسیقی میں تربیت ہوتی تو ان کا وقت جو اکثر بازاری اور بیہودہ گانوں میں صرف ہوتا ہے، زیادہ اچھے کاموں میں استعمال ہو سکتا تھا۔ جس طرح ایک ماہر موسیقی بے وقت کے راگ نہیں الاپتا، اسی طرح ایک صحیح موسیقی کا معتقد کبھی گندے گانے نہیں گائے گا۔ موسیقی کو ہماری تعلیم میں مناسب جگہ ملنی چاہیئے اور لوگوں کی تہذیبی بیداری میں اس کی قیمت تسلیم کی جانی چاہیئے۔ ڈاکٹر آنند کمار سوامی کے فاضلانہ خیالات اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کرنے کے قابل ہیں۔

تربیت جسمانی

تربیت جسمانی میں بہت سے مختلف کھیل وغیرہ شامل کر لیے گئے ہیں۔ لیکن اس باب میں بھی ان کے صحیح مقصد اور معنی پیش نظر نہیں رکھے گئے ہیں اور ہمارے دیسی کھیلوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ٹینس، کرکٹ اور

فٹ بال کو بڑی مقبولیت حاصل ہو گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ تینوں کھیل دلچسپی سے خالی نہیں۔ لیکن اگر ہم ان مغربی کھیلوں کے اس قدر فریفتہ نہ ہوتے تو ہم اپنے دیسی کھیلوں کو جو کہیں کم خرچ اور ان سے کسی طرح کم دلچسپ نہیں، ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ مثلاً گیند بلا، گلی ڈنڈا، کھوکھو، سات تالی، کبڈی وغیرہ۔ پرانے اکھاڑے جن میں کشتی اور مختلف ہندوستانی ورزشیں ہوتی تھیں، ان کے استعمال میں نہ آنے کی وجہ سے تقریباً ان کا وجود ہی ختم ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں اگر کوئی مغربی چیز ہے جس کی ہم نقل کر سکتے ہیں تو وہ ڈرل یا جسمانی قواعد ہے۔ ایک دوست نے ایک بار خوب کہا کہ ہم چلنا بھی نہیں جانتے، بالخصوص جب ایک سے زیادہ ہوں اور قدم ملا کر چلنا ہو۔ ہم میں خاموشی سے اور باقاعدہ چلنے کی تو بالکل صلاحیت ہی نہیں۔ بالخصوص تال کے ساتھ اور دو دو یا چار چار کی قطار میں جبکہ ہم سیکڑوں یا ہزاروں کی تعداد میں ہوں۔ ایسی قواعد صرف جنگ ہی میں مفید نہیں ہے۔ یہ بہت سے خدمت کے کاموں میں بھی کام آ سکتی ہے، مثال کے طور پر آگ بجھانے میں، لوگوں کو ڈوبنے سے بچانے میں، بیماروں اور لاچاروں کو ڈولی وغیرہ میں لے جانے میں۔ اگر پہلے سے قواعد کی مشق ہو تو اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے اسکولوں میں دیسی کھیل، ورزشیں اور مغربی طرز کی قواعد کو رواج دیں۔

عورتوں کی تعلیم

ہماری عورتوں کی تعلیم بھی مردوں کی تعلیم کی طرح ناقص ہے۔ لوگوں

نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی ہے کہ مردوں اور عورتوں میں تعلقات کیسے ہونے چاہییں یا ہندوستانی سماج میں عورت کا کیا درجہ ہونا چاہیئے؟ یہ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیئے کہ بیشتر حصہ لڑکے اور لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم کا یکساں ہوگا۔ اسے چھوڑ کر پھر بہت عدم یکسانیت ہے۔ اسی طرح مردوں اور عورتوں کی تعلیم میں بھی بہت فرق کرنے کی ضرورت ہے جیسا کہ خود مادرِ فطرت نے ان میں فرق رکھا ہے یہ صحیح ہے کہ یوں وہ برابر ہیں لیکن انھیں جن کاموں کے لیے قدرت نے پیدا کیا ہے، ان میں بہت فرق ہے۔ یہ عورت کا حق ہے کہ وہ گھر کے اندر حکمرانی کرے۔ مرد اس کے باہر کا مالک ہے مرد روزی کما کر لانے والا ہے، عورت اسے بچاتی ہے اور خرچ کرتی ہے۔ عورت بچوں کی پرورش کرتی ہے۔ وہ ان کی ماں ہے۔ وہ ان کی سیرت کی تشکیل کی ذمہ دار ہے۔ وہ ان کی معلم ہے اور اس لیے نسل انسانی کی ماں ہے۔ اس حیثیت سے مرد نسل انسانی کا باپ نہیں ہے۔ ایک عمر کے بعد باپ کا اثر بیٹے پر ختم ہو جاتا ہے لیکن ماں کا نہیں ہوتا۔ لڑکا بڑا ہونے پر بھی اپنی ماں کے سامنے بچہ کی سی حرکتیں کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے باپ کے سامنے ایسا نہیں کر سکتا۔

اگر یہ انتظام قدرتی اور صحیح سمجھا جائے تو ایک عورت پر روزی کمانے کا بار نہیں ڈالنا چاہیئے۔ ایک سماج جس میں عورتوں کو تار گھر میں کلرک یا ہیسٹنٹ یا کمپوزیٹر کی حیثیت سے کام کرنا ہوتا ہے، وہ سماج میرے خیال میں اچھا منظم سماج نہیں ہے۔ یہ اخلاقی اور معاشی دیوالیہ پن کی علامت ہے اور اس بات کا ثبوت کہ اس سماج کے لوگ اب زر اصل کھانے لگے ہیں۔

اس لیے جس طرح عورتوں کو جہالت میں اور دبا کر رکھنا غلط ہے اسی طرح

انھیں ایسے کام سپرد کرنا بھی غلط ہے جو عموماً مردوں کے کرنے کے ہیں، اس لیے کہ یہ کمزوری کی علامت ہے اور اس بنا پر ان پر ظلم ہے۔

اس لیے ایک عمر کے بعد عورتوں کے لیے ایسی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے جو مردوں کی تعلیم سے جدا ہو۔ عورتوں کو گھر کے انتظام کی تعلیم دینی چاہیے، انھیں حمل کے زمانہ میں کیا کرنا اور کیا نہ کرنا چاہیے اور بچوں کی تربیت اور دیکھ بھال کی تعلیم ہونی چاہیے۔ ایسی تعلیم کا مناسب انتظام کرنا ذرا مشکل ہے، اس لیے کہ یہ ایک نیا خیال ہے۔ بہ حالات موجودہ مناسب یہ ہوگا کہ اچھے چال چلن کے روشن خیال اور تجربہ کار مرد اور عورتوں کی ایک کمیٹی بنا دی جائے جو اس مسئلہ کی تحقیقات کرے، صحیح نتیجہ پر پہنچے اور اس غرض کے لیے ایک مناسب اسکیم تیار کرے۔

اس کمیٹی کو یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ بچیاں جب اپنے بچپن کی عمر ختم کر لیں اور عورت کی منزل میں قدم رکھیں تو ان کی بہتر سے بہتر تعلیم کیسے ہونی چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو ابھی بچپن ہی کی عمر میں ہوتی ہیں کہ ان کی شادی ہو جاتی ہے اور یہ تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اور ایک مرتبہ جہاں ان کی شادی ہوئی، وہ بس سماجی زندگی سے بے تعلق ہو جاتی ہیں۔ میں نے اپنی رائے اس مقدمہ میں پورے طور پر ظاہر کر دی ہے جو بھاگی لینگ ماں، سلسلہ کی پہلی کتاب پر لکھا ہے۔ میں انھیں یہاں بھی درج کرتا ہوں:

"ہم عورتوں کی تعلیم صرف لڑکیوں کی تعلیم دے کر نہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ ابتدائی عمر کی شادیوں کی بدولت ہزاروں لڑکیاں بارہ برس ہی کی عمر میں نظروں سے غائب ہو جاتی ہیں۔ یکبارگی وہ لڑکیوں سے گھریلو عورتیں بن جاتی ہیں۔ جب تک یہ بری رسم جاری رہے گی،

اُستوار تک اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مردوں کو عورتوں کا اُستاد بننا چاہیئے۔ عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں ہماری بہت سی اُمیدیں اس پر منحصر ہیں کہ مرد کہاں تک اپنا یہ فرض انجام دیتے ہیں۔ عورتوں کو ہمارا خادم اور ہماری تفریح کا سامان ہرگز نہ بننا چاہیئے جیسا کہ وہ آج ہیں اور اس کی بجائے انھیں ہمارا رفیقِ حیات، زندگی کی جنگ میں برابر کا شریک اور خوشی اور رنج میں حصہ دار ہونا چاہیئے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا، ہماری سب کوششیں بے کار ثابت ہوں گی بعض ایسے مرد بھی ہیں جو اپنی عورتوں کو چوپایہ کی طرح سمجھتے ہیں۔ اس افسوسناک صورتِ حال کے لیے ہماری بعض سنسکرت کی ضرب المثلیں اور تلسی داس کا یہ مشہور دوہا ذمہ دار ہے۔ تلسی داس راماین میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ "ڈھول، بے وقوف، شودر اور عورت۔ یہ سب پیٹنے ہی سے درست رہتے ہیں"۔ میں تلسی داس جی کی بڑی عزت کرتا ہوں لیکن میری یہ عزت گوارا نہیں ہے۔ یا تو یہ دوہا ایک تحریف ہے، یا پھر اگر ان کا کہا ہوا ہے تو انھوں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا ہوگا، جیسا کہ اس وقت کے سماج میں اس کا چلن ہوگا۔ جہاں تک سنسکرت کی ضرب المثلوں کا تعلق ہے، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر اشلوک جو لکھا گیا ہے، وہ ایک الہامی حکم رکھتا ہے۔ ہم کو یہ اثر دور کرنا چاہیئے اور عورتوں کو ایک کمتر جنس سمجھنے کی رسم کو ترڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہیئے۔ اس کے برعکس ہم میں سے بہت سے جذبات سے متاثر ہو کر عورتوں

کو زیوروں سے آراستہ کر کے اس طرح رکھتے ہیں، جیسے دیوی دیوتاؤں کو رکھا جاتا ہے۔ ہمیں اس حماقت سے بھی دور رہنا ہے۔ لیکن ہمارا اصل مقصد اس وقت تک حاصل نہ ہوگا، جب تک ہماری عورتیں ہمارے لیے وہ نہیں ہو جاتیں جو پاربتی، مہادیو کے لیے، سیتا، رام کے لیے اور دمینتی، نل کے لیے تھیں۔ اس وقت وہ ہمارے بحث مباحثوں میں حصہ لے سکیں گی، مساویانہ بنیاد پر ہمارے ساتھ دلائل دے سکیں گی، ہماری رایوں کو سمجھیں گی اور انھیں تقویت پہنچائیں گی اور ہماری مشکلوں کو اس سوجھ بوجھ کی بنا پر سمجھیں گی جو ہمدردی سے پیدا ہوتی ہے، ان مشکلوں کے حل کرنے میں ہمارے ساتھ شریک ہوں گی اور جب ہمیں اس کی ضرورت ہوگی تو سکون و راحت پہنچانے والی ہوں گی۔ یہ مقصد صرف لڑکیوں کے اسکول کھول کر حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ جب تک ہماری گردنوں میں بچپنے کی شادی کا پھندا پڑا ہوا ہے، اس وقت تک مردوں کو اپنی عورتوں کا اُستاد بننا ہوگا۔ اور یہ تعلیم جو مرد اپنی عورتوں کو دیں گے، صرف لکھنے پڑھنے کی نہ ہوگی، اس میں سماجی اصلاح اور سیاست بھی شامل ہوگی۔ لکھنا پڑھنا صرف دوسرے مضامین کے سکھانے کا جن کا اوپر ذکر ہوا، ذریعہ ہوگا۔ یہ اس کے بغیر بھی سکھائے جا سکتے ہیں۔ ایک شخص جو اپنی بیوی کو اس طرح پر تعلیم دینے کی ذمہ داری لے گا، اسے اپنی بیوی کے ساتھ تمام طرزِ عمل بدل دینا ہوگا۔ اس شخص کو خود اپنی بیوی کے ساتھ طالب علم بننا

پڑے گا جب تک کہ وہ پورے بلوغ کو نہ پہنچ جائے کسی شکل میں بھی وہ ایک بارہ سے پندرہ برس کی لڑکی کو اپنے لیے بچے پیدا کرنے کی مصیبت میں مبتلا نہ کرے گا۔ ایک شخص کے اس خیال سے ہی ازو نکتے ٹکڑے ہو جانے چاہئیں۔ اگر ایسا ہونے لگے تو ہم پھر بے عملی کے شکار نہ ہوں گے جیسا کہ اس وقت ہیں۔

شادی شدہ عورتوں کے لیے کلاسیں کھل رہی ہیں اور ان کے لیے لیکچر کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے، سب کچھ ٹھیک ہے۔ جو لوگ اس کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ ایک اچھے مقصد کے لیے اپنے وقت اور صلاحیتوں کی قربانی کر رہے ہیں۔ یہ بڑی قابل تعریف بات ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ انھیں وہ فرض بھی ادا کرنا ہے جس کا اوپر ذکر ہوا، اس لیے کہ اس کے بغیر یہ سب کوششیں بہت زیادہ سود مند نہ ہوں گی۔ میں جتنا ہی غور کرتا ہوں، اسی قدر مجھے یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ بالکل واضح اور درست ہے۔"

ابتدائی تعلیم

ہر طرف آپ کو بڑی بڑی تعمیریں کمزور بنیادوں پر کھڑی ہوئی نظر آئیں گی۔ ابتدائی تعلیم کے لیے جو استاد منتخب کیے جاتے ہیں، وہ محض اخلاقاً استاد کہے جا سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انھیں استاد کہنا اس لفظ کا بے جا استعمال کرنا ہے۔ بچپن ایک شخص کی زندگی کا سب سے اہم حصہ ہے۔ اس عمر میں جو علم حاصل ہو

جاتا ہے، نہ کبھی نہیں ضائع جاتا۔ لیکن بچہ کو اس عمر میں بہت کم ملتا ہے اور اسے کسی نام نہاد اسکول میں ڈال دیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہائی اسکولوں اور کالجوں کی آرائش و زیبائش اور ساز و سامان پر جتنی رقم خرچ کی جاتی ہے وہ اس قدر زاید ہوتی ہے کہ ہمارا غریب ملک بہ مشکل اس کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ اگر اس کی بجائے اونچے اخلاق کے اچھے تعلیم یافتہ اور تجربہ کار استادوں کے ہاتھوں ایسی جگہوں میں ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جائے جہاں بچوں کی صحت اور ان کے گرد و پیش کے قدرتی حسن کا پورا خیال رکھا گیا ہو تو ہمیں کم وقت میں زیادہ اچھے نتائج حاصل ہوں گے۔ ہمارا مقصد اس وقت بھی حاصل نہ ہوگا اگر ہم اس تبدیلی کے لیے موجودہ اُستادوں کی تنخواہیں دوگنی کر دیں۔ اتنے بڑے بڑے نتائج ایسی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے پیدا نہیں ہوا کرتے۔ ابتدائی تعلیم کی اصل ہیئت کو سرے سے بدلنا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسا کرنا مشکل ہے اور اس میں بہت سی دشواریاں بھی ہیں۔ پھر بھی یہ گجرات کیلا ودانی منڈل کی طاقت سے باہر نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ اس کا حل معلوم نہ کر سکے۔

یہاں پر میں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری غرض ابتدائی مدارس کے اُستادوں کے عیوب بتانا نہیں ہے۔ انھیں بڑی مشکلوں میں رہ کر کام کرنا پڑتا ہے اور پھر بھی وہ کرتے ہیں اور بعض وقت امیدوں سے زاید نتائج پیدا کرتے ہیں۔ میں اسے اپنی عظیم الشان تہذیب اور روایات سے منسوب کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی کافی ہمت افزائی کی گئی تو وہ ایسے نتائج پیدا کریں گے جن کا ہم اس وقت تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔

تعلیم مفت اور لازم

میں یہ نہیں سمجھتا کہ میرے لیے اس وقت اُس متنازعہ فیہ مسئلے کے متعلق کچھ کہنا ضروری ہے کہ آیا تعلیم مفت اور لازمی ہونی چاہیئے یا نہیں۔ میرا تجربہ بہت محدود ہے۔ علاوہ اس کے لوگوں پر کسی چیز کا بار جبراً تھوپنا مجھے کچھ اپیل نہیں کرتا۔ اس لیے اس مزید بار کا عاید کرنا بھی مجھے کچھ پسند نہیں آتا۔ زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ اس وقت تعلیم مفت کر دی جائے لیکن اختیاری رکھی جائے۔ ہمیں پہلے اس کا تجربہ کرنا چاہیئے۔ تعلیم لازمی کرنے میں بہت سی مشکلیں آسکتی ہیں، جب تک کہ ہم اپنے مالکوں کی غلامی سے آزاد نہ ہو جائیں جو ہمارے ملک پر مسلط ہیں۔ اس معاملہ کا فیصلہ کرنے میں بڑودہ حکومت کا تجربہ ہمیں بہت مدد دے سکتا ہے۔ میں نے جہاں تک اس مسئلہ کا مطالعہ کیا ہے، اس کی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں جبر نہیں ہونا چاہیئے لیکن میرا مطالعہ بہت ناکافی ہے۔ مجھے امید ہے کہ جو ڈیلی گیٹ اس کانفرنس میں آئے ہیں، وہ ہمیں اس کے متعلق اپنے قیمتی مشورے دیں گے اور کسی مناسب فیصلہ تک پہنچنے میں ہماری مدد کریں گے۔

آخر میں میں اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ان خرابیوں کے دور کرنے کے لیے حکومت کے پاس درخواستیں بھیجنا کافی نہیں ہے۔ بڑی بڑی اہم تبدیلیاں حکام کے ہاتھوں نہیں ہو سکتی ہیں۔ یہ ہمارے رہنماؤں کا کام ہے کہ وہ ایسے نئے نئے کام اپنے ہاتھ میں لیں۔ برطانوی دستور میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ لوگ ایسے کام ہاتھ میں لیں۔ اگر ہم ۔۔

سمجھتے ہیں کہ صرف حکومت ہی کو یہ سب کام کرنے چاہئیں تو ایک عرصہ تک شاید ہمیں اپنا مقصد حاصل نہ ہو جیسا کہ انگلستان میں ہوا ہے۔ یہاں بھی ہمیں سب سے پہلے تجربے کرنے چاہئیں اور نتائج معلوم کرنے چاہئیں قبل اس کے کہ ہم حکومت سے ان نئی باتوں کے اختیار کرنے کی درخواست کریں۔ جو شخص کسی معاملہ میں کوئی عیب دیکھتا ہے وہ اسے اپنی کوششوں سے دور کر سکتا ہے۔ اور اگر اسے کامیابی ہوتی ہے تو وہ حکومت سے درخواست کر سکتا ہے کہ وہ اپنے نظام میں مناسب تبدیلی کرے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک میں مختلف قسم کے تعلیمی ادارے تجربہ کے طور پر کھولے جائیں۔

ڈگری کا خیال

اس میں صرف ایک رکاوٹ ہوگی اور وہ ڈگری کا خیال ہے۔ ہماری روزی کا دارومدار تمام امتحانات پاس کرنے پر ہوتا ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ ڈگریاں صرف ان کے لیے مفید ہیں جو سرکاری ملازمتوں میں جانا چاہتے ہیں، لیکن لوگوں کی زندگی کی عمارت صرف ان چند اشخاص پر نہیں کھڑی ہو گی جو سرکاری ملازمت چاہتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ بغیر سرکاری ملازمتوں میں گئے کافی روپیہ پیدا کر سکتے ہیں۔ جب وہ لوگ جو تقریباً ان پڑھ ہیں، اپنی ذہانت اور ہوشیاری کی بدولت لکھ پتی ہو سکتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تعلیم یافتہ کیوں نہیں ہو سکتے ہیں۔ اگر تعلیم یافتہ لوگ یہ خوف دل سے نکال دیں تو وہ یقیناً کم سے کم اس قابل ہو سکتے ہیں، جتنے ان پڑھ ہیں۔

اگر ڈگری کا یہ لالچ دور کیا جا سکے تو کتنے ہی نجی مدارس قائم ہو سکتے اور اپنے پلان کے مطابق چل سکتے ہیں۔ کوئی حکومت بھی تمام تعلیم کا پورا انتظام نہیں کر سکتی ہے جو لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ امریکہ میں تعلیم زیادہ تر غیر سرکاری ہے۔ انگلستان میں بھی بہت سے لوگ ایسے ادارے چلاتے ہیں اور وہ خود اپنے سرٹیفکٹ دیتے ہیں۔

تعلیم کو صحیح بنیادوں پر لانا بہت مشکل کام ہے اور اس کے لیے ہرکلیز[1] کی طاقت چاہیے۔ ہمیں اس کے لیے اپنا سب کچھ لگا دینا ہوگا۔ دامے درمے قدمے اور ان میں بھی سب سے زیادہ 'درمے' کی ضرورت ہے۔

امریکہ کی مثال

میرا خیال ہے کہ ہم امریکہ سے کچھ بہت نہیں سیکھ سکتے ہیں لیکن ایک چیز ہے جس کی ہم نقل کر سکتے ہیں۔ وہاں اکثر تعلیمی ادارے ہیں جو بڑے بڑے ٹرسٹ چلاتی ہیں۔ دولت مند امریکیوں نے تعلیم کے لیے لاکھوں ڈالر بطور عطیے دیئے ہیں۔ اکثر یہ ٹرسٹ کئی کئی اسکول اور کالج چلاتے ہیں۔ جس طرح دولت مند لوگوں نے اس کے لیے روپے دیئے ہیں، اسی طرح قابل لوگوں نے جنھیں اپنے ملک سے محبت ہے، اپنا خدمات اس کے لیے پیش کی ہیں۔ وہ ان اداروں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور ان کے علمی معیار قائم رکھنے میں مدد دیتے

---

[1] یونان کا ایک دیوتا جو اپنی قوت کے بل پر پورے کرۂ ارض کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے۔ (مرتب)

گیا۔ وہ ہر ادارے کو اتنی امداد دیتے ہیں، جتنی وہ سمجھتے ہیں کہ اس کو ضرورت ہے۔ کوئی ادارہ جو ٹرسٹ کے منظور شدہ دستور کو اختیار کرنے اور ان کے قواعد پر عمل کرنے کے لیے راضی ہو جاتا ہے، وہ امداد کے لیے درخواست دے سکتا ہے۔ یہ انہی ٹرسٹوں میں سے ایک ٹرسٹ کی چلائی ہوئی مہم تھی جس نے زراعت کے میدان میں نئی تحقیقاتوں کے علم کو کسانوں تک پہنچایا۔ گجرات میں بھی ہم ایسا ہی طریقہ اختیار کر سکتے ہیں اور اسی قسم کا کام کر سکتے ہیں۔ یہاں دولت بھی ہے اور علم بھی، اور مذہب کی محبت ابھی تک مفقود نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے بچے پڑھنے کے لیے بے چین ہیں۔ اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ یہ کوشش شروع کر سکیں تو ہم چند سال کے عرصہ میں حکومت کو بتا سکتے ہیں کہ ہماری کوششیں صحیح راستے پر لگی ہوئی ہیں۔ اور پھر میں سمجھتا ہوں کہ حکومت بھی اسے پورا کرنے میں مدد دے گی۔ یہ کام جو ہم کریں گے، وہ خود اتنی بلند آواز سے بولے گا اور اس قدر روشن ہوگا جو ہزاروں درخواستوں سے کہیں زیادہ موثر ہوگا۔

جو تجویزیں اوپر بیان کی گئی ہیں، وہ کیلاوتی منڈل کے اور دونوں مقصدوں کو بھی اپنے اندر شامل رکھتی ہیں۔ ایسے ٹرسٹ کے قیام سے تعلیم کی اشاعت کی مہم کا کام بھی انجام پائے گا اور تعلیم کے میدان میں عملی کام بھی۔ لیکن اگر یہ ہو جائے تو ہمارا بہت سا کام پورا ہو جائے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام آسانی سے نہ ہو سکے گا۔ حکومت کی طرح دولت مند لوگ بھی جگانے سے اٹھتے ہیں۔ اور ان کے جگانے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ تپسیا یعنی ریاضت۔ ریاضت، دھرم کا سب سے پہلا اور آخری قدم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ گجرات کیلاوتی منڈل اس ریاضت کی زندہ تصویر ہے یعنی

اس میں یہ ریاضت بدرجہ اتم موجود ہے۔ جب اس کے سکریٹری اور ممبران دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے کے جذبے سے معمور ہوں گے اور مزید برآں ایسی درجہ کا علم بھی رکھتے ہوں گے تو روپیہ ان کے پاس آپ سے آپ آنے لگے گا۔ پیسے والے لوگ پہلے ہمیشہ شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس شبہ کرنے کی ان کے پاس وجہ بھی ہے۔ اس لیے اگر ہم دولت کی دیوی کو خوش رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے اپنی اہلیت کا ثبوت دینا ہوگا۔

اگرچہ ہمیں اس کام کے لیے بہت روپوں کی ضرورت ہوگی، لیکن ہمیں اس کی بے کار فکر نہ کرنی چاہیے۔ جو شخص قومی تعلیم کا کام کرنا چاہتا ہے، اگر وہ غیر تعلیم یافتہ ہے تو وہ خود ایک مزدور کی زندگی اختیار کرے گا اور اس دوران اپنی تعلیم خود کرے گا۔ جب وہ کافی علم حاصل کرلے گا تو وہ ایک چھوٹا سا مدرسہ ایک درخت کے نیچے شروع کر دے گا اور جو لوگ اس کے پاس آئیں گے، وہ انھیں پڑھائے گا، نہ پیسہ کی کمی اس کے اپنے اس ارادے کی تکمیل میں حایل نہ ہوگی، جو اس نے قومی تعلیم دینے کا کیا ہے۔

تعلیم دینے کا فرض برہمنوں کے ذمہ عاید کیا گیا ہے۔ ہر وہ شخص جو برہمنوں کی زندگی بسر کرنا اختیار کرے، اس کام کو کرسکتا ہے ہمارے ملک میں جب ایسے برہمن پیدا ہوں گے تو دولت اور طاقت دونوں اپنے سر ان کے سامنے جھکا دیں گی۔

میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ گجرات کیلاوانی منڈل کو اس بڑے مقصد میں ایمان کامل عطا کرے۔

تعلیم کے ہاتھ میں سوراج کی کنجی ہے، ہمارے سیاسی لیڈر

مسٹر مونٹیگو کے پاس جانا چاہیں تو وہ جائیں۔ یہ اس کانفرنس کے دائرے سے باہر ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بغیر صحیح تعلیم کے جو اس کانفرنس کا خاص مقصد ہے، سب کوششیں بے کار ہیں۔ اگر ہم یہاں کامیاب ہوتے ہیں، تو یقین کیجئے کہ ہم اپنے اور کاموں میں بھی جو ہم اپنے ہاتھ میں لیں گے، کامیاب ہوں گے۔

(ترجمہ از گجراتی 'ودیارسرشٹی')

تیسرا باب

تعلیم اور زبان کا مسئلہ

انگریزی تعلیم

قاری :۔ تو کیا پھر میں یہ سمجھوں کہ آپ انگریزی تعلیم کو 'ہوم رول' حاصل کرنے کے لیے ضروری نہیں سمجھتے ہیں ؟۔

مدیر (گاندھی جی) :۔ میرا جواب 'ہاں' اور 'نا' دونوں ہے۔ لاکھوں آدمیوں کو انگریزی کی تعلیم دینا انھیں غلام بنانا ہے۔ میکالے نے جس تعلیم کی بنیاد رکھی، اس نے ہم سب کو غلام بنا دیا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اس کی ایسی کوئی نیت تھی، لیکن نتیجہ ایسا ہی ہوا ہے۔ کیا یہ بڑے افسوس کی بات نہیں ہے کہ ہم کو 'ہوم رول' کے بارے میں ایک بدیسی زبان میں بات چیت کرنا ہوتا ہے؟

اور یہ بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ جو نظام یورپ والوں نے ترک کر دیا ہے، وہ نظام آج ہم میں مروج ہے۔ ان کے اہل علم برابر تبدیلیاں کرتے جا رہے ہیں۔ ہم اپنی جہالت میں ان کے اتار پھینکے ہوئے نظاموں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ وہ ہر جز کو چاہتے ہیں کہ اپنی حالت کو بہتر کرے۔ ویلز انگلستان کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ بڑی کوششیں اس بات کی ہو رہی ہیں کہ ویلز کے لوگوں میں ویلز کی زبان کو دوبارہ زندہ کیا جائے، انگریزی امیر جامعہ مسٹر لائیڈ جارج اس تحریک میں بڑا نمایاں حصہ لے رہے ہیں کہ ویلز کے بچے ویلز کی زبان بولیں۔ اور ہماری حالت کیا ہے؟ ہم ایک دوسرے سے غلط انگریزی میں خط و کتابت کرتے ہیں اور اس سے ہمارے ایم اے بھی

بڑی نہیں۔ ہمارے بہترین خیالات انگریزی میں ظاہر کیے جاتے ہیں۔ ہماری کانگریس کی کارروائی انگریزی میں ہوتی ہے۔ ہمارے بہترین اخبار انگریزی میں چھپتے ہیں۔ اگر یہی صورت حال ایک عرصہ تک قائم رہی تو مجھے یقین ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں ہم کو کوسیں گی اور ہم پر لعنت بھیجیں گی۔

یہ خیال میں رکھنے کی بات ہے کہ انگریزی تعلیم پاکر ہم نے قوم کو غلام بنا دیا ہے۔ نفاق، ظلم وغیرہ بڑھ گئے ہیں۔ انگریزی داں ہندستانیوں نے لوگوں کو دھوکا دینے اور ان میں ڈر پیدا کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا ہے۔ اب اگر ہم اپنی قوم کے لیے کچھ بھی کر رہے ہیں تو ہم اُس قرضے کا صرف ایک حصہ ادا کر رہے ہیں جو اس کا ہم پر آتا ہے۔

کیا یہ تکلیف دہ بات نہیں ہے کہ اگر میں کسی عدالت میں جانا چاہوں تو مجھے بطور ذریعہ کے انگریزی زبان سے کام لینا ہوگا۔ اور یہ کہ اگر میں بیرسٹر ہو جاؤں تو مجھے اپنی مادری زبان بولنی نہ پڑے اور پھر کسی اور کو میری زبان سے ترجمہ کرکے مجھے بتانا پڑے! کیا یہ بالکل احمقانہ بات نہیں ہے؟ کیا یہ غلامی کی نشانی نہیں ہے؟ کیا اس کے لیے میں انگریز کو الزام دوں یا خود کو؟ یہ ہم انگریزی داں لوگ ہیں جنہوں نے ہندستان کو غلام بنایا ہے۔ قوم کی بد دعا انگریزوں پر نہیں پڑے گی بلکہ ہم پر پڑے گی۔

میں نے کہا ہے کہ آپ کے آخری سوال کا جواب 'ہاں' اور 'نا' دونوں ہے۔ میں نے ابھی آپ کو بتایا کہ 'ہاں' کس طرح ہے۔ اب میں آپ کو بتاؤں گا کہ 'نا' کیسے ہے؟

ہم کو تہذیب کی بیماری نے ایسا گھیر لیا ہے کہ ہم بغیر انگریزی تعلیم کے کچھ

کر ہی نہیں سکتے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ تعلیم پائی ہے، وہ جہاں ضرورت
سمجھیں، اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ انگریز لوگوں سے معاملہ رکھنے
میں خود اپنے لوگوں سے معاملہ رکھنے میں جب ہم صرف اسی زبان کا استعمال
رکھیں اور یہ جاننے کے لیے کہ وہ (انگریز) خود اپنی تہذیب سے کس قدر بیزار
ہو گئے ہیں، اس صورت میں ہم انگریزی کا استعمال کر سکتے ہیں اور انگریزی سیکھ
سکتے ہیں۔ جن لوگوں نے انگریزی پڑھی ہے، انھیں اپنی مادری زبان کے
ذریعہ اپنی اگلی نسل کو اخلاق کی تعلیم دینی ہوگی اور انھیں ایک اور
ہندوستانی زبان سکھانی ہوگی۔ لیکن جب وہ بڑے ہو جائیں تو پھر وہ
انگریزی سیکھ سکتے ہیں لیکن مقصد سامنے یہی رکھنا ہوگا کہ ہمیں اس کی ضرورت
نہ ہونی چاہیے۔ اس کے ذریعہ روپیہ پیدا کرنے کا خیال ترک کر دینا چاہیے۔
اس محدود مقصد کے لیے بھی انگریزی سیکھنے میں ہمیں یہ خیال رکھنا ہوگا کہ
اس کے ذریعہ ہمیں کیا سیکھنا ہے اور کیا نہیں سیکھنا ہے؟

('ہند سوراج'، ۱۹۰۸ء باب ۱۸)

مادری زبان بہ حیثیت ذریعہ تعلیم

دیسی زبانوں کا سوال بہ حیثیت ذریعہ تعلیم کے ایک قومی اہمیت کا
سوال ہے۔ دیسی زبانوں کو نظر انداز کرنا قومی خودکشی کے ہم معنی ہے۔ انگریزی
زبان کے بہت سے حامی جو انگریزی کو بطور ذریعہ تعلیم کے جاری رکھنا چاہتے

ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی ہی قومی اور ملکی کاموں کے سب سے بڑے اہل ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت ظلم کی بات ہوتی۔ اس لیے کہ اس ملک میں کوئی تعلیم جو ہوتی ہے وہ انگریزی زبان کے ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم جتنا وقت اپنی تعلیم پر صرف کرتے ہیں، نتائج اس لحاظ سے بہت کم ہیں۔

اس مضمون پر سب سے تازہ بیان وائسرائے کا ہے۔ اگرچہ ہز ایکسیلنسی نے اس کا کوئی حل نہیں بتایا ہے۔ وہ دیسی زبانوں کے ذریعہ ہمارے اسکولوں میں تعلیم کی ضرورت سے پورے طور پر واقف ہیں۔ وسطی اور مشرقی یورپ کے یہودی جو کہ دنیا کے تمام حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں، انھوں نے باہمی تعلقات کے لیے ضروری سمجھ کر 'یڈیش' کو ایک زبان کی حیثیت دیدی ہے اور انھوں نے 'یڈیش' زبان میں دنیا کے ادب کی بہترین کتابوں کو ترجمہ کر ڈالا ہے۔ وہ بھی اپنی روح کو بہت سی غیر ملکی زبانوں سے جن کے کہ وہ ماہر تھے تشفی نہ دے سکے۔ اور نہ ان کے چند علما نے عام یہودی آبادی کو غیر ملکی زبان کے سکھانے سے زیر بار کیا، قبل اس کے کہ وہ اپنی حیثیت کو پا سکیں۔ چنانچہ انھوں نے اس زبان کو جو پہلے ہر بولی بولی سمجھی جاتی تھی، لیکن جو یہودی بچے اپنی ماؤں سے سیکھتے تھے، انھوں نے محنت سے دنیا کے بہترین خیالات اس میں ترجمہ کر کے اسے مالا مال کر دیا ہے۔ یہ حقیقتاً ایک بہت حیرت انگیز کام ہے۔ یہ اسی نسل کے اندر کیا گیا ہے۔ اس 'یڈیش' سے جسے ویبسٹر کئی زبانوں سے بنی ہوئی بولی کہتا ہے۔

لہ یہ گاندھی جی کی اس تمہید سے لیا گیا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر پی۔ جے مہتا کی کتاب "ہندوستانی اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبانیں بطور ذریعہ تعلیم" پر لکھی ہے۔

اور جو مختلف قوموں کے یہودی باہمی تعلقات کے لیے استعمال کرتے تھے۔
لیکن ایک وسطی اور مشرقی یورپ کا یہودی اپنی بڑی توہین محسوس کرے گا اگر اس کی مادری زبان کے متعلق یہ رائے ظاہر کی جائے۔ اگر یہ یہودی علمار ایک نسل کے اندر اپنے عوام کو ایک ایسی زبان دینے میں کامیاب ہو سکے ہیں جس پر وہ فخر کر سکتے ہیں تو یقیناً ہمارے لیے یہ اس سے زیادہ آسان کام ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی دیسی زبانوں کی ضرورتوں کو پورا کریں جو مہذب زبانیں ہیں۔ جنوبی افریقہ سے بھی ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔ وہاں بھی تال جو ڈچ زبان کی ایک بگڑی ہوئی شکل تھی اور انگریزی زبان میں ایک طرح کی جنگ تھی۔ بوئر مائیں اور بوئر باپ اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ وہ اپنے بچوں کو جن سے وہ تال زبان میں باتیں کیا کرتے تھے انگریزی کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہ ہونے دیں گے۔ یہاں انگریزی کا معاملہ ذرا مضبوط تھا۔ اس کے لایق وکلار موجود تھے۔ لیکن انگریزی کو بوئر لوگوں کی حب وطن کے آگے جھکنا پڑا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے اعلیٰ ڈچ کو بھی ٹھکرا دیا۔ اس لیے اسکول کے اساتذہ جو یورپ کی شستہ ڈچ بولنے کے عادی تھے، آسان تال سکھانے پر مجبور ہوئے اور آج جنوبی افریقہ میں اسی تال زبان میں ایک اعلیٰ درجہ کا ادب نشو و نما پا رہا ہے جو چند سال پہلے سیدھے سادے لیکن جوانمرد دیہاتیوں کی ایک عام زبان تھی۔ اگر ہم نے اپنی دیسی زبانوں پر اعتقاد کھو دیا ہے، تو یہ خود اپنے اوپر اعتقاد کھونے کی علامت ہے، یہ انحطاط کا سب سے یقینی ثبوت ہے۔ اور حکومت خود اختیاری کی کوئی اسکیم جو کتنی ہی فیاضی اور دریا دلی سے ہم کو عطا کی گئی ہو، ہمیں کبھی خود مختار قوم نہیں بنا سکتی ہے، اگر ہم ان زبانوں کا احترام نہ کریں جو ہماری مائیں بولتی ہیں۔ (ماخوذ از "مہاتما گاندھی کی تقریریں اور تحریریں")۔

بدیسی ذریعہ تعلیم کی لعنت

دیسی زبانوں کے ذریعہ تعلیم دیے جانے کی جو پُرزور حمایت نواب مسعود جنگ بہادر ڈائرکٹر تعلیمات ریاست حیدرآباد نے ابھی حال میں عثمانیہ یونیورسٹی کے خطبہ میں کی ہے، اس کا جواب "ٹائمس آف انڈیا" میں نکلا ہے، جس سے ذیل کا حصہ ایک دوست نے مجھے جواب دینے کے لیے بھیج دیا ہے:-

" ان کی تحریروں میں جو قابل قدر اور مفید باتیں ہیں، وہ براہ راست یا بالواسطہ مغربی تہذیب کا نتیجہ ہیں ..... بجائے سائنس کے ہم ایک سو برس پیچھے جا سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ راجہ رام موہن رائے سے لے کر مہاتما گاندھی تک ہر ایک ہندوستانی نے جس نے کسی شعبہ میں بھی کوئی چیز قابل ذکر حاصل کی ہے، وہ سب براہ راست یا بالواسطہ مغربی تعلیم کا ثمرہ ہیں'

اس اقتباس میں جو اظہار خیال کیا گیا ہے، وہ ہندوستان میں انگریزی کی قدر بہ حیثیت اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ کے نہیں پیش کی گئی ہے بلکہ جن اشخاص کے نام لیے گئے ہیں ان پر مغربی تہذیب کی اہمیت اور اثر بیان کیا گیا ہے نہ تو نواب صاحب نے اور نہ کسی اور نے کبھی مغربی تہذیب کی اہمیت اور اثر پر شبہ کیا ہے۔ جس بات کو بُرا منایا گیا ہے وہ ہندوستانی یا مشرقی تہذیب کی مغربی تہذیب کی قربان گاہ پر قربانی ہے۔ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ

مغربی تہذیب مشرقی تہذیب سے اعلیٰ اور ارفع ہے تو یہ بہ حیثیت مجموعی ہندستان کے لیے بہت نقصان دہ ہوگا کہ اس کے ہونہار بیٹے اور بیٹیوں کی مغربی تہذیب میں پرورش ہو اور اس طرح ان کا تعلق اپنی تہذیب اور اپنی قوم سے ٹوٹ جائے۔

میری رائے میں جن لوگوں کا ذکر اقتباس مذکور میں آیا ہے، ان کا خواہ کتنا ہی اچھا اثر بہ حیثیت مجموعی لوگوں پر پڑا ہو، وہ مغربی تہذیب کے خراب اثر کے باوجود مشرقی تہذیب کا جو اثر ان پر باقی رہ گیا تھا، یہ اس کا نتیجہ تھا۔ میں اس مسئلہ میں مغربی تہذیب کے اثر کو برا اس حد تک کہتا ہوں، جس حد تک کہ اس نے مشرقی تہذیب کے بہترین اثرات کو ان پر نہ پڑنے دیا ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نے اگرچہ مغربی تہذیب کے احسانات کا نہایت کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، پھر بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ جو تھوڑی بہت خدمت میں نے اپنی قوم کی انجام دی ہے، وہ مشرقی تہذیب کے اس حصہ کے باقی رکھنے کا نتیجہ ہے جو ممکن ہو سکتا تھا۔ میں عوام کے لیے ایک انگریز نما ہندوستانی کی حیثیت سے بالکل بے کار ثابت ہوتا جو نہ ان کے عادات واطوار اور افکار و خیالات سے واقف ہوتا بلکہ ان کی پرواہ بھی نہ کرتا اور انھیں ذلیل و حقیر سمجھتا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس قوم کی طاقت کا کتنا نقصان ہوا ہوگا جس کے بچے ایک ایسی تہذیب کے اثرات کا مقابلہ کرنے پر مجبور رہتے جو بذاتِ خود خواہ کتنی ہی اچھی ہو لیکن ان کے لیے ناموزوں تھی اور جس کو انھوں نے اچھی طرح قبول نہ کیا ہو اور وہ ان میں پوری طور پر جذب نہ ہوئی ہو۔

اس مسئلہ کو امتزاج کے نقطۂ نظر سے دیکھیے۔ کیا چیتنیہ، نانک، کبیر، تلسی داس ۔ ۔ ۔ وغیرہ مصلحین اس سے بہتر ہوتے اگر وہ اپنے بچپن سے ان

اچھے انگریزی اسکولوں سے وابستہ ہوتے؟ کیا ان لوگوں نے جن کا نام مضمون نگار نے لیا ہے، ان بڑے بڑے معلمین سے کچھ بہتر کام کیا ہے؟ کیا دیانند نے اگر کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کر لیا ہوتا تو اس سے بہتر ہوتے؟ ان عیش و آرام میں پلے ہوئے انگریزی پڑھنے والے راجاؤں اور مہاراجاؤں میں جو بچپن سے مغربی تہذیب کے اثر میں پلے ہیں، ایک بھی ایسا ہے جس کا نام شیواجی کے ساتھ لیا جا سکے جس نے طرح طرح کے خطرات کا مقابلہ کیا اور اپنی جفاکش قوم کی سادہ زندگی بسر کرتا رہا؟ کیا وہ پرتاپ مہارانا سے بھی بہتر حکمراں ہیں؟ کیا وہ مغربی تہذیب کے بھی اچھے نمونے ہیں۔ یہ ہیروڈ[1] جو لندن اور پیرس میں عیش اڑا رہے ہیں جبکہ ان کے روم میں آگ لگی ہوئی ہے۔ ان کی تہذیب میں کوئی چیز قابل فخر نہیں جس نے انھیں اپنے دیس میں بدیسی بنا دیا ہے اور جس نے اپنی رعایا کی گاڑھے پسینہ کی کمائی اور اپنی روح دونوں کو عیش میں برباد کرنا سکھایا ہے بجائے اس کے کہ وہ ان لوگوں کی رنج و خوشی میں شریک ہوتے جن پر حکومت کرنے کے لیے کسی اعلیٰ اقتدار نے انھیں مقرر کیا ہے۔

لیکن اصل مسئلہ مغربی تہذیب کا نہیں، بلکہ اصل سوال ذریعہ تعلیم کا ہے۔ اور یہ بات کہ ہم نے اعلیٰ تعلیم بلکہ تعلیم ہی انگریزی کے ذریعہ پائی ہے، اس جرم کے ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ کسی قوم کے نوجوانوں کی ایک قوم رہنے کے لیے ان کی تمام تعلیم بشمول اعلیٰ تعلیم ان کی دیسی زبان یا زبانوں میں ہونی چاہیے۔ یقیناً یہ ایک بدیہی امر ہے کہ کسی قوم کے نوجوان اپنے عوام سے نہ تو زندہ تعلق قائم کر سکتے ہیں اور نہ باقی رکھ

---

[1] ہیروڈ تیسری صدی قبل مسیح میں ایک رومن قنصل تھا جس نے یروشلم کے خلاف چڑھائی کی تھی۔ (مرتب)

سکتے ہیں جب تک ان کا علم کسی ایسی زبان کے ذریعہ نہ حاصل ہوا ہو جسے لوگ بھی سمجھتے ہوں۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کسی قوم کے اس عظیم نقصان کا جس کے ہزاروں نوجوانوں کو ایک غیر ملکی زبان اور اس کے محاوروں کو حاصل کرنے میں سالہا سال ضائع کرنے پڑتے ہیں جن کا ان کی زندگی میں کوئی کام نہیں پڑتا اور جن کے حصول میں انھیں خود اپنی مادری زبان اور اپنا ادب پس پشت ڈالنا پڑتا ہے۔ اس سے بڑھکر اور کوئی توہم نہیں ہو سکتا کہ کوئی زبان ترقی کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی یا مجرد اور سائنٹفک خیالات کے اظہار کے قابل ہی نہیں ہے۔ زبان اپنے بولنے والوں کی سیرت اور ترقی کا صحیح عکس ہوتی ہے۔

بدیسی حکومت کی ان بہت سی خرابیوں میں ایک بدیسی زبان کا ملک کے نوجوانوں پر زبردستی تھوپا جانا تاریخ کا سب سے بڑا گناہ شمار کیا جائے گا۔ اس نے قوم کے خون کو چوس لیا ہے، اس نے طلبا کی زندگیوں کو گھٹا دیا ہے، اس نے ان کو اپنے عوام سے بے گانہ بنا دیا ہے، اس نے تعلیم کو غیر ضروری طور پر مہنگی کر دی ہے۔ اگر یہ عمل اب بھی جاری رہتا ہے تو یہ قوم کو اس کی روح سے بھی محروم کر دے گا۔ اس لیے تعلیم یافتہ ہندوستان جتنی بھی جلد اس بدیسی زبان کے تسلط سے باہر آتا ہے، اسی قدر اس کے لیے اور دوسرے لوگوں کے لیے بہتر ہوگا۔

(ینگ انڈیا، ۵ رجولائی ۱۹۲۸ء)

مادری زبان کو نہ بھولو

میں اپنے گھر کے لیے یہ نہیں چاہتا کہ اس کے چاروں طرف دیواریں ہی دیواریں ہوں اور کھڑکیاں ہر طرف سے بند ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے مکان کے چاروں طرف مختلف ملکوں کی تہذیبوں کی ہوائیں نہایت آزادی سے چلیں، لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ ان میں سے کوئی تہذیب مجھے بہالے جائے۔ میں دوسرے لوگوں کے مکانوں کے اندر ایک غاصب، ایک بھکاری یا ایک غلام کی طرح رہنا نہیں چاہتا۔ میں اپنی بہنوں پر بے جا غرور یا ناجائز سماجی فائدے کے لیے انگریزی پڑھنے کا غیر ضروری بار ڈالنا نہیں چاہتا۔ میں چاہوں گا کہ ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جنھیں ادبی مذاق ہے، وہ جتنی انگریزی اور دوسری دنیا کی زبانیں سیکھنی چاہیں، سیکھیں اور پھر اپنی اس تحصیل کے فوائد ہندوستان کو اور دنیا کو اس طرح پہنچائیں جس طرح بوس، رے یا خود شاعر نے پہنچایا ہے۔ مگر میں چاہوں گا کہ ایک ہندوستانی بھی اپنی مادری زبان کو نہ بھولے، نہ اسے نظر انداز کرے اور نہ اس پر شرمائے یا یہ محسوس کرے کہ وہ اپنی دیسی زبان میں اپنے بہترین خیالات ظاہر نہیں کر سکتا ہے۔ میرا مذہب قید خانہ کا مذہب نہیں ہے۔ اس میں خدا کی ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کے لیے جگہ ہے لیکن اس پر نخوت، نسلی غرور، مذہب یا رنگ کا کوئی اثر نہ ہو۔

(ینگ انڈیا، یکم جون ۱۹۲۱ء)

دوسری زبانوں سے ترجمے

اپنے مردوں اور عورتوں سے اس درخواست کرتے ہیں کہ وہ انگریزی کے پڑھنے پر اس سے کم وقت دیں جتنا وہ دے رہے ہیں، میرا منشا انھیں اس لطف سے محروم کرنا نہیں ہے جو انھیں اس سے حاصل ہو سکتا ہے، بلکہ میرا یہ کہنا ہے کہ وہی لطف اس سے کم قیمت اور کم زحمت میں حاصل کیا جا سکتا ہے، اگر ہم زیادہ فطری طریقہ اختیار کریں۔ دنیا کتنے ہی بیش قیمت جواہرات سے بھری ہوئی ہے، لیکن یہ تمام جواہرات انگریزی ہی میں نہیں ہیں۔ دوسری زبانیں بھی ایسی تخلیقات کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔ یہ تمام تخلیقات عام لوگوں کی دسترس میں آنی چاہئیں اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب ہمارے اپنے علما ہمارے لیے ہماری زبانوں میں ان کے ترجمے کر کے لے آئیں۔

("مہاتما گاندھی کی تقریریں و تحریریں" صفحہ ۴۲۶-۲۸

۲۰ فروری ۱۹۲۸ء)

چوتھا باب

تعلیم اور طلبا

طلبا سے خطاب

گاندھی جی نے ۱۹۱۷ء میں بہار کے طلبا کی ایک کانفرنس کے سامنے جو بھاگلپور میں منعقد ہوئی تھی، بہت سی مفید باتیں کہی تھیں:- سب سے پہلے تو انہوں نے انہیں مبارکباد دی کہ انھوں نے کانفرنس کی تمام کارروائی علاقائی زبان میں رکھی تھی جو ہندوستان کی قومی زبان بھی ہے۔ پھر اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ

مادری زبان پر توجہ

ہم نے اپنی مادری زبان کو چھوڑ رکھا ہے اور اس کی عزت نہیں کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں اس گناہ کا بڑا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ اس نے ہمارے اور ہمارے گھر والوں کے درمیان ایک دیوار سی کھڑی کر دی ہے۔ جو لوگ اس کانفرنس میں شریک ہیں، وہ اس کی شہادت دیں گے۔ ہم جو کچھ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھتے ہیں، وہ ہم اپنی ماؤں تک نہیں پہنچا سکتے ہیں۔ ہم اس علم کو جو ہم سیکھتے ہیں، ان لوگوں میں نہیں پھیلا سکتے جو ہمارے گھروں میں ہیں۔ یہ افسوسناک بات انگلستان میں یا اور دوسرے ملکوں میں نہیں ہوتی ہے جہاں تعلیم مادری زبان کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ طلبا جب گھر لوٹتے ہیں تو وہ اپنے والدین سے وہ سب باتیں کہتے ہیں جو وہ اسکولوں میں سیکھتے

ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ علم نوکروں اور گھر کے دوسرے لوگوں تک بھی پہنچا ہے۔
اسی طرح دوسرے لوگ بھی، مثلاً جو مدرسوں میں سیکھتے ہیں، اس سے فائدہ
اٹھاتے ہیں۔ لیکن ہم جو کچھ سیکھتے ہیں، وہ سب اسکولوں میں رہیں یہ رہیں
چھوڑ کر آتے ہیں۔ علم بھی ہوا کی طرح ہوتا ہے۔ جس کے پھیلنے میں دیر نہیں
لگتی۔ لیکن جس طرح ایک بخیل اپنی دولت زمین میں چھپائے رکھتا ہے،
اسی طرح ہم بھی اپنے علم کو اپنے ہی تک محدود رکھتے ہیں اور اس کے
نفع کو دوسروں تک نہیں پہنچنے دیتے۔ مادری زبان کے ساتھ بے توجہی کرنا
ایسا ہی قابل ملامت ہے جیسے ماں کے ساتھ بے عزتی کرنا۔ جو مادری
زبان کے ساتھ بے عزتی کرتا ہے، وہ محب وطن کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔
بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زبانیں اس قابل نہیں کہ ان میں گہرے
اور نازک خیالات ادا کئے جا سکیں۔ لیکن یہ زبان کا قصور نہیں۔ زبان کو
بنانا اور ترقی دینا ان لوگوں کا کام ہے جو اس زبان کو بولتے ہیں۔ ایک
زمانہ تھا جب انگریزی بھی بہت کم مایہ تھی۔ اس نے ترقی کی اس لیے کہ ان
لوگوں نے ترقی کی جو اس کے بولنے والے تھے اور اپنی زبان کو ترقی دینے
کی کوشش کی۔ اگر ہم اپنی زبان کو ترقی نہ دیں اور اس خیال کو بیٹھے
رہیں کہ صرف انگریزی ہی اعلیٰ خیالات کے اظہار کی اور انھیں دوسروں
تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ ہم ہمیشہ غلام
کے غلام رہیں گے۔ جب تک ہماری زبان ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے
کی صلاحیت پیدا نہیں کرتی اور اپنے اندر مختلف علوم کا خزانہ اکٹھا نہیں
کرتی، اس وقت تک ہماری قوم کو وہ جدید علم نہیں حاصل ہو سکتا ہے جو
اس کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ضروری ہے۔ اتنی بات صاف ظاہر ہے کہ :-

۱۔ ہماری قوم کو نئے علم کی ضرورت ہے۔

۲۔ ہماری پوری قوم کبھی انگریزی زبان پر کافی قدرت نہیں حاصل کر سکتی ہے۔

۳۔ اور اگر ایک انگریزی تعلیم یافتہ شخص ہی وہ نیا علم حاصل کر سکتا ہے، تو پھر پوری قوم کو کبھی اس کی امید نہ رکھنی چاہیے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر پہلی دونوں باتیں صحیح ہیں تو پھر عوام کے لیے کوئی امید نہیں اور وہ ہمیشہ کے لیے جہالت میں پڑے رہیں گے۔ لیکن قصور ہماری زبانوں کی بے مائیگی کا نہیں ہے۔ تلسی داس اپنے اعلیٰ جذبات کا اظہار ہندی میں کر سکتے تھے۔ دنیا کی بہت کم کتابیں ہوں گی جو وسعت یا گہرائی میں ان کی رامائن کے برابر رکھی جا سکتی ہیں۔ پنڈت مدن موہن مالویہ جیسے محب وطن جنھوں نے ہمارے ملک کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے، انھیں ہندی میں اپنے خیالات ظاہر کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے۔ ان کی انگریزی اگر چاندی کی طرح ہے تو ان کی ہندی سونے کی مثل ہے۔ میں نے کتنے مولانا صاحبان کو سنا ہے جو اپنی تمام مذہبی تقریریں اور عالمانہ مذہبی خیالات نہایت آسانی کے ساتھ اپنی مادری زبان میں ادا کرتے ہیں۔ سنت تلسی داس کی زبان تو اپنے درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے اور وہ لافانی ہے۔ اگر ہم اس زبان میں اپنے خیالات ظاہر نہیں کر سکتے ہیں تو قصور ہمارا ہے۔ ایسا نہ کر سکنے کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ ہمارا ذریعہ انگریزی ہے، جو ایک غیر ملکی زبان ہے۔ اس مہلک مرض کو دور کرنے کے لیے ہم سب کو کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ طلبا کو اس معاملہ

میں اپنے جذبات سے حکومت کو مطلع کر دینا چاہیے۔ علاوہ اس کے ایک اور بات ہے جو وہ کر سکتے ہیں۔ وہ جو کچھ اسکولوں میں پڑھتے ہیں، انھیں ہندی میں ترجمہ کر لینا چاہیے اور اس علم کو اپنے گھروں میں، دوسروں تک پہنچا دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ وہ عہد کر سکتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے گفتگو میں صرف اپنی مادری زبان کا استعمال کریں گے۔ میں ایک بہاری کو دوسرے بہاریوں سے انگریزی میں خط و کتابت کرتے کبھی نہیں پا سکتا ہوں۔ میں نے ہزاروں انگریزوں کو ایک دوسرے سے بات چیت کرتے دیکھا ہے۔ وہ اور زبانیں بھی جانتے ہیں لیکن میں نے انھیں کوئی غیر زبان اپنے درمیان استعمال کرتے نہیں سنا ہے۔ انگریزی زبان کا جس طرح ہم اپنے درمیان استعمال کرتے ہیں، اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔

ویدانت کے ایک شاعر نے کہا ہے کہ تعلیم بغیر سوچنے کی صلاحیت کے بے کار ہے لیکن جو اسباب اوپر بیان کیے گئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبا میں خود سوچنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہے۔ ان میں اب کوئی قوت اور جرأت باقی نہیں رہی ہے۔ ان میں جستجو اور آگے بڑھنے کا مادہ بھی نہیں رہا ہے۔ اور اکثر ان میں بے پروا اور لا اُبالی نظر آتے ہیں۔

میں انگریزی سے نفرت نہیں کرتا ہوں، اس لیے کہ اس میں اچھے ادب کا ایک لامحدود خزانہ ہے۔ حکمرانوں کی زبان ہونے کی حیثیت سے یہ حکومت کی زبان بن گئی ہے اور علم کی دولت سے مالا مال ہے۔ لیکن پھر بھی میں ہر ہندوستانی کے لیے اس کا سیکھنا ضروری نہیں سمجھتا ہوں لیکن اس مسئلے کے بارے میں میں اس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ ہمارے

بچے انگریزی اس لیے پڑھتے ہیں کہ بہ حالات موجودہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اس لیے میں اب اس اہم مسئلہ پر اس سے زیادہ نصیحت نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف یہ کہوں گا کہ ایک دوسرے کے ساتھ معاملات میں اور جب بھی ممکن ہو لوگوں کو صرف اپنی مادری زبان استعمال کرنی چاہیئے۔ طلبا کے علاوہ دوسرے بھی ہمارے ملک میں مادری زبان کو تعلیم کا ذریعہ بنانے میں مدد دے سکتے ہیں۔

تعلیم کا مقصد

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، بہت سے طلبا بے پروا اور لا اُبالی نظر آتے ہیں۔ اکثر نے مجھ سے پوچھا ہے کہ وہ اپنی اس سستی پر غالب آنے اور ملک کی خدمت کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ وہ اپنی روزی کمانے کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ کے بارے میں انھیں فکر و تردد ہے۔ لیکن ان سوالات کا جواب دینے سے پیشتر یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ کسی نے کہا ہے کہ تعلیم کا مقصد سیرت کی تعمیر ہے۔ ہمارے رشیوں نے بھی بتایا ہے کہ ویدوں اور شاستروں کے علم کے باوجود اگر انسان اپنے کو نہیں پہچانتا اور اس میں خود کو تمام قیود سے آزاد ہونے کی طاقت پیدا نہیں ہوئی ہے تو اس کا علم بے کار ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جس نے خود کو جان لیا، اس نے سب کچھ جان لیا۔ خود کا علم بغیر کسی ادبی تعلیم کے بھی ممکن ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ایک بن پڑھے لکھے انسان تھے۔ حضرت مسیح بھی کسی مدرسے میں نہیں گئے تھے۔ لیکن یہ بڑی بے ادبی ہوگی اگر ہم یہ

سمجھیں کیا ان بزرگوں کو اپنی ذات کا علم نہیں تھا۔ اگرچہ انھوں نے کوئی امتحان پاس نہیں کیا تھا، پھر ہم ان کا اس قدر احترام کرتے ہیں اور ان کے آگے سر نگوں کرتے ہیں۔ ان کو علم کے تمام فوائد حاصل تھے۔ وہ ایک طرح کے 'مہاتما' تھے یعنی روحانیت میں درجہ کمال رکھتے تھے۔ لیکن ہم ان کی تقلید بغیر سوچے سمجھے نہیں کر سکتے۔ اگر ہم اسکول جانا چھوڑ دیں، اس لیے کہ وہ کبھی اسکول نہیں گئے، تو ہم راہ سے بے راہ ہو جائیں گے۔ لیکن ہم جو کچھ ان سے سیکھ سکتے ہیں وہ یہ کہ ذات کا علم صرف ایک اچھی سیرت کی تعمیر کے ذریعہ بنا ہو سکتا ہے۔ سیرت کیا ہے؟ ایک اچھی سیرت کی علامتیں کیا ہیں؟ ایک اچھی سیرت کا شخص، صداقت، عدم تشدد، ضبطِ نفس (برہمچریہ)، ترکِ دنیا، دیانت، بے خوفی اور دوسرے اس قسم کی قیود کی پابندی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ لیکن حق کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ وہ خود مرنے کے لیے تیار رہتا ہے لیکن مارنے کے لیے نہیں۔ وہ خود تکلیف اٹھائے گا لیکن دوسروں کو تکلیف نہیں دے گا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ دوست بن کر رہ سکتا ہے لیکن اس پر لالچ کی نگاہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس طرح ایک اچھی سیرت کا آدمی ضبطِ نفس کا عامل ہوتا ہے اور اپنے جسم کی قوت کو محفوظ رکھتا ہے۔ وہ کسی کا مال نہیں چراتا، نہ وہ رشوت لیتا ہے۔ وہ نہ اپنا وقت بیکار ضائع کرتا ہے اور نہ دوسروں کا۔ وہ بے وجہ روپے نہیں جمع کرتا۔ وہ عیش و آرام کا طالب نہیں ہوتا اور بے کار چیزیں محض خیالی لذتوں کے لیے استعمال نہیں کرتا، بلکہ ایک سادہ زندگی پر قانع رہتا ہے۔ وہ اپنے عقیدہ میں اس بات پر قائم رہتے ہوئے کہ میں غیر فانی روح ہوں، نہ کہ فانی جسم، اور کبھی کوئی روح کو فنا نہیں کر سکتا، وہ تمام خوف اپنے

دل سے نکال دیتا ہے اور بڑے بڑے شہنشاہ کے آگے بھی اپنا سر خم نہیں کرتا اور بے خوفی کے ساتھ اپنے فرائض بجا لاتا ہے۔

اگر ہمارے اسکولوں سے یہ نتائج نہیں نکلتے ہیں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں، تو طلبا، نظام تعلیم اور اساتذہ تینوں کو اس الزام میں شریک سمجھنا چاہیے۔ لیکن اپنی سیرت میں ان کمیوں کا پورا کرنا طلبا کے اپنے ہاتھ میں ہے، اس لیے کوئی دوسرا ان کی بجائے نہیں کر سکتا۔ اس لیے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ہمیں سب سے پہلے تعلیم کے مقصد کو سمجھنا چاہیے۔ ایک طالب علم جو اپنی سیرت کی تعمیر و تشکیل کرنا چاہتا ہے، وہ اس مضمون پر کوئی اچھی کتاب پڑھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتی ہے؟

خالق کائنات نے اس دنیا میں ہر چیز کو اچھائی اور برائی کا مرکب بنا کر پیدا کیا ہے۔ لیکن ایک اچھا آدمی اس میں سے اچھائی لے لیتا ہے اور برائی چھوڑ دیتا ہے جس طرح کہ بطخ پانی میں سے اوپر اوپر کی بالائی تو کھا لیتی ہے اور پانی چھوڑ دیتی ہے۔

تلسی داس، رام کے اس قدر عاشق تھے کہ انھیں کرشن میں بھی وہی نظر آتے تھے۔ ہمارے بہت سے طلبا عیسائی اسکولوں میں انجیل کے گھنٹے میں شریک ہوتے ہیں لیکن وہ انجیل کی تعلیم سے کوئی اثر نہیں لیتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص گیتا اس نیت سے پڑھتا ہے کہ اس کی تعلیم میں عیب نکالے، لیکن جو شخص گیتا اپنی نجات کے لیے پڑھتا ہے، اسے وہ راستہ دکھائی دے سکتا ہے۔ بعض لوگوں کو قرآن پاک میں خامیاں ہی نظر آسکتی ہیں لیکن دوسرے اسے پڑھ کر اور عمل کر کے اس دنیا کا سارا راستہ طے کر لیتے ہیں۔ اگر ہم مسئلہ کو اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو ہم پائیں گے

کہ ہم ایک چیز کو جس طرح دیکھتے ہیں اسی کے مطابق اس کا نتیجہ نکلتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بہت سے طلبا اس بات کا مطلق خیال نہیں رکھتے کہ تعلیم کا اصل مقصد کیا ہے؟ وہ اسکول صرف اس لیے جاتے ہیں کہ انہیں اسکول جانا ہے۔ بعض اسکول اس غرض سے جاتے ہیں کہ بعد میں انہیں نوکری ملے گی۔ میرے خیال میں تعلیم کو روزی کا ذریعہ قرار دینا ایک بہت ادنیٰ درجہ کی بات ہے۔ انسان جسم کے ذریعہ روزی کما سکتا ہے لیکن اسکول ایک ایسی جگہ ہے جہاں سیرت بنتی ہے۔ اسکول کو جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ خیال کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک ٹکڑا چمڑے کے لیے پورے بھینسے کو ذبح کیا جائے۔ جسم کو جسمانی کام کر کے درست رکھا جا سکتا ہے لیکن آتما یعنی روح کو اس کام کے لیے کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے؟ انسان پسینہ بہا کر اپنی روٹی کماتا ہے یہ حضرت مسیحؑ کا ایک بہت مشہور قول ہے۔ گیتا بھی یہی کہتی ہے۔ اس دنیا میں ۹۹ فیصد آدمی اس اصول پر چلتے ہیں اور انہیں کوئی ڈر نہیں ہوتا۔ ایک بہت صحیح کہاوت ہے کہ جس نے دانت دیئے ہیں وہ کھانے کو بھی دے گا۔ لیکن یہ کہاوت کاہل اور نکمے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ طلباء کو شروع سے ہی یہ سمجھنا چاہیے کہ انہیں اپنی روزی محنت کر کے کمانا ہے اور پھر انہیں ہاتھ کے کام سے شرمانا نہیں چاہیے۔ میرا مطلب اتنا کہنے سے یہ نہیں ہے کہ ہمیں ہمیشہ پھاوڑا چلانا ہے۔ لیکن یہ سمجھنا ضروری ہے کہ روزی کے لیے پھاوڑا چلانا پڑے تو کوئی بری بات نہیں ہے۔ خواہ اس کا اپنا ذریعہ معاش کچھ اور ہی کیوں نہ ہو اور محنت مزدوری کرنے والے ہم سے کم تر درجہ نہیں ہیں۔ اگر ہم یہ اصول بطور ایک نصب العین کے تسلیم کر لیں، بلا لحاظ اس کے کہ ہم نے اپنی معاش کے لیے کیا ذریعہ اختیار

کیا ہے، تو ہم اپنے کاموں کو ایمانداری اور دل چسپی کے ساتھ کریں گے۔ ہم دولت کے غلام نہ بنیں گے بلکہ دولت ہماری غلام ہوگی۔ اگر یہ رائے جو ظاہر کی گئی ہے، طلبا کو پسند ہے تو انھیں جسمانی کام کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ میں نے یہ چند باتیں ان لوگوں کے خیال سے کہی ہیں جو تعلیم کو روزی کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔

طلبا جو بغیر کسی تعلیم کے مقصد کو سمجھے ہوئے اسکول جاتے ہیں، سب سے پہلے انھیں اس کا مقصد جاننا چاہیے۔ اسے آج ہی سے یہ ارادہ کر لینا چاہیے کہ وہ اسکول کو ایک ایسی جگہ سمجھے گا جہاں سیرت کی تعمیر ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک ایسا طالب علم ایک مہینہ کے عرصہ میں اپنے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر لے گا کہ اس کے ساتھی اس بات کی گواہی دیں گے۔ ہمارے شاستر کہتے ہیں کہ ہم جیسا سوچتے ہیں ویسا بنتے ہیں۔

بہت سے طلبا یہ سمجھتے ہیں کہ جسم کا خیال کچھ ضروری نہیں ہے، یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ جسم کے لیے مستقل ورزش نہایت ضروری ہے۔ ایک ایسے طالب علم سے کیا امید کی جا سکتی ہے جس کے پاس جسم کی دولت نہیں ہے۔ جس طرح دودھ ایک کاغذ یا گتے کے ڈبے میں عرصہ تک نہیں ٹھہر سکتا ہے، اسی طرح تعلیم ہمارے طلبا کے کاغذ جیسے ملائم اور نازک جسم میں زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتی ہے۔ جسم روح کا گھر ہے، اس لیے مقدس ہے۔ ہمیں اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ صبح اور اس کے بعد شام کو پابندی کے ساتھ اور تیزی سے ٹہلنا جسم کو تندرست اور دماغ کو تازہ رکھتا ہے۔ اس طرح یہ وقت صرف کرنا بے کار ضایع کرنا نہیں ہے۔ ورزش اور آرام سے جسم اور دماغ دونوں مضبوط ہوتے ہیں۔ جس سے ایک طالب علم جلد سیکھ

سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان جیسے غریب ملک کے لیے ہاکی اور کرکٹ جیسے خرچیلے کھیل مناسب نہیں۔ ہمارے ہاں خود بھی بہت سے دلچسپ اور کم خرچ کھیل موجود ہیں۔

طالب علم کی روزمرہ زندگی بھی بہت اچھی ہونی چاہیے۔ جس کا دماغ پاک اور صاف ہو، وہی اصل خوشی کا لطف اٹھا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے دنیاوی خوشیوں کا لطف اٹھانے کے لیے کہنا، اسے اس کی اصل خوشی سے محروم کرنا ہے جس نے اوپر اٹھنے کا ارادہ کر لیا ہے، وہ اوپر اٹھے گا۔ رام چندر نے چاند مانگا اور وہ انہوں نے پا لیا اس لیے کہ ان کا دماغ پاک اور صاف تھا۔

ایک طرح سے دیکھیے تو دنیا ایک خواب و خیال نظر آتی ہے، دوسری طرف دیکھیے تو حقیقی اور ٹھوس ہے۔ طلبا کو اسے حقیقی ہی سمجھنا چاہیے اس لیے کہ انھیں اپنی طاقتوں کو انسانی بھلائی کے لیے صرف کرنا ہے اور اس دنیا میں بڑے بڑے بہادری کے کام کرنے ہیں۔ جو شخص بغیر اصل حقیقت تک پہنچے دنیا کو بے حقیقت کہتا ہے اور اسے ترک کر دیتا ہے، اور پھر وہ اخلاقی قوانین کو پس پشت ڈال کر جو جی چاہتا ہے، سو کرتا ہے، وہ جھنجی نہیں ہے بلکہ وہ ایک برخود غلط آدمی ہے اگرچہ وہ سنیاسی ہی کیوں نہ ہو۔

دھرم یا مذہب

اب میں دھرم یا مذہب پر آتا ہوں۔ جہاں دھرم نہیں وہاں علم،

دولت، صحت وغیرہ کچھ بھی نہیں ہو سکتی ہے۔ جہاں 'دھرم' نہ ہو، وہاں زندگی بالکل بے کار ہے۔ وہاں کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں 'دھرم' سکھانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ بے دولھے کی بارات ہے۔ طلبار بغیر 'دھرم' کے علم کی سچی خوشی کا لطف نہیں اٹھا سکتے۔ اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ شاستروں کا مطالعہ کیا جائے، ان کی تعلیمات پر غور کیا جائے اور سوچ سمجھکر عمل کیا جائے۔ ایک شخص صبح اٹھتے ہی سگریٹ پینا شروع کر دیتا ہے یا بے کار گپ شپ کرنے لگ جاتا ہے، اس سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ نظیر کہتا ہے کہ چڑیاں صبح شام خدا کے نام کا 'سمیرن' کرتی ہیں۔ لیکن ہم اپنا وقت سونے میں گنواتے ہیں۔ ہر طالب علم کا یہ فرض ہے کہ وہ جیسے ہو ویسے 'دھرم' کا علم حاصل کرے، خواہ یہ اسکول میں پڑھایا جائے یا نہ پڑھایا جائے۔ یہ میری درخواست ہے کہ طلبار اپنی زندگی میں 'دھرم' پر عمل کرنا شروع کر دیں۔ 'دھرم' اصل میں ہے کیا؟ اس کے متعلق علم سکھانے کے لیے کیا مقرون طریقہ ہو سکتا ہے؟ ہم وقت نہ ہونے کے خیال سے یہاں اس پر تفصیل سے بحث نہیں کر سکتے ہیں۔ پھر بھی میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ تم گیتا اور رامائن سمجھ کر پڑھو، تمہیں رامائن میں سچے موتی ملیں گے۔ ان کی تعلیمات پر عمل کرو۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ تمہیں دونوں کتابیں اس خیال سے پڑھنی ہیں کہ تم 'دھرم' کا گرھ پا سکو۔ جن رشیوں نے یہ کتابیں لکھیں، انہیں تاریخ لکھنے کا کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ صرف 'دھرم' اور 'نیتی' یعنی اخلاق کی تعلیم دینا چاہتے تھے۔ کروڑوں آدمی ان کی کتابوں کو پڑھتے ہیں اور اپنی زندگی ان کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ سچے اور صاف دل کے ساتھ انھیں پڑھتے

ہیں اور ان سے جو قوت اور مسرت حاصل ہوتی ہے، انھیں لیکر اس کی تلاوت مذہبی عقیدت کے ساتھ کرنی چاہیئے اور اس کے پیغام کو سمجھنا چاہیئے۔ میری یہ بھی خواہش ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کی مذہبی کتابیں عقیدت کے ساتھ مطالعہ کریں اور انھیں سمجھنے کی کوشش کریں، اس لیے کہ اس سے ایک فرقہ کے دوسرے فرقہ کے ساتھ بہتر تعلقات پیدا ہوں گے۔

طلباء کا سیاست میں حصہ

اس اہم سوال کے بعد اب میں ذرا دنیوی مسائل کی طرف آتا ہوں۔ مجھ سے اکثر دریافت کیا گیا ہے کہ آیا طلباء کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے یا نہیں۔ میں اس کے متعلق اپنی رائے بغیر دلیل کے ظاہر کر دوں۔ سیاست کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: ایک تو سیاست کا مطالعہ، دوسرا سیاسی عمل ہے۔ پہلا حصہ یقیناً طلباء کے لیے نہایت ضروری ہے، لیکن دوسرے میں قدم رکھنا ذرا خطرناک ہے۔ طلبا سیاسی جلسوں یا کانگریس کے اجلاس میں اس غرض سے شریک ہو سکتے ہیں کہ وہ فن سیاست سیکھیں، اس لیے کہ عملی سبق حاصل ہوگا۔ طلبا کو ایسے جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت کی پوری آزادی ہونی چاہیئے اور وہ پابندیاں ان پر سے ہٹا دی جائیں جو ابھی حال میں ان پر لگائی گئی ہیں۔ طلبا کو البتہ ان جلسوں میں تقریریں کرنے یا ان مسائل پر رائے دینے سے پرہیز کرنا چاہیئے جن میں ان پر بحث ہو رہی ہو۔ لیکن اگر ان کی تعلیم میں اس سے ہرج نہ ہوتا ہو تو

وہ بطور رضا کار بھی کام کر سکتے ہیں۔ کسی طالب علم کو مالوی جی کی خدمت کے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے اگر وہ اس طرح انجام دے سکتا ہو۔ البتہ طلبا کو جماعتی سیاست سے دور رہنا چاہیے۔ انھیں غیر جانبدار ہو کر رہنا چاہیے اور اس جماعت کا یا اس جماعت کا ساتھ نہیں دینا چاہیے اور تمام رہنماؤں کا بلا کسی امتیاز کے احترام کرنا چاہیے۔ یہ طلبا کا کام نہیں کہ وہ ان کی خوبیوں اور خامیوں پر بحث کریں اور یہ معلوم کریں کہ کون کس قدر بڑا اور اہم ہے اور کس قدر نہیں۔ طلبا کو صرف نیکیوں کی تلاش اور حصول کا خیال رکھنا ہے جہاں کہیں بھی وہ ملیں، انھیں نیکیوں کی پوجا کرنا سیکھنا چاہیے۔

بڑوں کی عزت

بڑوں کی عزت کرنا طلبا کا فرض ہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس کا خیال رکھنا چاہیے اور جب جب ممکن ہو ان کی نصیحتوں پر عمل کرنا چاہیے جس شخص نے دوسروں کی عزت کرنا نہیں سیکھا ہے، وہ ان سے اپنی عزت کی بھی امید نہیں رکھ سکتا ہے۔ گستاخی اور بے ادبی طلبا کے لیے زیبا نہیں۔ یہاں پر میں ایک بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو آج کے ہندوستان میں پیدا ہو رہی ہے۔ بڑے لوگ ان باتوں کا خیال نہیں رکھتے ہیں جس کی ان سے امید کی جاتی ہے۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اپنے طرز عمل اور طریق کار سے وہ نوجوان نسل کے لیے نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں طلبا کو کیا کرنا ہے؟ مجھے یہ امید ہوتی ہے کہ وہ دھرم کی روح اپنے

اندر پیدا کریں گے اور اسے ترقی دیں گے۔ جب انھیں ایک طرف دھرم اور دوسری طرف بڑوں کی عزت اور اطاعت کے درمیان تصادم سے سابقہ ہو تو انھیں پرہلاد کی مثال سامنے رکھنی چاہیے۔ ایسے حالات کے سامنے جو اس کے لیے نہایت ناگوار تھے، اس نے نہایت ادب کے ساتھ اپنے باپ کے حکم کو نہیں مانا۔ اسی طرح ہم بھی نہایت ادب کے ساتھ اگر حالات کا تقاضہ ہو تو اپنے بزرگوں کے احکامات کی بجا آوری سے انکار کر سکتے ہیں لیکن اس سے آگے کسی اور نامناسب رویہ کا اظہار غلط ہوگا۔ بڑوں کی عزت نہ کرنے سے جماعت تباہ ہو جاتی ہے۔ بڑوں کی عزت کا حق صرف عمر کی بنا پر ہی نہیں، بلکہ ان کے علم، تجربہ اور عقل کی بنیاد پر ہے۔ جہاں مؤخر الذکر باتیں نہ ہوں، وہاں صرف عمر پر دارومدار رہ جاتا ہے۔ لیکن ہر شخص صرف عمر کا پجاری نہیں ہوتا۔

ملک کی خدمت

ایک دوسرا سوال ہے اور وہ یہ کہ طلبا ملک کی خدمت کیسے کر سکتے ہیں؟ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انھیں نہایت محنت کے ساتھ علم حاصل کرنا چاہیے اور جس وقت کہ وہ علم حاصل کر رہے ہیں، انھیں اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے، اس لیے کہ ان دونوں چیزوں کی انھیں اپنے ملک کی خدمت کے لیے ضرورت ہوگی۔ اگر ایک طالب علم ان دونوں باتوں کا خیال رکھ رہا ہے تو وہ یقیناً اپنے ملک کی خدمت کر رہا ہے۔ ہم نہایت آسانی سے بہت سے مفید کام کر سکتے ہیں اگر ہم صرف ایک اچھی اور

کار آمد زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں۔ میں آپ سے ایک کام کے بارے میں کہوں گا جو آپ سب نہایت آسانی سے کر سکتے ہیں آپ نے میرا وہ خط اخبارات میں دیکھا ہوگا جو میں نے تیسرے درجے کے مسافروں کی دشواریوں کے بارے میں لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ میں سے اکثر تیسرے درجہ میں سفر کرتے ہوں گے آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ مسافر اکثر ریل کے ڈبوں میں تھوکتے ہیں، اکثر پان اور تمباکو کھاتے ہیں، نارنگیوں اور کیلوں کے چھلکے اور دوسری چیزیں ڈبے کے فرش پر پھینک دیتے ہیں، پاخانوں کا ٹھیک استعمال نہیں کرتے اور انھیں گندہ کرتے ہیں، وہ سگریٹ یا بیڑی بغیر دوسرے مسافروں کی سہولت کا خیال کئے پیتے رہتے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ جب آپ سفر کریں تو ان مسافروں کو سمجھائیں کہ یہ باتیں نہ صرف بدتہذیبی میں داخل ہیں بلکہ صحت کے اصول کے بھی منافی ہیں۔ آپ انھیں ان گندگیوں کے بُرے اثرات بھی بتا سکتے ہیں۔ اکثر مسافر طلبار کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور ان کی باتوں پر دھیان دیتے ہیں۔ اس طرح۔ ہمیں ان موقعوں کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے اور ہم اپنے عوام کو صحت کے اصول سکھا سکتے ہیں۔ اکثر کھانے پینے کی چیزیں جو اسٹیشنوں پر خوانچے والے بیچتے ہیں، گندی ہوتی ہیں۔ طلبار کا فرض ہے کہ وہ جب اس قسم کی گندگیاں دیکھیں تو اسٹیشن ماسٹر کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں۔ اور اس بات کا خیال رکھیں کہ اسٹیشن ماسٹر کو جو کچھ لکھنا ہے وہ ہندی میں لکھنا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ آپ کی اس درخواست کا خیال نہ کرے۔ لیکن جب اس کے پاس اکثر ایسے خطوط آئیں گے تو وہ خیال کرنے پر مجبور ہوگا۔ یہ کام بغیر کسی بڑی کوشش کے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے بڑے اہم نتائج نکلیں گے۔

پان تمباکو کا استعمال

میں نے اوپر پان کھانے اور تمباکو پینے کی عادت کا ذکر کیا ہے۔ میری رائے میں دونوں عادتیں مضر بھی ہیں اور گندی بھی۔ ہندوستانی مرد اور عورتوں کی بڑی تعداد ان عادتوں کی غلام ہو چکی ہے۔ ہمیں اس غلامی سے نجات پانا ہے۔ ایک اجنبی شخص جو ہندوستان آئے گا، وہ یقیناً محسوس کرے گا کہ ہم دن بھر منہ چلاتے رہتے ہیں۔ یہ بات ممکن ہے صحیح ہو کہ پان سے کھانے کے ہضم ہونے میں کچھ مدد ملتی ہے لیکن کھانا اگر صحت کے اصول کے مطابق کھایا جائے تو بغیر کسی بیرونی امداد کے ہضم ہو جاتا ہے۔ علاوہ اس کے پان میں کوئی خوشگوار مزہ بھی نہیں۔ اور تمباکو کھانا بھی اسی کے ساتھ ساتھ ختم کر دینا چاہیے۔ طلبا کو ہمیشہ ضبط نفس سے کام لینا چاہیے۔ سگریٹ پینے کا مسئلہ ذرا مشکل ہے اس معاملے میں ہمارے حکمرانوں نے ایک غلط مثال قائم کی ہے اور بغیر وقت اور جگہ کا لحاظ کئے سگریٹ پیتے رہتے ہیں۔ ہم نے اسے ایک فیشن سمجھ لیا ہے۔ اور اپنے منہوں کو دھوئیں کی چمنی بنا دیا ہے۔ بہت سی کتابیں لائق مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمباکو پینا کس قدر مضر ہے۔ ہم آج کل کے زمانہ کو کلجگ کہتے ہیں۔ عیسائی یہ سمجھتے ہیں کہ جب خود غرضی، بداخلاقی، شراب نوشی وغیرہ جیسی برائیاں انسانوں میں بہت بڑھ جائیں گی تو حضرت مسیح کا دوبارہ ظہور ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم کہاں تک ان عقاید سے اتفاق کریں، لیکن میں یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ دنیا کو شراب، افیون، گانجا، بھنگ وغیرہ کے استعمال سے بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں کہ

ان سے کس قدر نقصان ہو رہا ہے اس لیے کہ ہم میں سے تقریباً ہر ایک اس جال میں پھنسا ہوا ہے۔ یہ میری پُر زور درخواست ہے کہ آپ ان سے بچے رہیں۔

عزیز طالب علمو!

میرا ان تقریروں کے کرنے اور آپ کا ان کے سننے سے مقصد یہ ہے کہ آپ ان سے کچھ سیکھیں اور ان پر عمل کریں۔ آپ میں سے کتنوں نے شریمتی بیسنٹ کی نصیحت پر عمل کر کے ہندوستانی لباس اختیار کیا ہے، اپنے کھانے کو سادہ بنایا ہے اور گندی عادتیں چھوڑ دی ہیں؟ یا پروفیسر جادوناتھ سرکار کی نصیحت کے مطابق کتنوں نے اپنی گرمی کی چھٹیاں غریب طلبا کو بغیر کسی معاوضہ کے پڑھانے میں صرف کی ہیں؟ ایسے بہت سے سوالات کیے جا سکتے ہیں۔ میں ان کا اس وقت جواب نہیں چاہتا بلکہ آپ ان سوالوں کا جواب اپنے ضمیر کو دے سکتے ہیں۔

آپ کے علم کا اندازہ اس سے نہیں ہوگا کہ آپ علمی اعتبار سے کتنا جانتے ہیں بلکہ اس سے کہ آپ کتنا عمل کر سکتے ہیں۔ آپ کو اپنے دماغوں کو کتابی علم سے بھرنے پر کچھ مالی معاوضہ تو مل سکتا ہے لیکن آپ اگر کوئی اچھا کام کریں گے تو اس کی قیمت اس سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔ جو علم آپ نے سیکھا ہے اس کی قیمت اصل میں اس کام کی قیمت کے برابر ہے جو آپ کرتے ہیں۔ باقی ایک بے کار کا بوجھ ہے۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ جو کچھ سیکھیں اور جو کچھ آپ کو صحیح معلوم ہو اس پر عمل کریں۔ یہی ترقی کا واحد راستہ ہے۔

(از گاندھی جینتی "وچار سرشٹی")

بنارس ہندو یونیورسٹی کے طلبا سے[1]

زبان کا مسئلہ

مجھے امید ہے کہ یہ یونیورسٹی اس بات کا خیال رکھے گی کہ جو نوجوان یہاں آتے ہیں، وہ اپنی تعلیم اپنی اپنی دیسی زبانوں میں حاصل کریں گے۔ ہماری زبان ہمارا آئینہ ہے۔ اور اگر آپ مجھ سے یہ کہیں گے کہ ہماری زبانیں ایسی بے مایہ ہیں کہ ان میں بہترین خیالات کا اظہار نہیں ہو سکتا تو میں کہوں گا کہ ہمارا وجود جتنی جلد اس دنیا سے ختم ہو جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ کیا کوئی ایسا بھی شخص ہے جو یہ خواب دیکھتا ہے کہ انگریزی کبھی بھی ہندوستان کی قومی زبان ہو سکے گی؟ (کبھی نہیں کے نعرے) تو پھر قوم پر یہ بار کیوں؟ ایک لمحہ کے لیے ذرا سوچیے کہ ہمارے لڑکوں کو انگریز لڑکوں کے مقابلہ میں اس دوڑ میں کس قدر پیچھے رہنا پڑے گا۔ مجھے ابھی حال میں پونہ کے بعض پروفیسروں سے گفتگو کا موقع ملا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ہر ہندوستانی نوجوان اس لیے کہ وہ انگریزی زبان کے ذریعہ علم حاصل کرتا ہے، اپنی زندگی کے چھ قیمتی سال ضائع کر دیتا ہے۔ اس کو ان طلبا کی تعداد سے ضرب

---

[1] یہ حصہ اس تقریر سے لیا گیا ہے جو گاندھی جی نے ۴ فروری سنہ ۱۹۱۶ء کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے کھلنے کے موقع پر کی تھی۔ مرتب

دیں جو ہمارے اسکولوں اور کالجوں سے نکلتے ہیں اور آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ قوم کے کتنے ہزار سال ضائع ہوئے ہیں۔ ہم پر الزام یہ ہے کہ ہم میں اُپج نہیں ہے۔ ہم میں اُپج کیسے پیدا ہو سکتی ہے اگر ہم کو اپنی زندگی کے بیش قیمت سال ایک غیر ملکی زبان کے حاصل کرنے میں صرف کرنے ہوتے ہیں؟ ہم اس میں بھی ناکام رہتے ہیں۔ کیا کل اور آج کے کسی مقرر کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے سامعین کو اس طرح متاثر کر سکتا جیسا مسٹر بیکن بوجم کر سکتے تھے؟ یہ ان مقررین کا قصور نہ تھا کہ وہ اپنے سننے والوں کی توجہ اپنی طرف منعطف نہ رکھ سکتے تھے۔ ان کی تقریروں میں ہمارے لیے کافی سے زیادہ مواد تھا۔ لیکن ان کی تقریریں ہمارے پلے نہ پڑ سکتی تھیں۔ میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ آخر کار یہ ہمارا انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستان ہے جو قوم کی رہنمائی اور اس کے لیے سب کچھ کر رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہمارے لیے اور ظلم کی بات ہوتی۔ ہم جو تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں، وہ انگریزی تعلیم ہے۔ یقیناً ہمیں کچھ نہ کچھ دکھانا پڑتا ہے لیکن فرض کرو کہ پچھلے پچاس سال سے ہم اپنی دیسی زبانوں میں تعلیم حاصل کرتے ہوتے، تو آج ہمارے پاس ایک آزاد ہندوستان ہوتا، ہمارے تعلیم یافتہ آدمی آج اپنے ملک میں بدیسی نہ ہوتے بلکہ اپنی قوم کے دل سے مخاطب ہوتے، وہ غریبوں میں کام کرتے ہوتے اور انہوں نے پچھلے پچاس سالوں میں جو کچھ حاصل کیا ہوتا وہ قوم کا ایک سرمایہ ہوتا (تالیاں) آج ہماری بیویاں بھی ہمارے بہترین خیالات میں شریک نہیں ہیں۔ پروفیسر بوس اور پروفیسر رے اور ان کی غیر معمولی تحقیقات کو دیکھو۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ ان کی تحقیقات آج عوام کی ملک نہیں ہے۔

آیئے اب دوسرے موضوع کو لیں۔

حکومتِ خود اختیاری

کانگریس نے حکومت خود اختیاری کے متعلق ایک قرارداد منظور کی ہے اور مجھے کوئی خبر نہیں ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور مسلم لیگ اپنے اپنے فرائض کا خیال رکھیں گی اور کوئی قابل عمل تجاویز پیش کریں گی۔ لیکن میں ذاتی طور سے نہایت صفائی کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ کیا پیش کریں گی جتنی مجھے اس سے ہے کہ طالب علموں کی دنیا یا عوام کیا پیش کرنے والے ہیں۔ کوئی کاغذی کارروائی ہمیں کبھی حکومت اختیاری نہیں دلا سکتی ہے۔ ہم کتنی ہی تقریریں کریں، وہ ہمیں حکومت خود اختیاری کے قابل نہیں بنا سکتی ہیں۔ یہ صرف ہماری اپنی زندگی ہے جو ہمیں اس قابل بنائے گی۔ (تالیاں) اور ہم کس طرح اپنے اوپر حکومت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں آج اس پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں کوئی تقریر کرنا نہیں چاہتا اور اگر آپ یہ دیکھیں کہ میں بہت کھل کر باتیں کر رہا ہوں تو آپ یہ سمجھیں کہ آپ ایک شخص کے خیالات سن رہے ہیں جو بلند آواز سے سوچ رہا ہے، اور اگر آپ یہ خیال کریں کہ میں ان حدود سے باہر جا رہا ہوں جو اخلاقی طور پر عاید ہوتے ہیں تو مجھے پھر اس آزادی کے لیے معاف کریں۔ میں ابھی شام کو وشوناتھ جی کے مندر گیا تھا اور جس وقت میں ان گلیوں سے گزر رہا تھا، میرے دل میں یہ خیالات پیدا ہو رہے تھے۔

اگر کوئی اجنبی آدمی اس بڑے مندر میں کہیں سے آجائے اور وہ یہ سوچنے لگے کہ ہم ہندوؤں کا کیا حال ہے تو کیا وہ ہمیں برا سمجھنے میں حق بجانب نہ ہوگا؟ کیا یہ عظیم الشان مندر ہماری سیرت کا آئینہ نہیں ہے؟ میں بحیثیت ایک ہندو کے یہ باتیں بہت دکھ کے ساتھ کہہ رہا ہوں کیا یہ مناسب ہے کہ ہمارے اس مقدس مندر کی گلیاں ایسی ہی گندی رکھی جائیں؟ آس پاس جو مکانات بنے ہیں، وہ بس بن گئے ہیں۔ گلیاں نہایت تنگ اور تکلیف دہ ہیں۔ اگر مندر بھی کشادگی اور صفائی کے نمونہ نہیں ہیں، تو پھر ہماری حکومت خود اختیاری کیا ہو سکتی ہے؟ کیا ہمارے مندر کبھی تقدس، صفائی اور امن کے گھر اس وقت ہوں گے جب انگریز ہندستان سے چلے جائیں گے، خواہ اپنی خوشی سے جائیں یا زبردستی بوریا بستر کیا گیا۔ میں صدر کانگریس کے اس خیال سے بالکل متفق ہوں کہ حکومت خود اختیاری کے خیال سے پہلے ہمیں بہت سی ضروری تیاریاں کرنی ہوں گی ہر شہر میں دو حصے ملیں گے، ایک چھاؤنی کا حصہ اور دوسرا خاص شہر، شہر اکثر نہایت گندے اور غلیظ ہوتے ہیں۔ مگر ہم لوگ شہر کی زندگی کے عادی نہیں۔ لیکن اگر ہم شہر کی زندگی چاہتے ہیں تو ہم ایک آرام دہ بستی کی زندگی پیدا نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ خیال کچھ بہت تسکین دہ نہیں ہے کہ لوگ ہندوستانی بمبئی کی سڑکوں پر چلتے ہیں اور انہیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ اونچی اونچی منزلوں کے مکانات کے رہنے والے کہیں ان پر تھوک نہ دیں۔ میں بہت کافی ریل میں سفر کرتا ہوں۔ میں تیسرے درجہ کے مسافروں کی مشکلات دیکھتا ہوں۔ لیکن ریلوے کا محکمہ کسی طرح ان کی سب تکلیفوں کے لیے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ہم صفائی کے

ادنیٰ اصولوں سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ہم ڈبوں کے فرش پر ہر طرف تھوکتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہ کبھی کبھی سونے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ہم کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ہم اسے کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ڈبے ناقابل بیان گندگیوں کا گھر بن جاتے ہیں۔ نام نہاد اونچے درجے کے مسافر اپنے نیچے درجہ کے بھائیوں کو سخت مرعوب رکھتے ہیں۔ ان میں میں طلبا کو بھی پاتا ہوں۔ بعض وقت ان کا طرز عمل بھی ان سے کچھ بہتر نہیں ہوتا ہے۔ وہ انگریزی بول لیتے ہیں اور انہوں نے نارفوک کی کرتیاں (جیکٹ) پہن لی ہیں، وہ اندر گھسنے پر اصرار کرتے ہیں اور زبردستی جگہ پر قبضہ کر بیٹھتے ہیں۔ میں نے اپنی دور بین نگاہیں ہر طرف ڈالی ہیں اور چونکہ آپ نے مجھے بولنے کا حق دیا ہے، میں آپ کے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ دیتا ہوں۔ اگر ہمیں حکومت خود اختیاری کی طرف قدم بڑھانا ہے تو ہمیں ان باتوں کو درست کرنا ہے۔

ہندوستان کی غربت

میں اب آپ کو ایک اور مسئلہ کی طرف لے جانا چاہتا ہوں۔ ہز ہائی نیس مہاراجہ نے جنہوں نے کل ہمارے جلسہ کی صدارت فرمائی تھی۔ ہندوستان کی غریبی کا ذکر کیا تھا۔ اور دوسرے مقرروں نے بھی اس پر بہت زور دیا تھا۔ لیکن ہم نے اس عظیم الشان پنڈال میں کیا دیکھا جس میں وائسرائے نے عمارت کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ یقیناً یہ

ایک بڑی نمائش تھی اور نمائش ہیرے جواہرات کی جس کو دیکھنے کے لیے پیرس کا سب سے بڑا جوہری آیا تھا۔ میں ان ہیرے جواہرات سے آراستہ امرا کا ان لاکھوں غریبوں سے مقابلہ کرتا ہوں اور میں ان امرا سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک آپ یہ جواہرات اپنے سے جدا نہ کریں گے اور ہندستان کے غریب بھائیوں کے لیے جمع نہ کردیں گے اُس وقت تک ہندوستان کی نجات نہیں ہو سکتی ہے۔ (آفریں آفریں، اور تالیاں)۔ مجھے یقین ہے، کہ ہمارے ملک معظم یا لارڈ ہارڈنگ کی یہ کبھی خواہش نہیں ہے کہ ملک معظم کے ساتھ سچی وفاداری کے اظہار کے لیے ہم اپنے جواہرات کے صندوقوں کو کھنگال ڈالیں اور سر سے پاؤں تک ہیرے اور جواہرات سے آراستہ ہو کر نکلیں۔ میں یہ ذمہ لیتا ہوں کہ میں ملک معظم کے پاس جاکر خواہ اس میں میری جان بھی خطرے میں کیوں نہ پڑ جائے، یہ پیغام لا سکتا ہوں کہ وہ اس قسم کی کسی چیز کی توقع نہیں کرتے ہیں۔ جناب من جب کبھی میں سنتا ہوں کہ ہندوستان کے کسی بڑے شہر میں، خواہ وہ برطانوی ہند میں ہو یا ہندوستان میں جہاں ہمارے بڑے والیان حکومت کرتے ہیں کوئی بڑا محل بن رہا ہے تو میں رشک سے کہتا ہوں کہ یہ وہ روپیہ ہے جو ہمارے کاشتکاروں کے پاس سے آیا ہے۔ ۷۵ فیصد سے زیادہ آبادی کا حصہ زراعت پیشہ ہے اور مسٹر ہیگن بوتھم نے کل رات اپنی تقریر میں بڑے اچھے انداز میں کہا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو گھاس کے ایک تنکے کی بجائے دو تنکے پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ہم میں حکومت خود اختیاری کی کوئی روح نہیں رہ سکتی ہے اگر ہم ان سے ان کے گاڑھے پسینے کی کل کمائی خود لے لیں یا دوسروں کو لے لینے دیں۔ ہماری نجات

کاشتکار کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نہ ہمیں وکیل، نہ ڈاکٹر اور نہ دولت مند زمینداری دلا سکتے ہیں۔

ہماری بے اعتمادی

اب آخر میں لیکن نہایت ضروری یہ میرا فرض ہے کہ میں یہ عرض کردوں کہ پچھلے دو یا تین دنوں سے کیا چیز ہمارے دماغوں کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ ہم سب بہت پریشان تھے جبکہ وائسرائے بنارس کی سڑکوں سے گزر رہے تھے۔ بہت سی جگہوں پر خفیہ پولیس تعینات کردی گئی تھی۔ ہم سب سہمے ہوئے تھے۔ ہم خود سے پوچھتے تھے کہ یہ بے اعتمادی کیسی؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ اس زندہ موت کے مقابل میں خود لارڈ ہارڈنگ مرجائیں! لیکن ایک طاقتور بادشاہ کا نائب ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ اس زندہ موت ہی کو زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن ان خفیہ پولیس کو ہمارے اوپر لگانا کیوں ضروری؟ ہم خواہ غصہ ہوں، خواہ خفا، یا یہ سب پسند کریں لیکن ہمیں ایک بات نہیں بھولنی چاہئے کہ آج کے ہندوستان نے اپنی بے صبری میں نراجیوں (انارکسٹ) کی ایک فوج پیدا کردی ہے۔ میں خود بھی ایک نراجی ہوں لیکن دوسری قسم کا۔ لیکن ہم میں نراجیوں کی ایک جماعت ہے اور میں اگر اس جماعت تک پہنچ سکا تو میں ان سے یہ کہوں گا کہ ان کی نراجیت کی ہندوستان میں کوئی گنجائش نہیں ہے اگر ہندوستان کو فتح کرنا ہے۔ یہ ایک خوف کی علامت ہے۔ اگر ہمیں خدا پر بھروسہ ہے اور اس سے ڈرتے ہیں تو ہمیں پھر کسی کا ڈر نہیں ہے۔ نہ راجا مہاراجاؤں

سکا' نہ وائسرائے کا' نہ خفیہ پولیس کا اور نہ ملک معظم جارج ہی کا۔ میں نراجی کی عزت کرتا ہوں کہ اسے اپنے ملک سے اتنی محبت ہے' میں اس کی عزت کرتا ہوں کہ وہ اتنی دلیری اور بہادری کے ساتھ اپنے ملک کے لیے جان دینے پر تیار رہتا ہے۔ لیکن میں اس سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا جان لینا بھی کوئی باعزت کام ہے؟ کیا ایک قاتل کا تیغہ ایک باعزت موت کا صحیح پیش خیمہ ہے؟ مجھے اس سے انکار ہے کسی مذہبی کتاب میں ایسے طریقے جائز نہیں قرار دیئے گئے ہیں۔ اگر مجھے ہندوستان کی نجات کے لیے یہ ضروری معلوم ہوا کہ ان انگریزوں کو چلا جانا چاہیئے اور ان کو یہاں سے نکال دیا جائے تو میں اس کے اظہار میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کروں گا اور مجھے امید ہے کہ اس خیال کی حمایت میں میں مرنے کے لیے بھی تیار رہونگا۔ یہ میری رائے میں ایک باعزت موت ہو گی۔ بم پھینکنے والا خفیہ سازشیں کرتا ہے' باہر آنے سے ڈرتا ہے اور جب وہ پکڑا جاتا ہے تو اپنے اس غلط جذبے کی قیمت ادا کرتا ہے۔

('طلبا سے خطاب' باب ۸، صفحہ ۱۵ تا ۲۰)

طالب علم کی زندگی

طالب علموں کی زندگی سنیاسیوں کی زندگی کی طرح ہے اس لیے تمہیں ایک بالکل پاک اور ترک لذات کی زندگی بسر کرنی ہے، جیسی کہ ایک برہمچاری کو چاہیے۔ دونوں تہذیبیں، قدیم اور جدید، طالب علموں کی جماعت پر غالب ہونے کے لیے ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ قدیم تہذیب ضبط نفس پر زور دیتی ہے۔ وہ یہ کہتی ہے کہ ایک شخص جس قدر اپنی خواہشات شعوری طور پر اور یہ سمجھ کر کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ کم کرتا ہے، اسی قدر اعلیٰ زندگی کی طرف اس کا قدم بڑھتا جاتا ہے۔ برعکس اس کے جدید تہذیب یہ کہتی ہے کہ اصل ترقی اس میں ہے کہ ایک شخص اپنی خواہشیں روز بروز بڑھاتا جائے۔ ضبط اور آزادی میں وہی فرق ہے جو دھرم یا صحیح اور غلط طریقہ زندگی کے درمیان ہے۔ ضبط کے لیے جو طریقہ بتایا جاتا ہے وہ مادی زندگی کے لوازمات کو ادنیٰ درجہ کا قرار دیتا ہے اور بجا طور پر ہمارے خیالات اور جذبات یا ہماری روحانی اور ذہنی زندگی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ آجکل اندیشہ یہ ہے کہ لوگ نئی تہذیب کی چمک دمک دیکھ کر اس کی طرف مائل نہ ہو جائیں اور پرانی تہذیب کو دور پھینک دیں۔ طلبا اس خطرے کو روکنے کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس یونیورسٹی کے طلبا کو لوگ اس بنیاد پر نہیں جانیں گے کہ وہ کیا جانتے ہیں بلکہ اس پر کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ اگر ایسے اس

یونیورسٹی کے تعلیمی نظام میں "دھرم" کی تعلیم اور اس پر عمل کرنے پر سب سے پہلے توجہ ہونی چاہیے۔ طلبا کو اس مقصد کے حصول میں پورے اشتراک عمل سے کام لینا چاہیے۔ میرا ذاتی طور سے یہ خیال ہے کہ ہم سیاسی اصلاحات سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھائیں گے، جب تک کہ ہم 'دھرم' کا کوئی واضح تصور اور ہندوستان میں اپنے لیے انفرادی اور سماجی زندگی کا کوئی صحیح طریقہ پہلے نہ پیدا کرلیں، اس لیے کہ یہ اصلاحات نہیں ہیں جو 'دھرم' پیدا کریں گی یا قائم کریں گی۔ بلکہ یہ 'دھرم' ہے جو اصلاحات کی خرابیاں بتائے گا اور انہیں دور کرنے میں ہماری مدد کرے گا۔

(نوجیون۔ ۲۹ جنوری ۱۹۲۰ء)

مخلوط تعلیم کا تجربہ

ہم یہاں ایک نیا تجربہ کر رہے ہیں۔ یہ خطرات سے بھرا ہوا ہے اور اگر میں ان کے ساتھ نہ ہوتا تو راشٹر شالا کے استاد اپنے طور پر اس کے کرنے کی جرأت نہ کرتے۔

ہم مخلوط تعلیم کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں، یعنی یہ کہ لڑکے اور لڑکیاں کنڈرگارٹن سے لے کر ہائی اسکول تک ساتھ ساتھ مل کر تعلیم حاصل کریں۔ بعض استادوں نے ایک بار مجھ سے پوچھا کہ "اسکول میں داخل ہونے والی لڑکیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ان میں کچھ بڑی عمر کی لڑکیاں بھی ہیں۔ کیا ہم ان کی ایک الگ

جماعت بنائیں؟" میں نے ان کے اس خیال کو پسند نہیں کیا اور کہا کہ لڑکیوں کی علیحدہ جماعت بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

لیکن بعد میں میں نے محسوس کیا کہ میرا یہ فیصلہ خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس معاملے میں تمہاری بڑی لڑکے، عورتیں اور آشرم کے دوسرے رہنے والوں کی رہنمائی کے لیے چند اصول پیش کر دوں۔ جو کچھ میں کہونگا، اسے آخری اور قطعی بات نہ سمجھنا چاہیے۔ میں تمہارے سامنے اپنے خیالات پیش کرتا ہوں جو اس وقت میرے ذہن میں پیدا ہو رہے ہیں۔ اساتذہ بعد میں ان پر بحث و گفتگو کر سکتے ہیں اور اگر ضرورت ہو تو ان میں ترمیم و تنسیخ بھی کر سکتے ہیں۔

مخلوط تعلیم کے آداب

لڑکے اور لڑکیاں دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھ سکتے ہیں لیکن انھیں تھوڑے سے آداب بھی ملحوظ رکھنے ہوں گے۔ لڑکے کلاس کے ایک طرف بیٹھیں اور لڑکیاں دوسری طرف۔ بڑی عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کو ایک دوسرے سے مل کر نہیں بیٹھنا چاہیے تاکہ ایک دوسرے سے مس ہونے کا امکان نہ رہے۔ بعض لڑکیاں اپنے بلوغ کی عمر کو پہنچ رہی ہونگی بعض پہنچ چکی ہوں گی۔ غرض لڑکیاں بڑی عمر کی ہوتی جا رہی ہیں اور لڑکے ہو چکے ہیں، اس لیے انھیں ایک دوسرے سے مس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ صحیح طریقِ زندگی اور تجرد کے منافی ہوگا۔ لڑکے کلاس کے بعد ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ وہ آپس میں بات چیت کر سکتے ہیں ہنس بول سکتے ہیں اور کھیل کود سکتے

ہیں، اور اسی طرح لڑکیاں آپس میں کر سکتی ہیں لیکن لڑکے اور لڑکیاں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے ہیں۔ انھیں ایک دوسرے سے بات نہیں کرنی چاہیئے اور نہ ہنسنا بولنا چاہیئے۔ اور آپس میں تو ان میں کوئی خط و کتابت ہونی ہی نہیں چاہیئے۔ نو عمر لڑکے اور لڑکیوں میں کوئی چیز بھی نہ ہونی چاہیئے۔ اور ایک شخص کے لیے جو حق کا عمل پیرا ہے، کوئی چیز بھی نہیں ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی خط و کتابت بڑی عمر کے آدمیوں میں بھی ایک کمزوری کی علامت ہے، تمہیں اپنے بڑوں کی اس کمزوری کی نقل نہیں کرنی چاہیئے، برعکس اس کے تمھیں ان کی نصیحتوں کو سننا چاہیئے اور اگر تم میں وہ کمزوری ہے تو اسے دُور کرنا چاہیئے۔ عام طور پر والدین اپنے بچوں سے اپنی کمزوریاں ظاہر نہیں کرتے ہیں، لیکن یہ ان کی بڑی غلطی ہے، اس لیے کہ اس طرح وہ اپنے بچوں کو تباہی کے گڈھے میں ڈھکیل رہے ہیں۔ اگر والدین اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کے بچے وہ غلطیاں نہ کریں، جو وہ کر چکے ہیں، تو اس سے نئی نسل کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ کوئی چیز بھی نہیں ہونی چاہیئے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم دوسروں کے معاملات کی ٹوہ میں لگے رہو۔ یہ تمہارا کام نہ ہونا چاہیئے۔ اگر کسی وقت بڑے لوگ آپس میں بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ تم وہاں سے ہٹ جاؤ تو تمہیں فوراً ہٹ جانا چاہیئے۔ تم ہماری کمزوریاں جان کر ان کے دُور کرنے میں ہماری مدد نہیں کر سکتے ہو۔ لیکن تمہارا کوئی ایسا خط یا تمہاری کوئی ایسی بات نہ ہونی چاہیئے جو تم بلا تامل اپنے بڑوں کے سامنے نہ رکھ سکو۔ اس کے اطمینان کے لیے سب سے بہتر چیز یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں کبھی اور کہیں بھی،

خواہ کلاس کے اندر ہوں یا باہر، بڑوں کی عدم موجودگی میں ایکدوسرے سے بات چیت نہ کریں۔ لڑکوں کو تو آزادی ہے کہ وہ دوسرے لڑکوں کے پاس ان کے کمروں میں جائیں، بیٹھیں، اور ان سے بات چیت کریں، اسی طرح لڑکیاں بھی لڑکیوں کے کمروں میں جائیں۔ لیکن لڑکیوں کو لڑکوں کے کمروں میں نہ جانا چاہئے۔ بے شک بڑوں کے سامنے، جیسا کہ پرارتھنا کے وقت ہوتا ہے، لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ بات چیت کر سکتی ہیں، انہیں پینے کو پانی دے سکتی ہیں اور اس طرح کی اور باتیں کر سکتی ہیں۔ ایسی چیزوں میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ لیکن یہاں بھی مناسب آداب کا خیال رکھنا ہوگا۔ انہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ جسم کا مساس نہ ہو۔ بڑی عمر کے لڑکے اور لڑکیوں میں ایسے جسمانی مساس سے جذبات میں برانگیختگی کا امکان ہے، اسلیے ہر طرح کی احتیاط کی ضرورت ہے۔

جسم و دماغ کی پاکی

میں محسوس کرتا ہوں، اور اب پہلے سے بھی زیادہ، کہ اگر ہمیں اپنے ملک کی خدمت کرنی ہے تو اپنی بنیادی قوت کو محفوظ رکھنا، جو جسم اور دماغ دونوں کی پاکی سے پیدا ہوتی ہے، نہایت ضروری ہے۔ تمہارے ایسے جسم کس کام کے ہوں گے جو مرجھائے ہوئے پھولوں کی طرح ہوں وہ ایسے سوکھے اور پتلے ہوتے ہیں کہ ان میں کوئی گوشت معلوم نہیں ہوتا۔ تمہیں اپنے جسموں کو اپنی زندگی کی اصل قوت کو محفوظ رکھ کر بنانا چاہیے۔ جب تک جسم کمزور رہے گا، اس وقت تک علم کا حاصل کرنا اور محفوظ رکھنا دونوں

ناممکن رہے گا۔ اور اس سے مزید کام لینا تو اور ناممکن ہوگا۔ ایک شخص جو غصہ ور مزاج کا ہے، علم حاصل کر سکتا ہے، اسی طرح وہ بھی جو بد دیانت ہے۔ لیکن جو شخص 'برہمچریہ' کا پابند نہیں ہے، وہ علم نہیں حاصل کر سکتا۔ ہم یہ بات 'پرانوں' سے جانتے ہیں جن میں یہ لکھا ہے کہ راکشش بھی جو بعد میں دیو بن گئے اور ہوس پرستی اور دوسری قسم کی بداخلاقیوں میں مبتلا ہو گئے، انھیں بھی بہ حیثیت طالب علم کے علم حاصل کرنے کی غرض سے برہمچریہ' برتنا پڑتا تھا۔ اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں کہ اگر کسی شخص کو کچھ کام کی باتیں سیکھنی ہیں تو اس کا جسم تندرست اور مضبوط ہونا چاہیے۔ اس لیے میں تمہیں ایسا ہی مضبوط اور تندرست دیکھنا چاہتا ہوں جیسے کہ پرانے زمانہ کے راکشش تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تم مولانا شوکت علی کی طرح پھولے جسم کے ہو۔ ایسا موٹاپا ضروری نہیں کہ مضبوطی کی علامت بھی ہو لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر تم 'برہمچریہ' برتو اور اپنی اصل طاقت کو محفوظ رکھو تو ایک مرتبہ پھر ہم اپنے درمیان 'ہنومان' کو دیکھ سکتے ہیں۔ ایک شخص جس کا جسم سرکنڈے کی طرح دبلا پتلا ہو، کیا 'شما' یا عفو کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے؟ ایسا شخص ڈر کا شکار ہو جائے گا فرض کر لو کہ اگر مولانا شوکت علی مجھے ایک تھپڑ ماردیں اور میں خاموش رہوں تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے انھیں معاف کر دیا۔ برعکس اس کے یہ سمجھا جائے گا کہ ایک بڑی طاقت کے آگے بدلہ لینے کی ہمت نہ پڑی۔ میں ایک حملہ آور کو اسی وقت معاف کر سکتا ہوں، جب میں اس سے طاقتور ہوں۔ مثال کے طور پر میں رسک کو معاف کر سکتا ہوں۔ اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم بہادر مرد اور عورت بننا چاہتے ہو اور سچائی اور عفو کے بھی دلدادہ ہو تو 'برہمچریہ' پر عمل کرو اور

اپنی زندگی کے مادّے کو احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھو۔ میں اس وقت ۵۱

سال کی عمر میں بھی کیوں اتنا چاق و چوبند ہوں' اس لیے کہ میں 'برہمچریہ' پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر میں نے یہ کوشش ابتدائی عمر سے کی ہوتی تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کہاں پہنچتا۔ میں تمام والدین اور سرپرستوں سے جو آج یہاں موجود ہیں' درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو تجرد پر عمل کرنے میں تمام ممکن سہولتیں بہم پہنچائیں۔ آپ ان کی شادیاں اس وقت کریں جب وہ آپ کے پاس آئیں اور آپ سے اپنی شادی کے لیے درخواست کریں۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ بدلتے زمانہ ہی میں لوگ برہمچاری ہو سکتے تھے۔ لارڈ کچنر' میرا خیال ہے' ایک 'برہمچاری' تھا۔ وہ ساری عمر غیر شادی شدہ رہا۔ وہ ایک بہت اچھا آدمی تھا' اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ اس نے اپنی نفسانی خواہش کہیں اور پوری کی ہو گی اس کا خیال تھا کہ صرف غیر شادی شدہ آدمی کو ہی جو تجرد کے قابل ہوں' یعنی جن کے جسم اچھے ہوں اور اچھی جسمانی طاقت رکھتے ہوں' انھی کو فوج میں جانا چاہیے۔ اس لیے میں تمام بڑی عمر کے لوگوں سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے بچوں کی شادیاں ابتدائی عمر میں نہ کریں' اس خیال سے کہ کہیں بعد میں انھیں ایک اچھا جوڑا تلاش کرنا ممکن نہ ہو۔ آپ کو اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے' جب تک کہ آپ کے لڑکے خود آپ سے شادی کے لیے نہ کہیں۔ مجھے کوئی شبہ نہیں کہ جب شادی کا وقت آئے گا تو خدا آپ کے لڑکے یا لڑکی کے لیے مناسب جوڑا تلاش کرنے میں آپ کی مدد کرے گا۔

بھائی بہن کا رشتہ

میں ان لڑکے اور لڑکیوں سے ایک بات اور کہنی چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ چونکہ انھوں نے ایک ہی اُستاد کے ماتحت رہ کر تعلیم حاصل کی ہے، اس لیے انھیں خود کو بھائی اور بہن کی طرح خیال کرنا چاہیے اور اسی طرح رہنا بھی چاہیے۔ اس کے سوا ان کا آپس میں اور کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔ تم سب لوگ جو اس اسکول میں پڑھتے ہو اور اس آشرم میں رہتے ہو، مہربانی کرکے اس بات کو یاد رکھو۔ جس دن مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس تعلق میں کسی طرح کی خلاف ورزی کا کوئی واقعہ ہوا ہے تو اسی وقت میں بلاتامل اس اسکول کو یا آشرم کو فوراً بند کردوں گا، اس لیے اس بات کا خیال رکھنا۔ مجھے لوگوں کی رائے کی مطلق پروا نہ ہوگی۔ میں اس تجربہ کو برابر جاری رکھوں گا اور اس اسکول میں اور لڑکیاں داخل کروں گا بشرطیکہ تم مجھے یقین دلادو کہ تم بھائی بہن کا تعلق دیانتداری کے ساتھ قائم رکھوگے۔ آج ہی ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ وہ یہاں آنا چاہتے ہیں اور آشرم میں رہنا چاہتے ہیں۔ ان کی ایک بارہ برس کی لڑکی ہے۔ ہم لوگوں میں اس عمر کی لڑکی شادی کے قابل سمجھی جاتی ہے۔ تمہیں مجھے اس معاملہ میں یقین دلانا ہے۔ تب میں ان صاحب کو یقین دلا سکتا ہوں اور ان سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی صاحبزادی یہاں رہ سکے گی اور وہ اسے اس قسم کی تعلیم دلا سکتے ہیں جو یہاں دی جاتی ہے۔ جو تجربہ ہم کررہے ہیں، وہ اس قدر نازک ہے کہ والدین اور اساتذہ اسی وقت فکر سے آزاد رہ سکتے ہیں جب ان

قواعد کی جو میں نے بنائے ہیں، حرف بہ حرف پابندی کی جائے۔ اگر اُستادوں کو طالب علموں کی نگرانی کرنی پڑے کہ کوئی ناخوشگوار بات پیش نہ آجائے، تو یہ دونوں کے لیے بُرا ہوگا۔

نفسانی خواہش پر قابو

جو شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی نفسانی خواہش ناقابلِ ضبط ہے اور وہ اسے قابو میں نہیں رکھ سکتا ہے، تو اسے آشرم فوراً چھوڑ دینا چاہیے اسے اس کی شہرت پر دھبہ نہیں لگانا چاہیے اور اس قابلِ قدر تجربہ کو ختم کر دینے کا ذریعہ نہیں بننا چاہیے! انجیل میں آتا ہے کہ اگر تم یہ محسوس کرتے ہو کہ تم اپنی آنکھ کو قابو میں نہیں رکھ سکتے ہو، تو تمہیں اس میں سوئی چبھو دینی چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں کبھی ایسی نوبت آئے گی، لیکن اگر کبھی ایسا واقعہ ہوا بھی تو میں اپنے آپ کو سابرمتی دریا میں ڈبو دوں گا۔

تم میں سے سب لوگوں کو بلالحاظ اس کے کہ نفسانی خواہش تم میں بیدار ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، جو کچھ میں نے کہا ہے یا عملاً کیا ہے اس پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ ہم اس فرق کو جو قدرت نے پیدا کیا ہے، مٹا نہیں سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس فرق کو عملاً محفوظ رکھ کر یعنی لڑکے، لڑکیوں کی صحبت سے دور رہیں، اور لڑکیاں لڑکوں کی، اس طرح ہم ــ جن میں یہ نفسانی خواہش بیدار ہو چکی ہے، اور زیادہ آسانی سے وہ جن میں یہ ابھی بیدار نہیں ہوئی ہے ہم اس جذبہ کو پوری طرح قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ میں نے اکثر کہا ہے اور میں یہاں پھر اسے دہرانا چاہتا ہوں کہ

مجھے اس جذبہ پر قابو پانے کے لیے اور 'برہمچریہ' برتنے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑی ہے۔ مجھے ابھی تک کوئی اور شخص ایسا نہیں ملا ہے جس نے اس جذبے پر قابو پانے کے لیے اتنی ریاضت کی ہو جتنی میں نے کی ہے۔ ایک شخص جو ایک بار بھی اس جذبہ کا شکار ہو چکا ہے، اس کے لیے اس کا دبانا یا درست رکھنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے میں یہ کہوں گا کہ تم اس عادت میں پڑو ہی مت۔ جن میں یہ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں بھی محسوس ہوتی ہو، انھیں اسے وہیں دبا دینا چاہیئے۔ جن میں یہ ابھی نہیں ابھری ہے، انھیں اس کے دبانے کی اس قدر کوشش کی ضرورت نہیں۔ انھیں صرف یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ کوئی ایسا موقع نہ آنے پائے جس سے یہ خواہش یا جذبہ ابھرے۔ صرف ایسے ہی لوگوں میں اپنے ملک کی خدمت کی صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے جو 'برہمچریہ' پر عمل پیرا ہوں اور اپنی قوت حیات کو محفوظ رکھتے ہوں۔ لڑکیاں بھی اگر اپنے مدرسہ کی تعلیم کے زمانہ میں 'برہمچریہ' پر عمل کریں، تو زیادہ اچھی گھر چلانے والی اور مائیں بن سکتی ہیں۔ جو عورت اپنے ملک کے ان غریبوں کی خدمت کرتی ہے جو نہایت مصیبت میں ہیں، وہ یقیناً اس سے زیادہ قابل قدر ہے جو صرف اپنے شوہر کا خیال رکھتی ہے۔

سادہ کپڑوں کا استعمال

ایک اور بات جس کی طرف میں تمہاری توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ سادہ کپڑوں کا استعمال بھی 'برہمچریہ' پر عمل کرنے میں عموماً مددگار

ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ کوئی اٹل قانون نہیں ہے، اس لیے کہ ایک شخص بہت بڑا گنہگار ہو سکتا ہے، خواہ وہ کھادی ہی کیوں نہ پہنتا ہو۔ اور برعکس اس کے بانکا چھیلا بھی برہمچاری ہو سکتا ہے۔ میں اس دوسرے کی زیادہ عزت کروں گا اور پہلے کی طرف سے منہ موڑ لوں گا جو اگرچہ کھادی پہنتا ہے لیکن پھر بھی گناہ کرتا ہے۔ لیکن یہ ہمارے لیے کچھ موزوں نہیں ہے کہ ہم نمائشی اور بھڑکیلے لباس پہن کر حسین بننے کی کوشش کریں برہمچاری کو اگر اپنی ظاہری شکل کی نمائش ہی کرنی ہے، تو صرف خدا کے سامنے کرنی ہے۔ اور خدا ہمیں ہر رنگ میں بھی دیکھتا ہے۔ پھر ہم کیوں ظاہری ٹیپ ٹاپ میں حسین بننے کی کوشش کریں۔ اصل حسن صرف ان خوبیوں میں ظاہر ہوتا ہے جو ایک شخص کے اندر ہوتی ہیں۔ ایک شخص کو دوسروں پر اپنی ظاہری خوبصورتی سے نہیں بلکہ اپنے اخلاقی حسن سے اثر ڈالنا چاہیے۔ کپڑے صرف جسم ڈھکنے کی غرض سے پہننے ہیں، اسلیے موٹے سے موٹا کھدر بھی اس کے لیے ایسا ہی ہے جیسا باریک سے باریک ریشمی کپڑا۔ اگر بڑے خود کھادی پہننا اپنے لیے دشوار پاتے ہیں تو انھیں اپنے بچوں کو اس کے استعمال کی عادت ڈلوانی چاہیے۔ جو ماں یہ سمجھتی ہے کہ اس کے بچے صرف اسی وقت خوبصورت معلوم ہوں گے، جب وہ نفیس کپڑوں میں ملبوس ہوں اور وہ انھیں نفیس کپڑوں میں ملبوس رکھتی ہے، وہ ماں بے وقوف ہے۔ نفیس کپڑے ایک شخص کی خوبصورتی میں کیسے اضافہ کر سکتے ہیں؟ فرض کیجیے وہ کرتے بھی ہیں تو اس سے فائدہ کیا ہے؟ اگر ایک شخص میرے پاس آتا ہے اور میری لڑکی سے شادی کی خواہش اس لیے کرتا ہے کہ وہ اس کے ظاہری حسن سے متاثر ہے، تو میں اسے ٹال

کر بھگا دوں گا۔ میں اس کی شادی ایسے شخص کے ساتھ کروں گا جو اس کی اندرونی خوبیوں کی وجہ سے اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ خوبصورت دکھائی دو، تو نفاست پسندیوں کی بجائے تمہیں اپنی سیرت درست کرنی چاہیئے اور پھر تمہارے اندر جو خوبیاں ہیں، انھیں ترقی دینی چاہیئے۔ پھر تم یقیناً خوبصورت دکھائی دو گے اور جہاں جاؤ گے، تمہاری عزت ہو گی۔

میں نہیں سمجھتا کہ میرے لیے اور کچھ کہنا باقی رہ گیا ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا، سب کچھ کہہ دیا ہے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ بہت قیمت رکھتا ہے۔ اگر تم نے اسے نہیں سمجھا ہے تو تم اپنے بزرگوں یا اپنے استادوں سے کہو کہ وہ تمہیں سمجھا دیں۔ تم سب کو اس پر غور کرنا چاہیئے، اسے اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیئے اور جہاں تک ہو سکے، اس پر عمل کرنا چاہیئے اور اس طرح مجھے موقع دو کہ میں لڑکے اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کا جو تجربہ کر رہا ہوں، اسے کامیاب بناؤں۔

(مدھ پڈو (Madhpudo) سے لیا گیا)

جوناگڈھ کی دیوانگی

جوناگڈھ کاٹھیاواڑ میں (جس کا نام کاٹھیاواڑ اس وجہ سے پڑا کہ وہ بہادر کاٹھی لوگوں کا ملک تھا) ایک مسلم ریاست ہے۔ اس میں ایک بہت اچھا کالج ہے جس کا نام اس کے بانی وزیر بہاؤ الدین پر ہے۔ کالج نے بہت سے سندھی اہل علم بلا بلا کر رکھے ہیں جن میں بیشتر مسلمان ہیں۔ اس کالج کا ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی فیس نہیں لی جاتی ہے۔ نئے نواب صاحب نے یکبارگی چند دن قبل ایک حکم نافذ کیا کہ تمام غیر کاٹھیاواڑی طلبا کو چھ بیس گھنٹے کے اندر نکال دیا جائے۔ غریب حیرت زدہ طلبا کو اسی دن زبردستی ریل گاڑی پر بٹھا کر سندھ بھیج دیا گیا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ ان طلبا نے کیا جرم کیا تھا۔ افواہاً یہ سنا گیا ہے کہ اس نامعقول حکم کی محرک خلافت کی تحریک ہے۔ اس فعل کی شرم رکھنے کے لیے ہندو طلبا کو بھی لیا گیا ہے۔

ذاتی طور سے میں اس اخراج کو اچھا سمجھتا ہوں کھلا ہوا ظلم لوگوں پر یہ ظاہر کر دے گا کہ تحریک خلافت کے خلاف کیسی معاندانہ قوتیں کام کر رہی ہیں۔ یہ ریاستیں دراصل شہنشاہیت کی غلام ہیں اور جب شہنشاہیت کوئی ظلم کرتی ہے تو یہ اس سے بھی بدتر کام کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں جنہیں کوئی حاکمانہ اختیار بھی نہیں ہے۔ اس خوف سے کہ انہیں کہیں دولت اور طاقت دونوں سے ہاتھ نہ دھونا پڑے وہ

اس ظلم کا آلۂ کار بن جاتی ہیں اور شہنشاہیت کا ظلم جتنا ان دیسی ریاستوں کے ہاتھوں ظاہر ہوتا ہے، اتنا شہنشاہیت کے ہاتھ سے نہیں ہوتا۔ ان ریاستوں کی رعایا اور جو ان کے عارضی طور پر زیرِ سایہ ہوتے ہیں، وہ اکثر ان کے عتاب کے زہر سے شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں یہاں برطانوی اقتدار کے اندر دیسی ریاستوں کی حالت سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔

میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں اس دشواری کا کوئی آسان حل نکالوں بیان کیا جاتا ہے کہ اس غیر معمولی حکم کے خلاف پرنسپل نے احتجاج کے طور پر استعفا دے دیا ہے۔ وہ ان لوگوں کی دلی مبارکباد کا مستحق ہے جو اس سلطنت (برطانیہ) میں انصاف اور حق دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا کاٹھیاواڑی طلبا پر ریاست اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے کوئی فرض عاید نہیں ہوتا؟ میری رائے میں انہیں نہایت مودبانہ احتجاج کے بعد سب کو مل کر ایک ساتھ کالج چھوڑ دینا چاہیئے۔ ان میں اگر کالج چھوڑنے والے طلبا کے ساتھ ہمدردی کے اظہار کی جرأت نہیں ہے، تو وہ اس مفت تعلیم کی بہت قیمت ادا کر رہے ہیں۔ نواب صاحب ممکن ہے اب بھی ہوش میں نہ آئیں، مگر اس سے ان کو کوئی غرض نہیں۔ انہوں نے تو کالج چھوڑ کر اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔

جن طلبا کو الگ کیا گیا ہے، ان سے میں کہوں گا کہ تم بزدل نہ ہونا۔ تم ایسے کالج میں داخلہ کی بھیک مت مانگنا جس کے مالک نے تمہاری ایسی بے عزتی کی ہے۔ تم وہ معمولی رقم بھی جو نواب صاحب نے تمہیں بطور صلہ اور سفر خرچ کے دی ہے، انہیں لوٹا سکتے ہو۔ اس قسم کا کوئی معاوضہ قبول کرنا گویا غلطی کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ہے۔ تمہیں جتنی تعلیم کی ضرورت ہے، تم خود سندھ میں بغیر کسی کالج میں گئے ہوئے بھی حاصل کر سکتے ہو۔ ہم

جو تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں حاصل کرتے ہیں، ہم نے اسے بت بنا رکھا ہے۔ ہمیں پڑھنا لکھنا سیکھنے سے پہلے آدمی بننا چاہیے۔ قدرت نے ان میں وہ صلاحیت رکھی ہے جو اپنی ترقی کے راستہ میں خواہ وہ علمی ہو یا اور کوئی، اپنی تمام مشکلوں پر قابو پا سکے۔

(ینگ انڈیا، ۷ جولائی ۲۰ء)

طلباء کی آزمائش

رولٹ ایکٹ کے زمانہ میں جو کچھ طلبا کے ساتھ پیش آیا وہی اب پھر آرہا ہے۔ ان یادگار دنوں میں ان میں سے ایک نے مجھے لکھا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں خودکشی کرلوں، اس لیے کہ مجھے خارج کر دیا گیا ہے۔ ایک طالب علم آج کل لکھ رہا ہے:

...... کے طلبا نے مادر وطن کی آواز سنی اور اس پر لبیک کہا۔ ہم نے ۳۰ کو ہڑتال کی۔ اپنے اس دلیرانہ فعل پر ہم پر ۲ روپے فی طالب علم جرمانہ کیا جا رہا ہے۔ غریب طلباء اپنی معافیوں، نصف معافیوں اور وظیفوں سے ہاتھ دھو رہے ہیں۔ مہربانی کرکے ...... صاحب پرنسپل کو لکھیے یا "ینگ انڈیا" کے ذریعہ انھیں مشورہ دیجیے۔ ان سے

کہیے کہ ہم کوئی مجرم نہیں ہیں، ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔
ان سے کہیے کہ ہم نے مادرِ وطن کی آواز سنی اور اس پر
عمل کیا۔ ہم نے جہاں تک ہو سکا، اسے ذلت سے بچایا۔
ان سے کہیے کہ ہم بزدل نہیں ہیں۔ خدا کے لیے آپ ہماری
مدد کیجیے۔"

میں اس طالب علم کے مشورہ پر پرنسپل کو تو نہیں لکھ سکتا اگر اسے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا نہیں ہے تو میرا خیال کہ اسے ضبط کے لیے کوئی کارروائی کرنی پڑے گی۔ جب تک ہماری تعلیمی درسگاہیں حکومت کی سرپرستی میں رہیں گی، اس وقت تک وہ حکومت کی تائید میں استعمال ہوتی رہیں گی اور جیسا کہ انھیں ہونا چاہیے، اور جو طلبا یا اساتذہ حکومت کے خلاف عوامی کارروائیوں کی تائید کرتے ہیں، انھیں اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی اور انھیں اخراج کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ ایک محبِ وطن کے نقطۂ خیال سے طلبا نے جو کچھ کیا، اچھا کیا اور بہادری سے کام لیا جو لوگوں کا ساتھ دیا۔ وہ جب وطن کی کمی کے موردِ الزام ہوتے، اگر اور اس سے زیادہ نہیں، وہ وطن کی اس آواز پر لبیک نہ کہتے۔ حکومت کے نقطۂ نظر سے انھوں نے بےشک غلطی کی اور ان کے عتاب کے مورد ہوئے۔ طلبا رخلاف ورزی بھی کریں اور پھر موردِ عتاب نہ ہوں، دونوں باتیں نہیں ہو سکتی ہیں۔ اگر وہ عوام کے معاملوں کا ساتھ دیں گے تو انھیں اپنے تعلیمی کام کو اس کا پابند کرنا ہوگا اور اگر وہ ملک کے مفاد کے خلاف پڑتا ہے تو اسے قربان بھی کرنا ہوگا۔ میں نے یہ بات ۱۹۲۰ء میں نہایت واضح طور پر کہی اور بعد کے تجربہ نے اس کی تائید بھی کی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ

طلباء کے لیے سب سے محفوظ اور باعزت راستہ یہ ہے کہ وہ سرکاری مدرسوں اور کالجوں کو بہر صورت چھوڑ دیں۔ لیکن اس سے زیادہ بہتر طریقہ ان کے لیے یہ ہے کہ وہ اپنے کو اس بات کے لیے تیار رکھیں کہ اگر حکومت اور عوام میں تصادم ہوتا ہے تو وہ نکال بھی دیے جائیں گے، جیسا کہ اور جگہوں میں ہو چکا ہے۔ حکومت کے خلاف بغاوت میں اگر قیادت نہ کریں، تو کم سے کم انھیں پکا اور سچا پیرو رہنا چاہیے۔ انھیں نتائج کا مقابلہ بھی اسی دلیری سے کرنا چاہیے جس دلیری سے انھوں نے قوم کی آواز پر لبیک کہا۔ انھیں خود کو ذلیل نہیں کرنا چاہیے، انھیں اپنی عزت نفس کو ان کالجوں اور اسکولوں میں دوبارہ داخل ہو کر، جن سے کہ وہ نکال دیے گئے تھے، قربان نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی بہادری نام کی بہادری ہوگی اگر یہ پہلے ہی امتحان میں ناکام رہی۔

میں نے سنا ہے کہ ہڑتال سے پہلے طلباء نے بدیشی کپڑے چھوڑ دیے تھے، اور کھدر پہننا شروع کر دیا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ یہ کہیں کہ یہ محض ایک عارضی بات تھی اور انھوں نے باہر کے دباؤ یا اندرونی خواہش پر کھدر پہننا اتنی ہی جلدی چھوڑ دیا، جتنی جلدی انھوں نے بدیشی کپڑے چھوڑے تھے۔ میرے نزدیک اس ملک کے لیے بدیشی کپڑا بمنزلہ بدیشی حکومت کے ہے۔ کاش یہ بات بغیر کسی ثبوت کے تسلیم کر لی جاتی!

(ینگ انڈیا، ۱۶ فروری ۱۹۲۸ء)

بچتے رہنا!

ایک نامہ نگار نے مجھے اخبار کا ایک تراشہ بھیجا ہے جس میں نئی دنیا میں چھوٹے بچوں کے جرائم اور لڑکیوں میں ناجائز شہوت پرستی کے بڑے ہولناک واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

ایک ۱۴ برس کے بچے نے، بیان کیا جاتا ہے کہ اپنی ماں کو گولی مار دی اس لیے کہ اس نے بچے کو دیا سلائیوں سے کھیلنے سے منع کیا تھا۔ جب پولیس نے اسے گرفتار کرنا چاہا تو اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اس نے انھیں بھی گولی مارنے کی دھمکی دی۔ اور جب عدالت میں پیش کیا گیا اور مجسٹریٹ نے اس سے پوچھا تو اس نے ان چیزوں میں سے ایک چاقو اٹھایا، جو عدالت کے سامنے بغرض پیشکش رکھی ہوئی تھیں، اور مارنے کے لیے لپکا۔ کہا جاتا ہے کہ شاید ہی کوئی دن امریکہ میں ایسا گزرتا ہوگا جب کوئی لڑکا یا لڑکی اس قسم کا کوئی جرم نہ کرتا ہو۔ اور امریکہ کے بہت سے کالجوں میں خودکشی کے کلب یا جرائم کی انجمنیں ہیں۔ اور ان واقعات کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ بہت سی لڑکیاں لڑکیوں کے کالجوں کی قانون سے ایسی آزاد ہوگئی ہیں کہ وہ ناجائز حرکتوں کے لیے کالجوں سے بھاگ آتی ہیں۔

ایک ایسے زمانہ میں جبکہ اخبارات اپنے قارئین کی دل چسپی کے لیے من گھڑت واقعات کی سنسنی خیز غذائیں فراہم کرتے رہتے ہیں، ان خبروں کو جو بیان کی گئی ہیں جوں کا توں یقین کر لینا ذرا مشکل ہے۔ لیکن

مبالغہ کا کافی خیال رکھتے ہوئے بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لڑکے اور لڑکیوں میں جرائم اور قانون کی خلاف ورزیاں اس نئی دنیا میں بہت عام ہو گئی ہیں جس کی بڑی ذمہ داری اس نئی تہذیب پر ڈالی جاسکتی ہے۔ لیکن باوجود ان جرائم کے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ زندگی تو مغرب میں بھی چلتی ہی رہتی ہے۔ اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مغرب کے دانشمند لوگ نہ صرف یہ کہ ان برائیوں سے آگاہ نہیں ہیں بلکہ وہ ان کو دور کرنے کی جرأت کیساتھ کوشش بھی کر رہے ہیں۔ بہرحال، ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا ہم اس تہذیب کی آنکھ بند کر کے تقلید کرتے رہیں؟ ہم کو وقتاً فوقتاً مغرب کی طرف سے ایسے خوفناک انکشافات جو ہوتے رہتے ہیں، انھیں دیکھ کر ہمیں ٹھٹکنا چاہیے اور خود سے پوچھنا چاہیے کہ ہم کیوں نہ اپنی تہذیب پر قائم رہیں اور مقابلتاً جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے، اس کی روشنی میں ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہیے اس لیے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر مغرب کو اپنی تہذیب کے پیدا کردہ مسائل سے سابقہ پڑا ہے تو ہمیں بھی ان سے کچھ کم اپنے مسئلوں سے دوچار ہونا نہیں ہے!

یہ غالباً اگر بے کار نہیں مگر غیر ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں ہم دونوں تہذیبوں کی اچھائیوں اور برائیوں کا مقابلہ کریں۔ مغرب نے اپنی آب و ہوا اور ماحول کے مطابق ایک تہذیب پیدا کی ہے، اسی طرح ہماری بھی اپنے حالات کے مطابق اپنی ایک تہذیب ہے اور دونوں اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے ٹھیک ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ جن جرائم اور قانون شکنیوں کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ ہمارے لیے تقریباً ناممکن تھیں، اور میرا خیال ہے کہ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری امن پسندانہ تربیت ہوئی ہے اور ہم نے ایسے ماحول میں پرورش پائی ہے جس میں ضبط اور تحمل کی تعلیم دی گئی ہے۔ بزدلی

جو اکثر امن پسندانہ تربیت کا نتیجہ ہوتی ہے اور خوشامد جو اس قید و بند کا نتیجہ ہوتی ہے جو پشتہا پشت سے چلی آتی ہے، ان سے ہمیں بچنا ہے اگر قدیم تہذیب کو جدید حملوں سے تباہ ہونا نہیں ہے۔ جدید تہذیب کی سب سے امتیازی خصوصیت انسانی ضروریات کا غیر محدود گوناگوں ہونا ہے، قدیم تہذیب کی خصوصیت، ان ضروریات کا محدود اور قاعدہ کا پابند ہونا ہے۔ جدید یا مغربی بے ثباتی مستقبل کی زندگی اور اس بنا پر خدا میں زندہ اعتقاد نہ ہونے کی بنا پر ہے۔ قدیم یا مشرقی تہذیب میں جو قید و بند ہے، وہ باوجود ہمارے مستقبل کی زندگی اور خدائی طاقت کے باوجود پر اعتقاد سے پیدا ہے۔ جو مختصر خبر اوپر دی گئی ہے، وہ اگر ہم یقین بھی کرلیں تو وہ مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید کے خلاف انتباہ ہے جو اکثر ہندوستان کی شہری زندگی اور خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ میں نظر آتی ہے۔ جدید اکتشافات کے بعض فوری اور حیرت انگیز نتائج ایسے ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں کہ انسان کی فتح ان سے بے اثر رہنے میں ہے۔ ہمیں خطرہ یہ ہے کہ ہم کہیں اپنی مستقل قدروں کو ان عارضی مسرتوں کے عوض قربان نہ کردیں۔

(ینگ انڈیا، ۲ جون ۱۹۲۷ء)

خدا پر ایمان

پچھلے دس سال کے اندر میں تقریباً ہزاروں طلبا سے ملا ہوں۔ انہوں نے میرے سامنے اپنے دل کی تمام باتیں رکھ دی ہیں اور مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ میں ان کے دلوں کو ٹٹولوں۔ اس لیے میں تمہاری تمام مشکلوں کو جانتا ہوں اور تمہاری ہر کمزوری کو بھی سمجھتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میں تمہاری کوئی خاص مدد بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن میں تمہارا دوست اور ناصح ضرور بن سکتا ہوں، تمہارے رنج و غم میں شریک ہو سکتا ہوں اور اپنے تجربہ سے تمہیں فائدہ پہنچا سکتا ہوں، اگرچہ تم جانتے ہوگے کہ بے مددگاروں کا مددگار صرف خدا ہے۔ انسان کے لیے اس سے بڑی سزا یا مصیبت اور کوئی نہیں کہ خدا پر اس کا ایمان ختم ہو جائے۔ اور میں نہایت افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ طلبا سے یہ ایمان رفتہ رفتہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ جب میں ایک ہندو لڑکے سے یہ کہتا ہوں کہ کبھی رامائن پڑھا کرو، تو وہ میری طرف گھور کر دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے کہ رام کون تھے؟ جب میں ایک مسلمان لڑکے سے کہتا ہوں کہ میاں! قرآن پڑھا کرو اور خدا سے ڈرا کرو، تو وہ کہتا ہے کہ میں قرآن نہیں پڑھ سکتا اور صرف زبان سے اللہ کا نام لیتا ہے۔ میں ایسے لڑکوں کو کیسے قائل کر سکتا ہوں کہ سچی تعلیم میں سب سے پہلا قدم صاف و پاک دل ہونا ہے۔ جو تعلیم تم پاتے ہو، اگر وہ تمہیں خدا سے برگشتہ کرتی ہے، تو میں تمہیں

سمجھاکر اس سے تمہیں کوئی فائدہ پہنچے گا اور اس سے تم کیسے دوسروں کو فایدہ پہنچا سکو گے ؟ ۔

(ینگ انڈیا، ۴ اگست ۱۹۲۷ء)

غریبوں اور گاؤں والوں کو نہ بھولو

مجھے تعجب ہے کہ میں یہاں کہاں آگیا! گاندھی جی نے حیرت سے کہا، مجھ جیسے دیہاتی کے لیے یہاں جگہ کہاں جو حیرت اور استعجاب میں کھڑا ہوا ہے۔ میں اس وقت کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتا ہوں، وہ یہ کہ یہ بڑی بڑی لیبوریٹریاں اور بجلی کی مشینیں جو تم یہاں دیکھتے ہو، وہ سب لاکھوں انسانوں کی جبری محنت کا نتیجہ ہیں اس لیے کہ ٹاٹا کے ۳۰ لاکھ کہیں باہر سے نہیں آئے ہیں اور نہ میسور کا عطیہ کہیں اور سے ملا ہے یہ سب انہی بے گاروں کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہم ان دیہات والوں سے ملیں اور انھیں بتائیں کہ ہم ان کے پیسے کو کس طرح عمارتوں اور کارخانوں پر استعمال کر رہے ہیں جن سے انھیں شاید کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، اور اگر پہنچے تو شاید ان کی آنے والی نسلوں کو پہنچے، مگر وہ اس بات کو نہیں سمجھیں گے۔ وہ اس کی ذرا پرواہ کریں گے۔ لیکن ہم ان سے کبھی کوئی تعلق پیدا نہیں کرتے ہیں۔ ہم اسے اپنا ایک حق سمجھتے ہیں اور

بھول جاتے ہیں کہ اگر نمائندگی نہیں تو ٹیکس نہیں، کا اصول ان پر بھی صادق آتا ہے۔ اگر واقعتاً آپ اس اصول کو ان پر بھی لاگو کریں اور ان کے سامنے جوابدہی اپنا فرض سمجھیں تو آپ دیکھیں گے کہ ان تصورات کا ایک ادبی پہلو بھی ہے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کے دلوں میں ان کے لیے ایک معمولی نہیں بلکہ خاصا بڑا گوشہ ہے اور اگر آپ اس گوشے کو اچھی حالت میں رکھیں گے تو آپ اپنی معلومات کو لاکھوں آدمیوں کے فائدہ کے لیے استعمال کر سکیں گے جن کی محنتوں پر آپ کی تعلیم کا دار مدار ہے۔

میں اس سے کہیں زیادہ امید رکھتا ہوں جتنی کسی شخص سے ہو سکتی ہے۔ جو تھوڑا بہت آپ نے کیا ہے، اس پر مطمئن نہ ہو جایئے اور یہ نہ کہنے لگئے کہ ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ ہم نے کر دیا ہے اور اب ہمیں ٹینس اور بلیرڈ کھیلنے دیجیے۔ میں آپ سے یہ کہتا ہوں بلیرڈ کے کمرے میں ہو یا ٹینس کے میدان میں، اس قرض کو ہمیشہ یاد رکھئے جو روزانہ آپ کے حساب میں جمع ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن جو گداگر ہوتے ہیں، وہ اپنی پسند پر اصرار نہیں کر سکتے ہیں۔ جو کچھ آپ نے مجھے دیا ہے، اس پر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جو درخواست میں نے کی ہے اس پر عمل کیجیے۔ اس کپڑے کے پہننے سے نہ ڈریئے جو غریب عورتیں آپ کے لیے کاتتی ہیں۔ اپنے آقاؤں سے نہ ڈریئے کہ اگر آپ کھدر پہنیں گے تو وہ آپ کو

ل یہ گاندھی جی کی اس تقریر سے لیا گیا ہے جو انھوں نے سائنس انسٹی ٹیوٹ بنگلور میں کی تھی اور جہاں طلبا نے انھیں تھیلی پیش کی تھی۔ مرتب

نکال دیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ آدمی بنیں اور اپنے عقیدے پر دنیا کے سامنے مضبوطی سے قائم رہیں۔ مزدلت کی تلاش میں بے زبان لاکھوں انسانوں کے لیے جو آپ کا جذبہ ہے، وہ ہرگز کم نہ ہونا چاہیے۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ ایک کہیں طاقتور لاسلکی آلہ بنا سکتے ہیں، جس کے لیے کسی خارجی تحقیق کی ضرورت نہیں بلکہ داخلی کی ہے۔ اور تمام تحقیقاتیں بےکار ہیں اگر اس داخلی آلے سے اس کا تعلق نہ ہو۔ اور جو آپ کے دلوں کو ان لاکھوں انسانوں کے ساتھ جوڑ نہ سکے۔ جب تک کہ آپ کی تمام تحقیقات کے سامنے لوگوں کا مفاد نہ ہو، اس وقت تک آپ کے تمام کارخانے بقول راجگوپال آچاریہ کے جو انہوں نے مذاق میں کہا تھا، شیطان کے کارخانوں سے زیادہ ثابت ہوں گے۔

(ینگ انڈیا، ۲۱ر جولائی ۱۹۲۷ء)

انکسار اور خاکساری اختیار کرو

سب سے پہلی بات جو طلبا کو سیکھنی ہے، وہ انکسار اور خاکساری ہے، جس کے بغیر وہ اپنے کمالات کا بہتر استعمال نہیں کر سکتے ہیں۔ وہ خواہ کتنے ہی علمی کمالات حاصل کر لیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ جائیں، لیکن اگر انھیں اپنے علم کو انسان کی خدمت کے لیے وقف کرنا ہے تو انکسار از بس ضروری ہے۔ ان میں اچھے طلبا کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، لیکن ان کا وجود غریب، مظلوم ہندوستانی دیہاتیوں کے لیے بےکار ہے۔ تمام دنیا

کا نصب العین یہ رہا ہے کہ انسان کی ذہنی اور روحانی صلاحیتیں خدمت کے لیے سمجھی جاتی ہیں اور انسان کو اپنے ہاتھ پاؤں اپنی روزی کے لیے استعمال کرنے چاہئیں۔ قدیم زمانہ میں وکلا اپنے موکلوں سے قانونی مشورہ کی کوئی فیس نہیں لیتے تھے اور آج بھی بیرسٹر اپنے موکلوں پر اپنی فیس کا دعویٰ نہیں کر سکتے ہیں جو 'آنریریم' کہلاتا ہے۔ اگر طلبا اپنے ملک کی خدمت کرنی چاہتے ہیں تو انھیں اس کوے کی طرح نقلی صاحب بننا زیب نہیں دیتا جو مور کے پر لگا کر مور بنا چاہتا تھا۔ انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ انھیں ایک ایسی قوم کی خدمت کرنی ہے جس کی اوسط آمدنی فی کس لارڈ کرزن کے قول کے مطابق صرف ۴۰ روپے سالانہ ہے۔ وہ یہ خدمت اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب وہ اپنے لیے موٹا کھدر پہننا گوارا کریں اور قیمتی یوروپین وضع کے کپڑے پہننا چھوڑ دیں۔ وہ ایک مہذب انسان کی طرح اپنے ہونے والے خسروں سے جہیز کی بڑی بڑی رقمیں مانگنا چھوڑ دیں۔

(ہریجن، ۲۷ جولائی سنہ ۱۹۳۴ء)

اپنا فرض بجا لاؤ

یہ[1] میرے لیے بڑی ہی خوشی اور طمانیت کی بات تھی کہ تمام مشکلات

---

[1] دیوبند کے طلبا سے گاندھی جی کا خطاب۔ مرتب

کے باوجود ہندوستان بھر میں طلبا کے دلوں کے اندر میرے لیے بڑی محبت اور عزت ہے۔ طلبا نے بہت بڑی حد تک میرے بوجھ کو ہلکا کر دیا ہے۔ لیکن میں اس احساس کو اپنے اندر دبا نہیں سکتا کہ باوجود اس ذاتی محبت کے جو طلبا نے ہر جگہ میرے لیے ظاہر کی ہے اور باوجود اس کے کہ انہوں نے ملک کے غریب سے غریب لوگوں کے ساتھ اپنے کو وابستہ کر دیا ہے، پھر بھی انہیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے، اس لیے کہ تم سے مستقبل کی امیدیں وابستہ ہیں۔ جب تم اپنے کالجوں اور اسکولوں سے فارغ ہو گئے تو تمہیں اس ملک کے غریب باشندوں کی رہنمائی کے لیے پبلک زندگی میں داخل ہونا ہوگا۔ اس لیے میں چاہوں گا کہ تمہیں اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا ہو اور تم اس کا عملی طریقہ پر اظہار کر سکو۔ یہ عجیب و غریب بات ہے اور بہت افسوس ناک بات بھی کہ اکثر طلبا اپنی طالب علمی کے زمانہ میں تو بڑے اعلیٰ جذبات رکھتے ہیں، اور جب وہ اپنی تعلیم ختم کر لیتے ہیں تو وہ جذبات ختم ہو جاتے ہیں ان میں اکثر اپنے نون نمک کی کمائی میں لگ جاتے ہیں۔ یقیناً اس میں کوئی نہ کوئی خرابی ہوگی۔ ایک سبب تو صاف نظر آتا ہے۔ ہر ماہر تعلیم، ہر وہ شخص جسے طلبا سے کوئی نہ کوئی واسطہ رہا ہے، یہ سمجھتا ہے کہ ہمارا نظام تعلیم بہت خراب ہے۔ یہ ملک کی ضروریات اور خصوصاً غریب ہندوستان کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا ہے۔ جو تعلیم دی جاتی ہے، اس میں اور گھر یا گاؤں کی زندگی میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا سوال ہے جس پر تم یا میں اس قسم کے جلسہ میں غور نہیں کر سکتے ہیں

ایک لازمی شرط

ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ سوچنا ہے کہ طلبا کے لیے کیا کرنا ممکن ہے اور ملک کی خدمت کے لیے وہ مزید کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ میرے ذہن میں جو جواب آیا ہے اور یہ بہت سے ایسے لوگوں کے دلوں میں بھی ہوگا جو یہ چاہتے ہیں کہ طلبا اپنی زندگی کا کوئی اچھا نمونہ پیش کریں، وہ یہ ہے کہ طلبا کو اپنا اندرونی جائزہ لینا چاہیے اور اپنے ذاتی کیریکٹر کا خیال کرنا چاہیے۔ شخصی زندگی کی پاکیزگی ایک اچھی تعلیم کے لیے ناگزیر شرط ہے۔ ہزاروں طلبا سے میری ملاقات اور ان کے ساتھ مسلسل خط و کتابت جس میں وہ اپنے تمام اندرونی جذبات نکال کر رکھ دیتے ہیں اور مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں، ان سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم سب سمجھتے ہو گے کہ میرا اس سے کیا مطلب ہے؟ ہماری زبان میں ایک بہت اچھا لفظ ہے جس کے معنی ہیں جو طالب علم کے سمجھے جاتے ہیں، اور وہ لفظ 'برہمچاری' ہے۔ 'ودیارتھی' ایک گڑھا ہوا لفظ ہے اور 'برہمچاری' لفظ کا صحیح ہم معنی نہیں ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ تم جانتے ہوگے کہ برہمچاری کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی ہیں خدا کا متلاشی، ایک ایسا شخص جو اس طرح زندگی بسر کرتا ہے، جس سے وہ کم سے کم وقت میں خدا سے قریب ہو جائے۔ اور دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف ہوں، اس بنیادی سوال پر

بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک شخص جس کا دل پاک نہ ہو، وہ اس عرش الٰہی کے سامنے کبھی نہیں آسکتا ہے۔ ہمارا ویدوں کا پڑھنا سنسکرت کا صحیح علم، لاطینی، یونانی وغیرہ سب بے کار ہوں گے اگر ان سے دل کی مکمل پاکیزگی پیدا نہ ہو۔ تمام علم کا مقصد سیرت کی تعمیر ہونا چاہیئے۔

(ینگ انڈیا ۸ ستمبر ۲۷ء)

خدا پر ایمان

ایک انگریز دوست جو شیموگا میں رہتے تھے اور جنھیں میں پہلے کبھی نہیں جانتا تھا، میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ اگر ہندوستان روحانی اعتبار سے ایک ترقی یافتہ ملک ہے تو کیا بات ہے کہ وہ یہاں کے طلبا میں خدا کی معرفت کا صحیح جذبہ نہیں پاتے ہیں، اور کیا وجہ ہے کہ اکثر طلبا یہ بھی نہیں جانتے کہ بھگوت گیتا کیا ہے؟ میں نے ان کی اس تحقیق کا جو دیانتدارانہ جواب اور عذر ہو سکتا تھا، وہ پیش کیا لیکن میں وہ جواب نہیں دینا چاہتا ہوں، اور نہ اس بڑی اور مہلک کمزوری کا کوئی عذر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی اور با ادب گزارش جو میں ان طلبا کے سامنے جو یہاں اس وقت موجود ہیں، یہ کروں گا کہ تم اپنے دلوں کا جائزہ لو اور جہاں تمہیں یہ معلوم ہو کہ میری باتیں صحیح ہیں، وہیں سے تم اپنی اصلاح اور اپنی تعمیر شروع کر دو۔ اور تم میں سے جو ہندو ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ بڑی اکثریت ہندوؤں کی ہے، وہ گیتا کے اس سیدھے سادے،

تمہیں اور میرے لیے روحانیت سے بھرے ہوئے پیغام کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ تجربہ اور میں کہوں گا کہ بلا استثنا ان سب لوگوں کا تجربہ جنھوں نے واقعتاً اپنے دلوں کو صاف کرنے کے لیے تلاش حق کی ہے، اس وقت تک ایک ناکام کوشش ہوگی جب تک اس کے ساتھ اس قادر مطلق کی بارگاہ میں دل سے دعا بھی نہ مانگی جائے۔ اس لیے تم جو کچھ بھی کرو، خدا پر اپنا ایمان رکھ کر کرو۔ میں تم سے بحث نہیں کر سکتا، اس لیے کہ سچ پوچھو تو یہ بات بحث سے بالاتر ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے اندر ایک عجز و انکسار کا جذبہ پیدا کرو اور دنیا کے بڑے بڑے معلمین، رشیوں اور دوسرے لوگوں کے تجربوں کو ٹھکرا نہ دو اور انھیں اوہام باطلہ میں مبتلا نہ سمجھو۔ اور اگر تم ایسا سمجھو گے تو اس کے بعد میں تم سے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ آئینہ کی طرح تم پر واضح ہو جائیگا۔ یہ تمہاری دیانت کا امتحان ہوگا اگر تمہیں خدا پر یقیناً ایمان ہے تو تم اس کی ادنیٰ ترین مخلوق کے ساتھ ہمدردی کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہو۔ اور خواہ یہ چرخا اور کھدر ہو، یا چھوت چھات کا دور کرنا، کامل نشہ بندی ہو یا بیواؤں اور بچوں کی شادی سے متعلق سماجی اصلاح کا کام، تم پاؤ گے کہ ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔

میں سمجھتا ہوں کہ صرف ایک ادارے میں تمہاری تعداد ۱۴۰۰ سے زاید ہے۔ ذرا خیال کرو کہ یہ ۱۴۰۰ اگر آدھ گھنٹہ بھی روزانہ کتائی پر صرف کریں، تو اس ملک کی مادی دولت میں کتنا اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ بھی سوچو کہ یہ ۱۴۰۰ جنھیں اچھوت کہا جاتا ہے، ان کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں اور اگر یہ سب کے سب ۱۴۰۰ نوجوان یہ عہد کر لیں اور

وہ ایسا کر سکتے ہیں کہ انھیں بچپنے کی شادی سے کوئی واسطہ نہ ہوگا، تو خیال کرو کہ تم اپنے گرد و پیش کے سماج میں کتنا بڑا سدھار کر رہے ہو۔ اگر تم میں سے ہر... ۱۴ یا ان کی ایک معقول تعداد اپنے خالی اوقات میں یا اتوار کے دنوں میں کچھ حصہ ان لوگوں کے پاس جانے میں صرف کر سکیں جو نشہ پینے کے عادی ہیں اور کسی اچھے انداز میں ان کے دلوں تک پہنچ سکیں تو خیال کرو کہ تم ان کی اور اپنے ملک کی کتنی بڑی خدمت انجام دے رہے ہو۔ یہ سب باتیں تم باوجود موجودہ خراب تعلیم کے کر سکتے ہو۔ اور نہ ان کے کرنے میں تمہیں بہت کوشش کی ضرورت ہے، سوائے اس کے کہ تمہیں تھوڑا سا اپنا دل بدلنا ہوگا اور سیاسی دنیا کی اگر مروجہ اصطلاح استعمال کی جائے تو اپنا 'نقطہ نظر' بدلنا ہوگا۔

('ینگ انڈیا' ۸ر دسمبر ۱۹۲۷ء)

طلباء کا عطیہ

میں تمہارا نہایت دل سے شکر گزار ہوں کہ تم نے 'درِدرنارائن' (مفلسوں کے دیوتا) کے لیے مجھے یہ عطیے دیئے ہیں....

لیکن یہ تھیلی تمہاری اس محبت کا جو میرے سے تمہیں ہے، پہلا اور آخری ثبوت نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ میرے لیے یہ بہت افسوس کا مقام ہوگا اگر یہ تمہاری محبت کا آخری ثبوت ہوگا اس لیے کہ مجھے اس روپے کی مطلق

ضرورت نہیں، اگر وہ کھدر جو اس روپے کو لاکھوں فاقہ زدوں میں تقسیم کرکے تیار کیا گیا اور تم نے اسے استعمال نہیں کیا۔ چرخے پر زبانی اعتقاد کے اظہار سے اور مربیانہ طریقہ پر مجھے کچھ روپے دیکر نہ اس سے سوراج مل سکتا ہے اور نہ اس سے لاکھوں محنت کش، فاقہ زدہ انسانوں کی بڑھتی ہوئی غریبی کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ میں نے غلط کہا، میں نے لاکھوں محنت کش انسانوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کاش یہ ان کی صحیح تصویر ہوتی! بدقسمتی سے چونکہ ہم نے اپنے لباس کے مذاق میں تبدیلی نہیں کی ہے، ہم نے ان لاکھوں فاقہ زدہ انسانوں کے لیے سال بھر محنت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں پیدا کیا ہے۔ ہم نے انھیں کم سے کم سال میں چار مہینے کی ایک ایسی چھٹی دیدی ہے جس کی انھیں ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرے تخیل کی کوئی پیداوار نہیں بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اگر تم ایسے ہموطنوں کی بات کو نہ بھی مانو جو ان عوام میں گھومے پھرے ہیں، لیکن جسے بہت سے انگریز حکمرانوں نے بھی بار بار دہرایا ہے۔ اس لیے اگر میں یہ تھیلی لے بھی لوں اور اسے فاقہ زدہ بہنوں میں تقسیم بھی کردوں تو اس سے مسئلہ کا حل نہ ہوگا برعکس اس کے اس سے وہ اپنی روحانی دولت سے محروم ہو جائیں گی۔ وہ فقیر اور ہمیشہ خیرات پر زندگی بسر کرنے کی عادی ہو جائیں گی۔ خدا ایسے مرد، عورت یا ایسی قوم پر رحم کرے جو خیرات پر زندگی بسر کرنا سیکھ جائے۔ جو ہم کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنی ان بہنوں کے لیے جو اپنے گھروں میں بیٹھی ہیں، کام مہیا کرنا چاہتے ہیں اور یہی ایک ایسا کام ہے جو تم ان

لہ یہ بچھایا کہ وہ تحریک گاندھی جی کی تقریر سے لیا گیا ہے۔ مرتب

سب کے لیے مہیا کر سکتے ہو۔ یہ باعزت اور دیانتدارانہ کام ہے اور یہ بہت اچھا کام ہے۔ ایک آنہ تمہارے لیے کچھ نہ ہو۔ تم اسے پھینک دیتے ہو اور ٹرام میں بیٹھ کر بے کار وقت بھی گنواتے ہو۔ بجائے اس کے کہ ۲، ۳، ۴ یا ۵ میل، جیسی صورت بھی ہو، چلو اور ورزش کی ورزش بھی ہو۔ لیکن یہی اکنی اگر وہ کسی غریب بہن کی جیب میں جیب پڑ جاتی ہے تو کھیل لاتی ہے۔ وہ اس کے لیے محنت کرتی ہے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے خوش نما سوت کات کر مجھے دیتی ہے، جس کے پیچھے ایک تاریخ ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا سوت ہوتا ہے جس سے بادشاہوں اور بڑے بڑے لوگوں کے پہننے کے لیے کپڑا بن سکتا ہے۔ کارخانہ کی بنی ہوئی ململ کا ایک تھان، ہو، اس کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی۔ میں تم سے اس ایک موضوع پر اب اس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا، اگرچہ یہ میرے لیے بہت بڑا موضوع ہے۔ اور اس میں تقریباً میرا سارے کا سارا وقت لگ جاتا ہے۔ تمہاری یہ تھیلی میرے لیے مدد نہیں بلکہ رکاوٹ کا باعث ہوگی اگر اس سے تمہارے اُس ارادے کا اظہار نہ ہو۔ اگر تم نے اب تک ایسا ارادہ نہیں کیا ہے کہ تم سوائے کھدر کے اور کچھ نہیں پہنو گے۔

میں اس خیال سے دھوکہ نہیں کھا سکتا کہ تم کھدر کے اس پیغام پر اس وجہ سے اعتقاد رکھتے ہو کہ تم نے مجھے یہ تھیلی پیش کی اور تم نے میری عزت افزائی کی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس پر عمل بھی کرو۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ لوگ تمہارے بارے میں، جو تم ہندوستان کے مایۂ ناز ہو۔ تم نے یہ روپیہ مجھے خوش کرنے کے لیے دیا ہے اور تم نہ کھدر پہننا چاہتے ہو اور نہ اس پر تمہیں کوئی اعتقاد ہے۔ تم اس پیشین گوئی کو پورا نہ کرو جو تامل ناڈ کے ایک ممتاز سیوت اور میرے عزیز دوست نے کی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب میں مردں گا تو میری لاش جلانے

بکھیڑے اور کسی لکڑی کی ضرورت نہ ہو گی بلکہ یہ چرخے ہی کافی ہوں گے جو میں تقسیم کر رہا ہوں۔ اُس کا چرخے پر کوئی اعتقاد نہیں ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ جو لوگ چرخے کا نام لیتے ہیں، وہ صرف میرے خیال سے لیتے ہیں۔ یہ ایک ایماندارانہ رائے ہے۔ یہ ایک بڑا حادثہ ہوگا اگر کھدر کی تحریک ایسی ہی ثابت ہوئی اور تم اس حادثہ کے براہِ راست ذمہ دار ہوگے اور اس جرم میں برابر کے شریک ہوگے۔ یہ ایک قومی خودکشی ہوگی۔ اگر تمہیں چرخے پر سچا اعتقاد نہیں ہے، تو اسے نہ قبول کرو۔ یہ تمہاری محبت کا صحیح اظہار ہوگا، اس سے میری آنکھیں کھل جائیں گی اور میں ہر طرف یہ آواز لگاتا پھروں گا: "تم نے چرخے سے انکار کر کے دَرِدر نارائن (غریبوں کے دیوتا) سے انکار کیا ہے۔ لیکن اگر اس کے بارے میں کوئی دھوکہ ہے تو اس سے مجھے اور اپنے دونوں کو اس تکلیف، اس ذلت اور اس بے عزتی سے بچاؤ۔ یہ ایک بات ہے، لیکن تمہارے اس ایڈریس میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔

بچپن کی بیوگی

تم نے بچپن کی شادی اور بچپن کی بیوگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ تامل کے ایک فاضل شخص نے مجھے لکھا ہے کہ میں طلبا کے سامنے بچپن کی بیوگی پر تقریر کروں۔ اس نے کہا ہے کہ اس صوبہ میں بچپن کی بیوگی کی مصیبت ہندستان کے اور صوبوں سے کہیں زیادہ ہے۔ میں نے ابھی تک اس بیان کی تصدیق

نہیں کی ہے۔ تم مجھ سے زیادہ بہتر جان سکتے ہو۔ لیکن اے نوجوانو! میں
تم سے جو کچھ چاہتا ہوں، وہ یہ کہ تم میں تھوڑی جاں نثاری پیدا ہونی چاہیے
اگر تم میں یہ ہے تو میں ایک تجویز رکھنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم میں سے
اکثر شادی شدہ ہوں گے اور تم میں سے ایک خاصی تعداد 'برہمچاری' ہوگی۔ مجھے
خاصی تعداد کہنا پڑا، اس لیے کہ میں طلبا کو جانتا ہوں۔ ایک طالب علم جو اپنی
کسی بہن پر بری نظر اٹھاتا ہے، وہ 'برہمچاری' نہیں ہے۔ میں تم سے یہ عہد
لینا چاہتا ہوں کہ تم کسی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرو گے جو بیوہ نہیں ہے۔
تم ایک بیوہ لڑکی تلاش کرو گے اور اگر تمہیں کوئی ایسی لڑکی نہیں ملے گی تو
تم شادی کا ہی نہیں کرو گے۔ یہ ارادہ کرو اور اس کا دنیا کے سامنے اعلان کرو،
اس کا اپنے والدین کے سامنے اعلان کرو اگر وہ موجود ہوں، یا پھر اپنی بہنوں
کے سامنے۔ میں انہیں بیوہ لڑکیاں کہتا ہوں، اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ
ایک دس یا پندرہ برس کی بچی جس نے اس نام نہاد شادی کے لیے اپنی مرضی
کا اظہار نہیں کیا ہے، اور جو شادی کے بعد کبھی اپنے نام نہاد شوہر کے ساتھ
نہیں رہی ہے، اور یکبارگی بیوہ قرار دے دی گئی ہے، وہ حقیقت میں بیوہ
نہیں ہے۔ یہ اس اصطلاح کا بے جا استعمال ہے، زبان کا غلط استعمال
ہے اور ایک بے حرمتی اور گستاخی ہے، 'بیوہ' کا لفظ ہندو مذہب میں
ایک خاص تقدس رکھتا ہے۔ میں ایک سچی بیوہ کی دل سے قدر کرتا ہوں جیسے کہ مسز
راما بائی راناڈے آنجہانی منصف، جو سمجھتی تھیں کہ بیوہ ہونے کے کیا معنی ہیں۔ لیکن
ایک ۹ برس کی بچی کچھ نہیں جانتی کہ شوہر کو کیسا ہونا چاہیے۔ اگر یہ صحیح نہیں ہے
کہ صوبہ میں ایسی بچپن کی بیوائیں ہیں، تو پھر میرا سارا معاملہ ختم ہو جاتا
ہے۔ لیکن اگر ایسی بچپن کی بیوائیں ہیں تو پھر تمہارا فرض ہو جاتا ہے کہ اگر

تم ہمیں اس لعنت سے نجات دلانا چاہتے ہو تو تم ایسی بیوہ لڑکی سے شادی کرو گے۔ میں اتنا وہمی ہوں اور اس بات کا یقین رکھتا ہوں کہ کوئی قوم جو ایسے گناہ کرتی ہے، وہ جسمانی اعتبار سے اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے ہی گناہوں نے مل کر ہمیں اس غلامی کے درجہ تک پہنچایا ہے۔ تمہیں دارالعوام کی طرف سے اچھے سے اچھا دستور بھی جو تم تصور کر سکتے ہو، دے دیا جائے لیکن جب تک اس پر عمل کرنے کے لیے اچھے مرد اور عورتیں نہ ہوں، اس وقت تک یہ بے کار رہے گا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم لوگ اس قابل ہیں کہ اپنے اوپر یا دوسروں پر حکومت کر سکیں یا ایک ایسی قوم کی قسمت بنا سکیں جو ۳۰ کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے، جب تک ہم میں ایک بیوہ بھی ایسی موجود ہے جو اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنا چاہتی ہو لیکن وہ ایسا کرنے سے قطعی معذور رہے۔ یہ مذہب نہیں بلکہ مذہب کے خلاف ہے۔ میں یہ باتیں ہندو مذہب کے جذبے سے متاثر ہو کر کہتا ہوں۔ یہ مت سمجھنا کہ میرے اندر یہ مغربی روح ہے جو بول رہی ہے۔ میں ہندوستانی روح سے بھرپور ہو کر بول رہا ہوں۔ میں نے مغرب سے بہت سی باتیں حاصل کی ہیں لیکن یہ ان میں سے نہیں ہے۔ ہندو مذہب میں اس قسم کی بیوگی کی کوئی جگہ نہیں۔

بچپن کی شادی

میں نے جو کچھ بچپن کی بیوگی کے بارے میں کہا ہے، اس کا اطلاق تمام تر بچپن کی شادی پر بھی ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے نفس پر اتنا

قابو رکھ سکو گے کہ تم کسی ۱۶ برس سے کم عمر لڑکی کے ساتھ شادی نہ کرو گے۔ اگر میں کر سکتا تو میں اسے کم سے کم ۲۰ سال رکھتا۔ بیس برس بھی ہندوستان کے لیے کم ہے۔ لڑکیوں کے قبل از وقت بلوغ کے ہم ذمہ دار ہیں نہ کہ ہندوستان کی آب و ہوا، اس لیے کہ میں ۲۰ برس کی عمر کی لڑکیوں کو جانتا ہوں جو پاک و صاف ہیں اور جو اپنے ارد گرد کی آندھیوں میں صحیح سلامت رہی ہیں۔ ہمیں اس قبل از وقت بلوغ کے خیال کو اس قدر سختی سے نہیں بگڑنا چاہیئے۔ بعض برہمن طلبا مجھ سے کہتے ہیں کہ وہ اس اصول پر عمل نہیں کر سکتے ہیں انھیں سولہ برس کی برہمن لڑکیاں نہیں مل سکتی ہیں۔ بہت کم برہمن اس مدت تک اپنی لڑکیوں کو بن بیاہی رکھتے ہیں۔ برہمن لڑکیوں کی اکثر ۱۰، ۱۲ اور ۱۳ برس کی عمر سے قبل ہی شادی کر دی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں میں برہمن لڑکے سے کہتا ہوں "تم برہمن ہونا چھوڑ دو اگر تم اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتے ہو۔ ایک سولہ برس کی برہمن لڑکی کو پسند کرو جو بچپن میں بیوہ ہو گئی ہے۔ اگر تمہیں برہمن بیوہ لڑکی نہ ملے جو اس عمر کو پہنچ گئی ہو، تو پھر جس لڑکی سے چاہو، شادی کر لو۔ اور میں تم سے کہتا ہوں کہ ہندوؤں کا خدا اس لڑکے کو معاف کر دیگا جس نے اپنی ذات سے باہر شادی کی ہے، بجائے اس کے کہ اس نے بارہ برس کی لڑکی کو خراب کیا ہو۔ اگر تمہارا دل صاف نہیں ہے اور تم اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتے ہو، تو تم تعلیم یافتہ آدمی نہیں ہو ..... اور تعلیم بغیر کیریکٹر کے کیا ہے؛ اور کیریکٹر بغیر شخصی پاکیزگی کے کچھ نہیں ہے۔

سگریٹ پینے کی خرابیاں

سٹالن گراڈ کے ایک پروفیسر کی درخواست پر میں چند باتیں سگریٹ نوشی اور کافی اور چائے پینے کے بارے میں بھی کہنا چاہتا ہوں۔ یہ زندگی کی ضروریات میں نہیں ہیں۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو ایک دن میں دس پیالیاں کافی کی پی ڈالتے ہیں۔ کیا یہ صحت مندانہ نشوونما کے لیے یا اپنے کام کے لیے جاگتے رہنے کی غرض سے ضروری ہے؟ اگر انھیں جاگتے رہنے کے لیے کافی پینا ضروری ہے تو انھیں کافی یا چائے نہ پینی چاہیے بلکہ سو جانا چاہیے۔ ہمیں ان چیزوں کا غلام نہیں بننا ہے۔ بلکہ اکثر لوگ جو کافی یا چائے پیتے ہیں، وہ ان کے غلام بن جاتے ہیں۔ سگار یا سگریٹ خواہ باہر کے بنے ہوں یا دیسی، ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ سگریٹ پینا افیون کی طرح ہے، اور سگار جو تم پیتے ہو، اس میں تو افیون کا اثر کہیں زیادہ ہے۔ وہ تمہارے اعصاب پر چھا جاتا ہے اور تم انھیں پھر بعد میں چھوڑ نہیں سکتے ہو۔ ایک طالب علم بھی اپنے منہ کو دھوئیں کی چمنی بنا کر کیسے بگاڑ سکتا ہے! اگر تم سگار اور سگریٹ یا کافی اور چائے کی ان عادتوں کو چھوڑ دو تو تم خود دیکھو گے کہ تم کتنا پیسہ بچاتے ہو۔ ٹالسٹائے کی کہانی میں ایک شرابی قتل کرنے میں اس لیے تامل کرتا ہے کہ اس نے ابھی اپنا سگار نہیں پیا ہے۔ لیکن جب وہ ایک کش لے لیتا ہے تو مسکراتا ہوا اٹھتا ہے اور کہتا ہے: "میں کیسا بزدل ہوں؟" چھرا اٹھاتا ہے اور اپنا کام کر گزرتا ہے۔

ٹالسٹائے نے اپنے تجربہ سے یہ باتیں کہی ہیں۔ اس نے کوئی ایسی چیز نہیں لکھی ہے جس کا اسے ذاتی تجربہ نہ ہوا ہو۔ اور وہ سگار اور سگریٹ کا شراب سے زیادہ مخالف ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا کہ شراب اور تمباکو میں شراب کم درجہ کی برائی ہے۔ نہیں، اگر سگریٹ خبیث ہے تو شراب شیطان ہے۔

('ینگ انڈیا'۔ ۱۵ر ستمبر ۱۹۲۷ء)

طلباء کی کانفرنس

طلبائے سندھ کی چھٹی کانفرنس کے سکریٹری نے میرے پاس ایک مطبوعہ مراسلہ بھیجا ہے اور مجھ سے پیغام مانگا ہے۔

میں ذیل میں اس گشتی مراسلے کے ضروری حصے نقل کر رہا ہوں جو بہت خراب چھپا ہوا ہے اور اکثر اس میں ایسی غلطیاں ہیں جو طلباء کی جماعت کے لیے مشکل سے قابل معافی ہو سکتی ہیں۔

"اس کانفرنس کے منتظمین کانفرنس کو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ دل چسپ اور مفید بنانے کی کوشش کر رہے ہیں ..... ہم تعلیمی مباحث کا ایک سلسلہ بھی رکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں اور آپ سے درخواست کرتے ہیں

کہ آپ ہمیں ..... سے مستفید ہونے کا موقع دیجیے۔ تعلیم نسواں کا مسئلہ سندھ میں ایک خاص توجہ کا محتاج ہے۔ ہم طلبا کی اور عزیز ترتوں کی طرف سے غافل نہیں ہیں۔ کھیل کود کے مقابلوں کا بھی انتظام کیا گیا ہے اور تقریری مقابلوں کے ساتھ یہ اُمید کی جاتی ہے کہ کانفرنس اور دل چسپی کا باعث ہوگی۔ ہم نے ڈراما اور موسیقی کو بھی اپنے پروگرام سے خارج نہیں کیا ہے..... اُردو اور انگریزی کے ڈرامے پیش کئے جائیں گے۔"

میں نے کوئی ایسا جملہ بھی حذف نہیں کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ کانفرنس کیا کرنا چاہتی ہے پھر بھی ایک شخص کوئی ایسی بات بھی کانفرنس کے اندر نہیں پا سکتا ہے، جو طلبا کی جماعت کے لیے مستقل دل چسپی کا باعث ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ڈراما، موسیقی اور کھیل کود کے پروگرام سب بڑے "عظیم الشان پیمانہ" پر رکھے گئے تھے۔ والدین کے اندر للنظر لغیظ میں نے اس مراسلہ ہی سے لیا ہے۔ مجھے اس میں بھی شبہ نہیں کہ کانفرنس میں تعلیم نسواں پر بھی دل چسپ مضمون پڑھے گئے۔ لیکن جہاں تک گشتی مراسلہ کا تعلق ہے، اس میں اس خطرناک 'ذیتی لینی' (جہیز) رسم کا کوئی تذکرہ نہیں، جس سے طلبا نے ابھی تک نجات نہیں پائی ہے اور جس نے بہت سی حیثیتوں سے سندھی لڑکیوں کی زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے اور لڑکیوں کے والدین کو ایک بڑی مصیبت میں پھنسا رکھا ہے۔ مراسلہ میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ کانفرنس طلبا کے اخلاق کے سلسلہ میں بھی کچھ کرنا چاہتی ہے۔ اور نہ اس سے یہ کہیں ظاہر ہوتا ہے کہ کانفرنس طلباء

طلبا کو قوم کے مندر معمار بنانا چاہتی ہے۔ یہ سندھ کے لیے کچھ کم قابل تعریف نہیں کہ یہاں سے بہت سے اداروں کو لایق پروفیسر مل رہے ہیں، اور انھی سے مزید کی توقع بھی ہوتی ہے جو زیادہ دیتے ہیں۔ اور میں اپنے سندھی دوستوں کا خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے گجرات ودیا پیٹھ کے لیے ایسے اچھے رفقا دیئے، لیکن میں صرف پروفیسروں اور کھدر کے کام کرنے والوں پر قناعت نہیں کرسکتا۔ سندھ میں ان کے اپنے سادھو و سوامی ہیں، یہ بہت سے اور بڑے بڑے مصلحین پر فخر کرسکتا ہے۔ لیکن طلبا غلطی کریں گے اگر وہ صرف سندھ کے سادھوؤں اور مصلحوں کی خوبیوں کو اپنانے پر قناعت کریں، انھیں قوم کے معمار بننا ہے۔ مغرب کی اندھی تقلید، صحیح اور اچھی انگریزی بولنے اور لکھنے کی صلاحیت آزادی کے مندر میں ایک اینٹ کا بھی اضافہ نہیں کرے گی۔ طلبا کی جماعت جو فاقہ زدہ ہندوستان کے لحاظ سے بہت زیادہ خرچیلی تعلیم حاصل کررہی ہے اور یہ تعلیم ایک بہت چھوٹی سی جماعت حاصل کرسکتی ہے، وہ بھلا قوم کو اپنا خون دینے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرسکتی ہے!

طلبا کو ہر طرح کی اصلاحات کے معاملے میں اور ہر اچھائی کو جو قوم کے اندر ہے، اس کے محفوظ رکھنے میں اور ان لاتعداد برائیوں کے دور کرنے میں جو سماج کے اندر پیدا ہوگئی ہیں، سب سے آگے آگے ہونا چاہیے۔

ان کانفرنسوں سے ان کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور وہ حقیقتیں انھیں نظر آنی چاہئیں جو ان کے سامنے ہیں۔ ان سے انھیں ان باتوں کا خیال آنا چاہیے جو وہ ان جماعتوں کے اندر جو بدقسمتی ماحول کے مطابق ہوتی ہیں، انھیں جاننے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ وہ ان کانفرنسوں میں شاید

ان مسائل پر بحث نہ کرسکیں جو خالص سیاسی سمجھے جاتے ہیں لیکن وہ سماجی اور معاشی مسائل کا مطالعہ کرسکتے ہیں اور ان پر بحث بھی کر سکتے ہیں جو ہماری نسل کے لیے اسی قدر اہم ہیں جس قدر کہ بڑے سے بڑے سیاسی مسئلے۔ ایک قومی تعمیر کے پروگرام میں قوم کا کوئی حصہ نظر انداز نہیں ہوسکتا ہے۔ طلبا کو ان کروڑوں بے زبان انسانوں کا ساتھ دینا ہے۔ انھیں ایک صوبہ یا ایک شہر یا ایک جماعت یا ایک ذات کے طور پر نہیں سوچنا ہے بلکہ ایک ایسے برِاعظم اور ان کروڑوں کی تعداد میں سوچنا ہے جن میں اچھوت بھی ہیں، شرابی بھی ہیں، آوارہ گرد لوگ بھی ہیں، حتیٰ کہ طوائفیں بھی ہیں۔ جن کے وجود کا ہم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے۔ طلبا قدیم زمانہ میں 'برہمچاری' کہلاتے تھے، یعنی وہ لوگ جنھیں خوفِ خدا ہوتا تھا۔ ان کی راجا مہاراجا اور سب بڑی عزت کرتے تھے۔ ان کی کفالت قوم کے ذمہ ہوتی تھی اور اس کے عوض وہ قوم کو سوگنا طاقتور روح، طاقتور دماغ اور طاقتور جسم رکھنے والے لوگ دیتے تھے۔ طالب علم آج کل کے زمانہ میں جہاں کہیں بھی وہ پست اقوام کے اندر ہوتے ہیں، ان کی اُمید سمجھے جاتے ہیں اور ہر شعبۂ زندگی میں وہ اصلاحات کے لیے جان دینے کو تیار ہوتے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ ہندوستان میں اس کی مثالیں موجود نہیں ہیں، بلکہ جو ہیں وہ بہت کم ہیں۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ طلبا کی کانفرنسیں اس قسم کے منظم کام کے لیے ہونی چاہئیں جو برہمچاریوں کے مرتبے کے مناسب ہوں۔

('ینگ انڈیا'، ۹ جون ۱۹۲۷ء)

تزکیۂ نفس

تین طالب علموں نے مل کر مہاتما گاندھی جی کو خط لکھا تھا کہ —
"ہم ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ مہربانی کرکے 'نوجیون' اخبار کے ذریعہ ہمیں بتایئے کہ بغیر اپنا مقام چھوڑے یا تعلیم منقطع کئے ہم یہ کیسے کرسکتے ہیں۔" ان طلبار نے اپنے نام، عمر اور پتے بھی دیئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "مہربانی فرماکر ہمارے نام اور پتے ظاہر نہ کیجئے۔ نہ آپ ہمارے پتوں پر براہِ راست خط لکھئے۔ ہم جن حالات میں رہتے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ ہم اپنے خط بھی نہیں منگا سکتے ہیں۔" مجھے ایسے طلبار کو کوئی مشورہ دینا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ میں ایسے لوگوں سے کیا کہہ سکتا ہوں جنھیں اپنے خطوں کے منگانے کی بھی آزادی نہیں ہے۔ پھر بھی میں اتنا کہہ سکتا ہوں: تزکیۂ نفس سب سے بہتر خدمت ہے جو ایک شخص اپنے ملک کی انجام دے سکتا ہے۔ کیا ان طلبا نے ایسے تزکیۂ نفس کی کوشش کی ہے؟ کیا ان کے دل صاف ہیں؟ کیا وہ ان برائیوں سے دور رہے ہیں جو طلبار میں ہوتی ہیں؟ کیا وہ سچائی کے عہد کا ایفا کرتے ہیں؟ یہ دیکھ کر کہ وہ اپنے خطوں کا جواب پانے سے بھی ڈرتے ہیں، ان کے یہاں بہت بڑی خرابی معلوم ہوتی ہے۔ طالب علموں کو اپنا ڈر دور کردینا چاہئے۔ انھیں اپنے بزرگوں کے سامنے اپنے خیالات مضبوطی اور ہمت کے ساتھ پیش کرنا سیکھنا چاہیئے۔ کیا وہ کھدر کا استعمال کرتے ہیں؟ کیا وہ سوت کاتتے ہیں؟ اگر

وہ کاتتے ہیں اور کھدر کا استعمال کرتے ہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ملک کی خدمت میں حصہ لے رہے ہیں۔ کیا وہ اپنے خالی وقتوں میں کسی بیمار پڑوسی کی تیمارداری کرتے ہیں؟ کیا وہ اگر ان کے گرد و پیش خراب باتیں ہیں، یا ان کے گھر کے آس پاس گلیاں گندی ہیں، اپنے کام سے وقت بچا کر اپنے ہاتھ سے ان کی صفائی کرتے ہیں؟ ایسے بہت سے سوالات پوچھے جا سکتے ہیں، اور اگر وہ ان کا صحیح جواب دے سکتے ہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اب بھی ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔

(نوجیون، ۸ جولائی ۱۹۲۸ء)

طلبا اور آزادی

بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ چین کے طلبا تھے جنہوں نے اس بڑے ملک میں آزادی کے لیے لڑائی لڑی۔ یہ مصر کے طلبا ہیں جو آج مصر کی حقیقی آزادی کی جدوجہد میں پیش پیش ہیں۔ ہندوستان کے طالب علموں سے اس سے کچھ کم امید نہیں کی جا سکتی ہے۔ وہ اسکول اور کالج جاتے ہیں یا انھیں جانا چاہیے، اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ خدمت کے لیے انھیں قوم کی روح بننا ہے۔

طلبا کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نتائج کا خوف ہے جو اکثر خیالی ہوتے ہیں، اس لیے سب سے پہلا سبق طالب علموں کو جو سیکھنا

ہے، وہ یہ کہ وہ اپنے خوف دور کریں۔ وہ طالب علم آزادی کبھی نہیں حاصل کر سکتے جو اخراج، ناداری اور موت سے بھی ڈرتے ہیں۔ سرکاری اداروں کے طلبار کے لیے سب سے بڑا خوف اخراج کا ہے انھیں سمجھنا چاہیئے کہ تعلیم بغیر ہمت کے ایک موم کے کھلونے کی طرح ہے جو دیکھنے میں تو خوشنما معلوم ہوتا ہے لیکن کسی گرم چیز کے ہاتھ لگتے ہی وہ پگھل جاتا ہے۔

("ینگ انڈیا" ۱۲ر جولائی ۱۹۲۸ء)

طالب علموں کا جوش

ملک کی زندگی کے جس طرح اور حصوں میں اسی طرح طلبا میں بھی بیداری کے آثار اور کام کرنے کی خواہش نظر آرہی ہے۔ یہ ایک نیک فال ہے لیکن جلد ہی یہ برے شگون میں بھی بدل سکتا ہے۔ بھاپ، اگر قابو میں لے آئی جائے۔ تو اس سے ایک بھاپ کا انجن چل سکتا ہے جو اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بوجھ بھی کھینچ لے جاتا ہے لیکن اگر وہ بھاپ قابو میں نہ لائی جا سکے تو یا تو وہ ضایع جائیگی یا اس سے تباہی آسکتی ہے۔ اسی طرح اگر یہ نیا جوش طلبار میں اور اسی طرح کی اور دوسری جماعتوں میں ٹھیک طور سے جمع نہ کیا جائے اور اسے سیدھے راستے پر نہ لایا جائے تو یا تو یہ ضایع ہو جائے گا یا خود ہماری تباہی کا باعث ہوگا۔ لیکن اگر یہ ٹھیک طور سے جمع کیا جائے اور کام میں لایا جائے تو اس سے حیب

ضرورت ہو تو حد سے زیادہ طاقت اور تیزی پیدا کی جا سکتی ہے۔

میرے دل میں برطانوی حکومت کے موجودہ نظام کی نہ محبت ہے اور نہ عزت میں نے اسے شیطان کا کھیل کہا ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ چاہا ہے کہ یہ برباد ہو جائے اور ختم ہو جائے۔ یہ بہت اچھا ہو گا کہ اگر یہ بربادی ہندوستان کے نوجوان مرد اور عورتوں کے ہاتھوں ہو۔ یہ تمام تر طلبار کے ہاتھ میں ہے کہ ایسی طاقت پیدا ہو۔ اگر وہ اس بھاپ کو جو ان کے اندر پیدا ہو رہی ہے، قابو میں رکھیں اور اسے جمع کریں، تو اس سے خود وہ قوت پیدا ہو گی جس سے ہماری آزادی حاصل ہو سکے گی۔

جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں طلبار اس پُرامن جدوجہد میں حصہ لینا چاہتے ہیں جو مادرِ وطن کی آزادی کے لیے ہو رہی ہے۔ یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ میرا یہ خیال صحیح نہیں، جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ پھر بھی صحیح ہو گا خواہ یہ جدوجہد پُرامن ہو یا آتش آمیز یعنی خواہ وہ اخلاقی قوت کے ہتھیاروں سے لڑی جاتی ہو یا جبر و قوت کے ہتھیاروں سے۔ اگر ہمیں ہتھیار سے بھی لڑنا ہو تو اس وقت ضبطِ نفس کی اور اس بھاپ کے جمع کرنے کی اور بھی ضرورت ہو گی۔ دونوں طریقے ایک حد تک یکساں ہیں۔ خلفائے اسلام، عیسائی صلیبیوں اور بہت دور کی تاریخ میں نہ جائیے، کرامویل اور اس کے سپاہیوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اپنے زمانہ کی مثالیں بھی لیجیے:

لینن، سُن یات سین اور دوسرے اس قبیل کے لوگوں نے سادگی، قوتِ برداشت، ترکِ لذات، جذبۂ ایثار اور ایک ایسے نظامِ زندگی کی مثال پیش کی ہے جس سے یوگیوں کی جماعت کو بھی شرم آئے۔ ان کے پیروؤں نے بھی وفاداری اور ضبط کی ایسی ہی شاندار مثال قائم کی ہے۔

ہمیں بھی یہی کرنا ہوگا۔ ہماری قربانی اب تک کی تقریباً کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ ہماری ضبط کی صلاحیت بھی کچھ بہت زیادہ نہیں، ہماری سادگی محدود، اور ہمارا جذبہ بھی ویسا ہی سطحی۔ ہماری پامردی اور استقلال ابھی ابتدائی منزل میں ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ میں جانتا ہوں جو کچھ انھوں نے اب تک حاصل کیا ہے، انھیں میری طرف سے کسی غلط فہمی میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک دوست جو دوسرے دوست کے بارے میں مبالغہ سے کام لے، وہ دوست نہیں ہوتا بلکہ خوشامدی ہوتا ہے اور دوستی کا حق کھو بیٹھتا ہے۔ صحیح معنی میں ایک دوست کو اس کی کمزوریاں بتانے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے اور ان کے دور کرنے میں مدد کرنی چاہیے، جو اس کا فرض ہے۔

('نوجیون'۔ ۳ر جنوری ۱۹۲۹ء)

بائیکاٹ اور طلبار

ایک کالج کے پرنسپل صاحب لکھتے ہیں :-

" بائیکاٹ تحریک کے چلانے والے، طلبا کو اپنی تحریک میں زبردستی کھینچ رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جو حصہ طلبار اس سیاسی پروپیگنڈے میں لے رہے ہیں، اسے کوئی شخص معمولی اہمیت بھی نہ دے گا۔ جب طلبار اپنے اسکول اور کالج چھوڑ کر کسی مظاہرے میں شریک ہوتے ہیں تو وہ اس علاقہ کے ہنگامہ پسندوں کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں اور پھر انھیں ان بدمعاشوں کی تمام حرکتوں کی ذمہ داری بھی اٹھانی پڑتی ہے اور اکثر پولیس کے ڈنڈوں کے سب سے پہلے شکار وہی ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ انھیں اسکول اور کالج کے حکام کی خفگیاں بھی اٹھانی پڑتی ہیں اور ان کے ہاتھوں سزائیں بھی بھگتنی پڑتی ہیں۔ مزید برآں وہ اپنے سرپرستوں کی نافرمانی کے مرتکب بھی ہوتے ہیں جو ممکن ہے کہ ان کے اخراجات بند کر دیں اور یہ ان کی مزید مشکلات کا باعث ہوتے ہیں نوجوانوں کی ایسی تحریکوں کے بارے میں تو سمجھ سکتا ہوں جن کا مقصد ایسے تعمیری کام کرنا ہوتا ہے جیسے چھٹیوں کے زمانہ میں ان پڑھ کسانوں کو پڑھنا لکھنا سکھانا

اور ان کو صحت و صفائی وغیرہ کی تعلیم دینا۔ لیکن ان کا خود اپنے
والدین اور اساتذہ سے بغاوت کرنا اور بڑے لوگوں کے ساتھ
گلی کوچوں میں پھرنا اور ہنگامہ فساد کرنا بہت افسوسناک منظر
ہوتا ہے۔ کیا میں آپ سے درخواست کر سکتا ہوں کہ آپ سیاسی
کام کرنے والوں کو یہ سمجھا دیں کہ وہ طلبا کو ان کی جائز مصروفیتوں
سے ہٹا کر انھیں اپنے مظاہروں کو اور زیادہ موثر بنانے کے لیے نہ
کھینچیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے وہ اپنے مظاہروں کی
بھی قیمت کم کر رہے ہیں، اس لیے کہ وہ ناسمجھ لڑکوں کی حرکتیں
سمجھی جائیں گی جنھیں خود غرض اور احمق ہنگامہ پسندوں نے
گمراہ کر دیا ہے اور وہ آسانی سے دبائے جا سکتے ہیں۔

"میں اس کا مخالف نہیں ہوں کہ وہ جدید سیاست کی
تعلیم حاصل نہ کریں۔ اگر اساتذہ کسی زیر بحث مسئلے کے متعلق
اخبارات کی رائیں موافق و مخالف دونوں ان کے سامنے
لائیں اور انھیں اپنے نتائج نکالنے کا موقع دیں تو یہ ایک اچھی
بات ہوگی۔ ہم نے یہ طریقہ بہت کامیابی سے چلایا ہے۔ واقعہ
یہ ہے کہ طلبا سے کوئی موضوع چھپانا نہیں چاہیے، جیسا کہ
برٹرینڈ رسل اور دوسرے اس قسم کے خیال کے حامی کہتے ہیں
کہ طلبا کو جنسی معاملات کی تعلیم بھی دینی چاہیے۔ جس چیز کا میں
سخت مخالف ہوں، وہ یہ کہ انہیں ایسے کاموں کے لیے آلۂ کار
بنایا جائے جن سے نہ انھیں فائدہ پہنچتا ہے اور نہ انھیں جو
ان کو استعمال کرتے ہیں۔"

نامہ نگار نے یہ مراسلہ اس اُمید پر لکھا ہے کہ میں طلبا کی جماعت کو ان کے عملی سیاسی کاموں میں حصہ لینے پر متنبہ کروں گا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ان صاحب کو مایوسی ہوگی۔ انھیں معلوم ہوگا کہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں طلبا کو اسکولوں اور کالجوں سے نکلنے میں اور ایسے سیاسی کاموں میں شرکت کی ترغیب دینے میں جن میں جیل جانے کا بھی خطرہ تھا، میرا بہت بڑا حصہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ان کا واضح فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کی سیاسی تحریک میں خاص حصہ لیں۔ وہ دنیا بھر میں ایسا کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں سیاسی بیداری کی بدقسمتی سے بڑی حد تک صرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں محدود رہی ہے، ان کا یہ فرض اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ چین اور مصر میں یہ طلبا ہی تھے جنھوں نے سیاسی تحریک کو کامیاب بنایا۔ ہندوستان میں وہ اس سے کچھ کم نہیں کر سکتے ہیں۔

پرنسپل صاحب جس بات پر زور دے سکتے تھے، وہ یہ کہ طلبا کو عدم تشدد کے اصولوں کا خیال رکھنا چاہیے اور ہنگامہ و فساد کرنے والوں پر انھیں قابو رکھنا چاہیے، بجائے اس کے کہ وہ خود ان کے قابو میں آجائیں۔

('ینگ انڈیا'، ۲۹ مارچ ۱۹۲۸ء)

طلباء کا فرض

مزدوروں کی ہڑتال کافی بُری ہے لیکن طلبا کی ہڑتال اس سے بھی زیادہ بُری ہے، خواہ یہ انصاف کی بنیاد پر کی گئی ہو یا ناانصافی کی بنیاد پر۔ یہ اس وجہ سے اور بھی بُری ہے کہ آخر میں اس کے نتائج بُرے ہوتے ہیں اور دونوں جماعتوں کی جو حیثیتیں ہیں، ان میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔ مزدوروں کے مقابل میں طالب علم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور ان کا ہڑتال کے ذریعہ کوئی خاص فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اور مالکوں کے خلاف تعلیمی اداروں کے افسران کا بھی طلبا کے ساتھ تصادم ہونے میں کوئی فایدہ نہیں ہو سکتا ہے۔ علاوہ اس کے طلبا کو ڈسپلن کا مجسمہ سمجھا جاتا ہے۔ طلبا کی ہڑتال اس لیے بھی بہت دُور رس نتائج پیدا کر سکتی ہے اور صرف غیر معمولی حالات میں درست کہی جا سکتی ہے۔

لیکن اگرچہ اچھے اسکولوں اور کالجوں میں طلبا کی ہڑتالوں کے مواقع بہت کم ہونے چاہئیں، پھر بھی ایسا سمجھنا ناممکن نہیں کہ طلبا ہڑتال نہ کریں گے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی پرنسپل عام رائے کے خلاف کسی ایسے خوشی کے دن کو چھٹی کا دن تسلیم نہ کرے جو والدین اور اسکول یا کالج جانے والے طلباء چاہتے ہوں، تو طلباء اگر اس دن ہڑتال کا اعلان کردیں تو وہ حق بجانب ہوں گے۔ ایسے مواقع ہندوستان میں زیادہ آئیں گے اس لیے کہ طلباء میں ذاتی شعور اور قومی ذمہ داری کا احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ ایک اُستاد اگر وہ کسی شرمناک جرم کا مرتکب پایا گیا ہو تو اس کا ویسا ہی احترام کیا جائے جس کا کہ وہ اپنے معزز پیشہ کی بنا پر مستحق ہے۔

سرکاری کالجوں میں بھی ایسے طلبا کی مخبری کی جاتی ہے اور انھیں سزائیں دی جاتی ہیں، جو ایسے سیاسی خیالات رکھتے ہیں یا ایسے سیاسی جلسوں میں شریک ہوتے ہیں جنھیں گورنمنٹ پسند نہیں کرتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ یہ بے جا مداخلت ختم کر دی جائے۔ ایک ایسے ملک میں جو غیر ملکی حکومت کے نیچے دبا ہوا ہو، جیسے کہ ہندوستان ہے، طلبار کو قومی آزادی کی تحریکوں میں حصہ لینے سے روکنا ناممکن ہے۔ جو کچھ زیادہ سے زیادہ کیا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ ان کے جوش کو قابو میں رکھا جائے تا کہ ان کی تعلیم کا نقصان نہ ہو۔ انھیں آپس کی مخالف جماعتوں کا طرفدار نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن انھیں اس کا حق ہونا چاہیے کہ وہ جو سیاسی رائے مناسب سمجھیں اختیار کریں اور اس کی عملاً حمایت کریں۔ تعلیمی اداروں کا کام یہ ہے کہ وہ لڑکے اور لڑکیوں کو تعلیم دیں جو ان کے ہاں آتے ہیں اور اس طرح ان کی سیرت کی تشکیل میں مدد دیں اور اسکول کے کمرے کے باہر ان کی کسی سیاسی یا دوسرے کاموں میں مداخلت نہ کریں جو اخلاق کے منافی نہ ہوں۔

('ینگ انڈیا' ۲۴ جنوری ۱۹۲۹ء)

ہندوستان کے نوجوانوں پر

ایک کالج کے طالب علم لکھتے ہیں:

" کانگریس کی قرارداد کے بموجب ہم اس سال کے آخر تک درجہ نوآبادیات (ڈومینین اسٹیٹس) حاصل کرلیں گے۔ لیکن اس وقت ملک میں جو حالات پیدا ہوگئے ہیں، ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حکومت ہمارا مطالبہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے اور یہ یقینی ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گی۔

" اس صورت میں کانگریس کی قرارداد کے مطابق ہم اگلے سال سے مکمل عدم تعاون کی تحریک شروع کردینگے، اور ہم نوجوانوں کو اس میں سب سے پہلے حصہ لینا ہوگا۔ کیا اس وقت ہمیں اپنے اسکول اور کالج چھوڑنے ہوں گے؟ اگر ایسا ہے تو آپ ہم سے اس وقت کیوں کہتے ہیں؟ اسکول کا چھوڑنا کوئی بڑا دشوار کام نہ ہوگا لیکن کالج کا چھوڑنا البتہ قابل غور ہے۔ کیا طلبا کو جب وہ کالج چھوڑ دیں گے تو اگر کل نہیں تو اس بڑی رقم کا ایک حصہ واپس مل جائے گا جو وہ پوری ٹرم کی فیس کے طور پر ادا کرچکے ہیں۔ اگر نہیں تو انھیں بہت بڑا مالی نقصان اٹھانا ہوگا جو ہم میں سے اکثر برداشت نہیں کرسکتے ہیں۔ یہ دولتمند طبقہ کے لیے ممکن ہے کہ پریشانی کا باعث نہ ہو لیکن ہم میں جو غریب ہیں، انھیں بہت دشواری ہوگی۔

"اس لیے اگر کالجوں کا بائیکاٹ ممکن یا یقینی ہو تو طلبا کو بتا دیا جانا چاہیے تاکہ ان کی محنت اور روپیہ ضائع نہ ہو۔

"امید ہے کہ آپ ان سوالات کا جواب عنایت فرمائیں گے۔"

میں اس خط میں نہ نوجوانی کا اُبلتا ہوا حوصلہ دیکھتا ہوں اور نہ وہ ہمت ہی پاتا ہوں۔ بلکہ اس سے ایک بنیئے کی کنجوسی اور مجھ جیسے شخص کی جو مرنے کے قریب ہے، مایوسی نظر آتی ہے۔ یہ نوجوان یہ کیسے سمجھتا ہے کہ حکومت ہمیں درجہ نوآبادیات دے گی؟ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ حکومت ہمیں کچھ دینے کی نہیں۔ ہم جو چاہتے ہیں، وہ اپنی قربانی اور اتحاد کی وجہ سے لیں گے۔ جو چیز ایک کمزور دل اور لیت و لعل کرنے والے ذہن کو ناممکن نظر آتی ہے، وہ ایک بہادر اور ہمت رکھنے والے نوجوان کو ممکن دکھائی دیتی ہے۔ ناممکن کو ممکن کر دکھانے ہی میں نوجوانی کی بہادری اور شان ہے۔

لیکن مجھے اس سے اتفاق ہے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوان اور دوسرے طبقے کے لوگ اسی طرح چیزوں کو آسان سمجھتے رہیں گے تو ہم اس سال کے ختم تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ بہرحال اگر ایسا بھی ہوا تو ایک بہادر شخص اسے بھی خوش آمدید کہے گا، اس لیے کہ اس سے لڑنے کا ایک موقع ملا۔ کیا ایک سپاہی اپنا ملک ہاتھ سے اس لیے جانے دے گا کہ آئندہ اسے لڑنا پڑے گا اور اندیشہ ہے کہ آگے چل کر اسے کہیں پیچھے نہ ہٹنا پڑے۔

بہرحال مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ طلبا اس درجہ خوفزدہ ہوں۔ اگر جنگ ہوئی بھی تو انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ جس کالج کو انھوں نے اس وقت چھوڑا ہے، وہ ان کا ہے اور جلد یا بدیر وہ عملاً بھی ان کا رہے گا۔ فیس کے نقصان کا خیال اس شخص کے لیے چنداں قابل لحاظ نہیں جو سوراج

کا خیال سامنے رکھنا ہے۔ ہم ایک فیس کے نقصان کی کیا اہمیت دے سکتے ہیں جبکہ بہت سے لوگ اپنا سب کچھ کھو دیں گے۔

ان خیالات کے بعد اب میں ان مخصوص سوالات کی طرف آتا ہوں جو اس طالب علم نے پیش کئے ہیں۔ آیا سرکاری مدارس اور کالجوں کو چھوڑنا چاہیئے یا نہیں، اس بات کا آخری طور پر فیصلہ کانگریس کرے گی۔ اگر میرا اختیار چلے تو میں یقیناً ان کے چھوڑنے پر زور دوں گا۔ یہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ سرکار اس ملک میں اسکولوں اور کالجوں کے ذریعہ حکومت کرتی ہے۔ آچاریہ رام دیو نے گجرات ودیاپیٹھ میں اپنے لکچروں میں یہ بات خود انگریز مصنفین کے بیانات سے ثابت کردی ہے کہ حکومت کا موجودہ نظام تعلیم کے بنانے سے ایسے نوکر پیدا کرنا تھا جو اپنے انگریز آقاؤں کے احکامات کی تعمیل کرسکیں۔ ہزارہا نوجوان جو سرکاری ڈگریاں حاصل کرنے کے لیے کالجوں میں پڑے ہوئے ہیں، ان کی غرض سوائے ملازمتوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ ڈگریوں سے علم حاصل نہیں ہوتا ہے جو صرف مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے۔ ڈگریاں حاصل کرنے کی تہ میں سرکاری ملازمتوں کا چسکا ہے۔ سوراج حاصل کرنے کی راہ میں یہ چسکا ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ میں اپنے نوجوانوں میں ایک نئی روح دیکھ رہا ہوں۔ اس سے لوگوں کو خوشی ہوتی ہے لیکن میں اس سے دھوکے میں نہیں ہوں۔ یہ روح ابھی ایک عارضی جذبہ سے زیادہ نہیں اور بڑی حد تک مصنوعی اور عارضی ہے۔ جب اصل روح پیدا ہوگی تو وہ دنیا کی آنکھوں کو اپنی روشنی سے اس طرح چکا چوند کردے گی جیسے سورج اپنی تمازت سے۔ اور وہ روشنی جب لوگوں میں پیدا ہوجائیگی تو پھر کسی طالب علم کو نہ اسکول کی ضرورت ہوگی، نہ کالج کی۔

لیکن اس وقت جس طرح سرکار کے کاغذی نوٹ چلتے ہیں، اس کے اسکولوں اور کالجوں کی بھی بازار میں وہی قیمت ہے اور ان کے جادو سے کون خالی ہے؟

('نوجیون' ۱۴/اپریل ۱۹۲۹ء)

طلباء اور تعطیلات

جہاں تک طلباء کی تعطیلات کے استعمال کا سوال ہے، اگر وہ شوق سے کام کرنے پر آمادہ ہوں تو وہ بہت سے کام کر سکتے ہیں۔ میں ان میں سے چند کے نام پیش کرتا ہوں:۔

۱۔ رات میں یا دن میں مدرسے چلائیں جن میں ایک نہایت سوچا سمجھا مختصر سا نصاب ہو جو صرف تعطیلات میں پورا ہو جائے۔

۲۔ ہریجنوں کی بستیوں میں جائیں اور ان میں صفائی کا کام کریں اور اگر ہریجن لوگ آمادہ ہوں تو ان کی مدد بھی لے سکتے ہیں۔

۳۔ ہریجن بچوں کو سیر کے لیے لے جائیں اور گاؤں سے قریب انھیں ایسی چیزیں دکھائیں جن سے فطرت کا مطالعہ ہو سکتا ہے اور انھیں ان کے ماحول سے دلچسپی پیدا کرائیں اور اس طرح انھیں جغرافیہ اور تاریخ کی معمولی باتیں سکھائیں۔

۴۔ انھیں رامائن اور مہابھارت سے آسان کہانیاں پڑھ کر سنائیں۔

۵۔ سیدھے سادے بھجن یاد کرائیں۔

۶۔ ہریجن لڑکوں کے جسم پر جو میل کچیل دیکھیں، وہ دور کریں اور ان کو اور ان کے بڑوں کو حفظان صحت پر سیدھے سادے سبق دیں۔

۷۔ ہریجنوں کے حالات کا خاص خاص علاقوں میں تفصیلی جائزہ لیں۔

۸۔ جو ہریجن بیمار ہوں، ان کی دوا علاج کا انتظام کریں۔

یہ ہیں چند کام بہ طور نمونہ جو ہریجنوں میں کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک فہرست ہے جو سرسری طور پر تیار کی گئی ہے لیکن مجھے شبہ نہیں کہ ایک سمجھدار طالب علم بہت سے اور کاموں کا اضافہ کر سکتا ہے۔

اس وقت تک میں نے اپنی توجہ صرف ہریجنوں کے کاموں تک محدود رکھی ہے۔ لیکن ذات والے ہندوؤں میں بھی بہت سے ضروری کام ہیں جو کئے جا سکتے ہیں۔ طلبا چھوت چھات کے پیغام کو ان تک بھی نہایت نرم انداز میں پہنچا سکتے ہیں۔ ان میں اس قدر جہالت پھیلی ہوئی ہے جو نہایت آسانی سے صاف اور مستند لٹریچر کے ذریعہ دور کی جا سکتی ہے۔ طلبا ان لوگوں کا ایک جائزہ تیار کر سکتے ہیں جو چھوت چھات دور کرنے کے حق میں ہیں اور وہ جو اس کے مخالف ہیں اور جس وقت وہ یہ سروے کر رہے ہوں، تو ان کے کنوؤں، اسکولوں، تالابوں اور مندروں کی بھی فہرست تیار کر سکتے ہیں جو ہریجنوں کے لیے کھول دیئے گئے ہیں، اور وہ جو ابھی بند ہیں۔

اگر یہ سب باتیں ایک باقاعدہ طریقہ پر مسلسل کی جائیں تو انھیں اس کے حیرت انگیز نتائج نظر آئیں گے۔ ہر طالب علم کے پاس ایک

"لاگ بک" ہونی چاہیئے۔ جس میں وہ اپنے کام کی تفصیلات درج کرتا رہے اور تعطیلات کے ختم پر ایک جامع لیکن مختصر رپورٹ ان کاموں کی تیار کی جا سکتی ہے اور اپنے صوبہ کی اچھوت ادھار کی انجمن کے پاس بھیجی جا سکتی ہے۔ دوسرے طلبا خواہ ان میں سے کل یا کوئی ایک بات بھی اختیار کریں جو اوپر تجویز کی گئی ہیں، لیکن جو صاحب مجھے خط لکھیں۔ وہ مجھے ایک رپورٹ ضرور بھیجیں کہ انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اب تک کیا کام کئے ہیں۔

("ہریجن" یکم اپریل ۱۹۳۴ء)

تعطیلات کا استعمال

سوال:- طلبا تعطیلات کے زمانہ میں کیا کر سکتے ہیں؟ وہ پڑھنا چاہتے نہیں اور مسلسل کتائی کرتے کرتے تھک جائیں گے۔

جواب:- اگر وہ کتائی سے تھک جاتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ انہوں نے اس کی زندگی بخش خاصیت اور اس کی اندرونی جاذبیت کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ اس کے سمجھنے میں کیا دشواری ہے کہ ہر ایک گز سوت جو کاتا جاتا ہے، وہ قومی دولت میں اضافہ کرتا ہے۔ ایک گز سوت بہت نہیں ہوتا لیکن چونکہ کام کی سب سے آسان شکل ہے، اس لیے یہ آسانی

سے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے کتائی کی اصل قیمت بہت زیادہ ہے۔ طلبا سے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ چرخے کی ساخت اور بناوٹ کو سمجھتے ہونگے اور اسے اچھی حالت میں رکھیں گے۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ کتائی میں ایک خاص جاذبیت محسوس کریں گے۔ اس لیے میں کسی اور پیشہ کو تجویز نہیں کر سکتا۔ لیکن کتائی سے اور بہت سے بڑے بڑے کام ہو سکتے ہیں۔ بڑے بڑے سے میری مراد وقت کے لحاظ سے ہے۔ ان کی مدد سے آس پاس کے گاؤں زیادہ صاف اور اچھی حالت میں رکھے جا سکتے ہیں اور وہ بیماروں کی تیمار داری کر سکتے ہیں یا ہریجن بچوں کو تعلیم دے سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

(ہریجن، یکم جون ۱۹۴۰ء)

طلبا اور ستیاگرہ

سوال:۔ آپ طلبار کے ستیاگرہ تحریک میں حصہ لینے پر، اگر وہ شروع ہو تو کیوں اعتراض کرتے ہیں؟ اور اگر انھیں اس کی اجازت کبھی دی جائے تو وہ اسکول یا کالج ہمیشہ کے لیے کیوں چھوڑ دیں؟ یقیناً انگلستان کے طلبار، اگر ان کا ملک جنگ میں شریک ہو جائے تو خاموشی سے دیکھتے نہیں رہیں گے۔

جواب:۔ طلبار کو اسکول اور کالجوں سے نکالنے کا مقصد انھیں عدم

تعاون کے پروگرام میں شریک کرنا ہے۔ یہ آج ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہے۔ اگر میں ستیاگرہ کی تحریک کا ذمہ دار ہوں تو میں طلبا کو اپنے اسکول اور کالج چھوڑنے کی ہرگز نہ دعوت دوں اور نہ انھیں اس کے لیے آمادہ کروں۔ ہم نے تجربے سے یہ دیکھ لیا ہے کہ طلبا کے اندر سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی محبت کم نہیں ہوئی ہے۔ ان اداروں کی وہ رونق اب ختم ہو چکی ہے، اس سے تو ایک فایدہ ہی ہوا لیکن میں اس کی کچھ بہت اہمیت نہیں دیتا۔ اور اگر یہ ادارے قائم رہتے ہیں تو ستیاگرہ کے لیے طلبا کو نکالنے سے کوئی فایدہ نہ ہوگا اور نہ اس سے اس کام کو فایدہ پہنچے گا۔ اس طرح طلبا کو کھینچنے سے عدم تشدد باقی نہیں رہے گا۔ میں نے کہا ہے کہ جو لوگ تحریک میں شریک ہونا چاہتے ہیں، انھیں اپنے اسکول اور کالج بالکل چھوڑ دینے چاہییں اور خود کو قومی خدمت کے لیے لگا دینا چاہیے خواہ تحریک ختم بھی ہو گئی ہو۔ یہاں کے طلبا اور انگلستان کے طلبا کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ وہاں پوری قوم جنگ میں لگ جاتی ہے۔ اداروں کو ان کے منیجروں نے بند کر دیا ہے۔ یہاں برعکس اس کے اگر طلبا اپنے اسکول اور کالج چھوڑیں گے تو ان اداروں کے افسران کے باوجود چھوڑیں گے۔

(ہریجن، ۱۵ ستمبر ۱۹۴۰ء)

ایک عیسائی طالب علم کی شکایت

ایک ہندوستانی عیسائی طالب علم نے بنگال کے کسی مشنری کالج سے لکھا ہے:

"مشنری کالجوں کا منشا عیسائیت کی اشاعت اور لوگوں کو عیسائی بنانا ہوتا ہے۔ مشنری، انجیل، حضرت عیسیٰ اور عیسائیت کا ذکر کرتے ہیں لیکن جب کوئی ہندوستان میں قومی اہمیت کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو وہ حد درجہ رجعت پسند ہو جاتے ہیں۔ ہمارے کالج میں سالانہ تقریبیں ہوتی ہیں۔ ۷ ستمبر کی شام کو ایک ایسی ہی تقریب منعقد ہوئی اور ہمارے پروگرام کی سب سے پہلی چیز دارالاقامہ کے طلبا کی ایک جماعت کی طرف سے 'بندے ماترم' کا گانا تھا۔ پرنسپل نے اعتراض کیا کہ یورپین لوگوں کے لیے ہندوستانی قومی گانے کے احترام میں استادہ کھڑے رہنا بہت مشکل ہے، اور اگر بندے ماترم کے گانے کی رسم کی اجازت دی گئی تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم نے اسے ایک قومی گانے کی حیثیت سے سرکاری طور پر تسلیم کر لیا جو ہم بالکل نہیں چاہتے ہیں باوجود اس کے کہ طلبا نے ہر قسم کی دلیلیں دیں، کوئی معاملہ طے نہ ہو سکا۔ طلباء نے ہڑتال کر دی ہے۔ اس طریقہ سے کانگریس

کو بھی ستیاگرہ اور عدم تعاون کرنا چاہیے' اس لیے کہ یہ سامراجی برطانوی لوگ ہمارے نقطۂ نظر کو کبھی نہیں سمجھیں گے۔"

ابھی حال تک میں طلبا کی ہڑتال کے خلاف بہت کچھ لکھتا رہا ہوں میں اس کالج کا نام نہیں جانتا۔ اگر میں جانتا ہوتا تو میں منتظمین سے اس بات کی تصدیق کر لیتا۔ اس لیے میں اپنی رائے اس بنیاد پر ظاہر کر رہا ہوں کہ اس مراسلہ نگار نے جو واقعات لکھے ہیں' وہ صحیح ہیں۔ اگر یہ صحیح ہیں تو میں نہایت خوشی سے یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ یہ ہڑتال بالکل حق بجانب ہے۔ اور مجھے اُمید ہے کہ بہت اچھی اور کامیاب ہوئی ہوگی۔ یہ ترانہ واقعتاً خواہ قومی تھا یا نہ تھا' یہ ان مشنریوں کے طے کرنے کی بات نہیں ہے۔ ان کے لیے تو یقیناً یہ جاننا کافی ہوگا کہ ان کے طلباء اسے قومی سمجھتے ہیں۔ پروفیسر اور استاد صاحبان اگر خود کو اپنے طلبا میں ہر دلعزیز بنانا چاہتے ہیں' تو انھیں اپنے طلبا کے مشغلوں اور خواہشوں کا ساتھ دینا چاہیے بشرطیکہ وہ صحت مندی اور اخلاق سے گری ہوئی نہ ہوں۔

شملہ۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۶ء

ہریجن۔ ۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء

جھنڈے اور اسکول

اسکولوں اور کالجوں میں جھنڈوں سے متعلق مجھے دو خط ملے ہیں۔ بعض طلبا کانگریس کے جھنڈے لہراتے ہیں' اس لیے دوسرے طلبا لیگ

کے جھنڈے لہراتے ہیں۔ دونوں غلطی پر ہیں۔ میرے مراسلہ نگار لکھتے ہیں کہ شرارت کانگریس کا جھنڈا لہرانے سے شروع ہوئی۔ اگر دونوں جھنڈے لہرائے گئے ہوتے تو اس وقت تک کچھ نہ ہوا ہوتا۔ سب سے صحیح بات تو یہ تھی اور ہے کہ ایسے معاملات میں طلبا کو پہل نہ کرنی چاہیئے۔ عمارتیں منتظمین کی ہیں اور یہ انھیں طے کرنا ہے کہ ان کی عمارتوں پر اگر جھنڈے لہرائے جاتے ہیں تو لہرائے جائیں یا نہ لہرائے جائیں۔ اگر طلبا قانون کی خلاف ورزی کرنے لگیں گے تو نتیجہ بدنظمی اور ابتری ہوگا۔ اور سر کھٹول اس کے اوپر۔ یہ سخت جہالت کی بات ہوگی اور اس سے کسی کو فایدہ نہ ہوگا۔ اسکول اور کالج تو ایسے ادارے ہونے چاہیئں جہاں فرقہ وارانہ اختلاف کا شلاح ہو سکے، نہ کہ ان سے یہ اختلافات اور بڑھیں۔ اگر لڑکے اور لڑکیاں اپنے اسکول کے زمانہ میں ضبط و نظم سے رہنا نہ سیکھیں گی، تو ان کی تعلیم پر جو روپیہ اور وقت خرچ ہو رہا ہے، وہ ایک طرح کا قومی نقصان ہوگا۔ ایک سب سے خوش کن بات جو لاہور کے اس واقعہ میں ہوئی، وہ یہ کہ مولانا ابوالکلام آزاد فوراً موقع پر پہنچ گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ جن لڑکوں نے کانگریس کا جھنڈا لہرایا تھا، یہ ان کی غلطی تھی۔

سیواگرام۔ ۱۱ فروری ۱۹۴۶ء
ہریجن۔ ۱۷ فروری ۱۹۴۶ء

تعلیم کے بعد کیا کریں؟

سوال:- ایک طالب علم نے نہایت سنجیدگی سے یہ سوال کیا ہے کہ "تعلیم ختم کرنے کے بعد مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

جواب:- ہم آج ایک غلام قوم ہیں اور ہمارا تعلیمی نظام اپنے آقاؤں کے مفاد کے پیش نظر بنایا گیا ہے۔ لیکن یہ ہوتے ہوئے بھی خود غرض سے خود غرض آدمی ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے مجبور ہوتا ہے جن سے وہ فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس لحاظ سے اپنی تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے کے لیے ہمارے آقاؤں نے کچھ فوائد ہمارے لیے رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ حکومت کے تمام ارکان ایک سے نہیں ہوتے۔ ان میں بعض روشن خیال بھی ہوتے ہیں جو تمام مسئلوں کو انسانی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے موجودہ نظام میں بلا شبہ کچھ اچھائی بھی ہے۔ لیکن موجودہ تعلیم کا بہر صورت غلط ہی استعمال ہوتا ہے یعنی یہ کہ یہ روپیہ اور عہدہ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔

قدیم مقولے کے مطابق تعلیم وہ ہے جو آزاد کرتی ہے، آج بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا پہلے تھا۔ تعلیم سے یہاں مراد صرف روحانی علم نہیں ہے اور نہ آزادی کا مطلب موت کے بعد روحانی آزادی سے ہے۔ علم سے مراد وہ سب تربیت ہے جو انسان کی خدمت کے لیے مفید ہو اور آزادی سے مطلب ہر قسم کی غلامی سے آزادی یعنی اس زندگی کی غلامی سے بھی ہے۔ غلامی دو طرح کی ہوتی ہے: ایک باہر کے تسلط کی غلامی اور دوسری اپنی مصنوعی ضرورتوں کی

کی غلامی۔ جو علم اس مقصد کی غرض سے حاصل کیا جائے، وہی صحیح مطالعہ کے قابل ہے۔

یہ دیکھ کر کہ جو نظام تعلیم بدیسی حکمرانوں نے ہمارے لیے وضع کیا ہے وہ اپنے ہی مفاد کی غرض سے ہے، کانگریس نے ۱۹۲۰ء میں منجملہ اور باتوں کے سرکاری تعلیم گاہوں کے مقاطعہ کا اصول بھی پیش کیا تھا۔ لیکن وہ دور اب ختم ہو گیا ہے۔ سرکاری اداروں میں اور اُن اداروں میں جو اس نظام پر چل رہے ہیں، داخلوں کی مانگ اس سے زیادہ ہوتی جا رہی ہے جتنے اسکول اور کالج ہیں۔ امتحان دینے والوں کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کشاکش اور دیوانگی کے باوجود میرا خیال ہے کہ صحیح تعلیم وہ ہے جس کی میں نے اوپر تعریف کی ہے۔

ایک طالب علم جو میرے بتائے ہوئے تعلیمی نصب العین سے بظاہر مائل ہوتا ہے اور اپنی تعلیم چھوڑ دیتا ہے، وہ بہت ممکن ہے کہ بعد میں پچھتائے۔ اس لیے میں نے ایک اس سے بہتر راستہ اختیار کیا ہے۔ جس ادارے میں وہ داخل ہوا ہے، اس میں اپنی تعلیم جاری رکھتے ہوئے اُسے ہمیشہ خدمت کا وہ نصب العین اپنے سامنے رکھنا چاہیے جو میں نے پیش کیا ہے اور اپنی تعلیم کو اس مقصد کی غرض سے حاصل کرنا چاہیے نہ کہ روپیہ کمانے کی نیت سے۔ علاوہ اس کے موجودہ تعلیم کی کمی کو پورا کرنے کے لیے اسے اپنے فرصت کے اوقات کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ اس طرح اسے تعمیری پروگرام میں حصہ لینے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے گا۔

("ہریجن" ۱۰ مارچ ۱۹۴۷ء)

طلباء اور اسٹرائیک

بنگلور کے ایک کالج کے طالب علم نے لکھا ہے کہ
"میں نے آپ کا مضمون 'ہریجن' اخبار میں پڑھا۔ مہربانی
فرما کر آپ اپنی رائے سے مطلع کیجیے کہ آیا طلباء کو ایسی اسٹرائیکوں
میں حصہ لینا چاہیے جیسی 'اینڈمان ڈے'، 'ابے ٹرایر ڈے'،
وغیرہ پر ہوتی ہیں۔"

اگرچہ میں نے اس بات کی حمایت کی ہے کہ طلبا کی تحریکوں اور ان کی
تقریروں پر سے پابندیاں اٹھا دینی چاہئیں، لیکن میں سیاسی اسٹرائیک
اور مظاہروں کی تائید نہیں کر سکتا ہوں۔ طلباء کو اظہار رائے اور خیال کی زیادہ
سے زیادہ آزادی ہونی چاہیے۔ وہ جس سیاسی جماعت کے ساتھ چاہیں کھلے
بند اظہار ہمدردی کر سکتے ہیں۔ لیکن میری رائے میں جب تک وہ تعلیم حاصل
کر رہے ہیں، انھیں آزادیِ عمل نہ ہونی چاہیے۔ ایک طالب علم سیاسی
کارکن بھی ہو اور ساتھ ہی اس کے تعلیم بھی حاصل کرے، ایسا ممکن نہیں ہے۔
بڑے بڑے قومی ہنگاموں کے وقت ان دونوں باتوں کے درمیان فرق
کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اس وقت وہ اسٹرائیک نہیں کرتے ہیں یا اگر
ایسے حالات میں اسٹرائیک کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے، تو یہ کلی
اسٹرائیک ہے، یہ تعلیم کا بند کر دینا ہے۔ اس طرح جو چیز ایک استثنا کی
حیثیت رکھتی ہو، وہ حقیقت نہیں بن سکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مراسلہ نگار نے جو سوال اٹھایا ہے، وہ کانگریسی صوبوں میں نہیں اُٹھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ جو باتیں طلبا کے بہترین دماغ بہ خوشی قبول نہ کریں گے، وہ ان پر بہ جبر نہیں تھوپی جا سکتی ہے۔ ان کی اکثریت کانگریسی ذہن رکھتی ہے یا اسے رکھنا چاہیئے۔ انھیں ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیئے۔ جو وہاں کی وزارتوں کو ناگوار ہو۔ اگر وہ اسٹرائیک کرتے ہیں تو اس خیال سے کہ وزرا چاہتے ہیں کہ وہ اسٹرائیک کریں۔ لیکن میں ایسا تصور نہیں کر سکتا کہ کانگریسی وزرا ایسا چاہیں گے سوائے اس کے کہ کانگریس برسر اقتدار نہ ہو اور وہ حکومت وقت کے خلاف عدم تشدد جنگ کا اعلان نہ کردے۔ اور اس وقت بھی میں، یہ سمجھوں گا کہ طلبا کو اسٹرائیک کے لیے اپنی تعلیم چھوڑ دینے کی دعوت دینا دیوالیہ ہونے کے اعلان کے برابر ہوگا۔ اگر لوگ عام طور پر اسٹرائیکوں کی قسم کے مظاہرے کرنے کے لیے کانگریس کے ساتھ ہوں، پھر بھی طلبا کو بہ درجہ مجبوری چھوڑ دیا جائے گا گزشتہ جنگ میں طلبا کو سب سے پہلے نہیں بلکہ جہاں تک مجھے خیال آتا ہے، سب سے آخر میں دعوت دی گئی تھی اور اس وقت بھی صرف کالج کے طلباء کو۔

میں مراسلہ نگار سے یہ چاہوں گا کہ وہ 'ہریجن' میں ۱۸ ستمبر کے نوٹ کو جو میں نے ایک اسکول کے اُستاد کے خط پر لکھا ہے، پڑھ لیں یا دوبارہ پڑھ لیں۔ اس خط سے انہیں میری پوزیشن طلبا اور اُستادوں کی سیاسی آزادی کے متعلق واضح ہو جائے گی۔

لیکن اس سلسلہ میں ایک اور مراسلہ نگار لکھتے ہیں:

" اگر ہم تنخواہ یاب سرکاری ملازمین، استادوں اور دوسرے لوگوں کو سیاست میں شریک ہونے کی اجازت دیں، تو ایک

مصیبت آجائے گی۔ کوئی حکومت نہیں چل سکتی ہے، اگر اس کی پالیسی پر حکومت یا دوسری ریاستوں کے عمال نکتہ چینی کرنے لگیں، بجائے اس کے کہ اس پر عمل کریں۔ آپ کی یہ خواہش کہ قومی امیدوں، خواہشوں اور حب وطن کے جذبات کے اظہار کا پورا موقع ملنا چاہئے، بالکل مناسب ہے۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ آپ کے مضمون سے غلط فہمی پیدا ہوگی جب تک کہ آپ اپنی پوزیشن اچھی طرح واضح نہ کردیں۔

میں سمجھتا تھا کہ میری پوزیشن بالکل واضح ہے ——— جہاں قومی حکومت ہوتی ہے، وہاں حکومت اور اس کے عمال یا طلباء کے درمیان بمشکل کوئی اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ میرے نوٹ میں تمام بے ضابطگیوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ اسکول کے استاد کو جس بات سے سب سے زیادہ چڑ ہے اور وہ درست بھی ہے، وہ خفیہ پولیس اور آزادیٔ رائے کو دبانے سے ہے جو اب تک عام طور پر ہو رہا ہے۔ کانگریسی وزراء عوام کے ہیں، اور عوام ہی میں سے ہیں۔ ان کے پاس کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہوتی ہے۔ ان سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ لوگوں کی ہر بات سے جس میں طلباء کے ذہن بھی شامل ہیں، واقف ہوں گے۔ ان کے ہاتھ میں تمام کانگریس کی مشینری ہے جو رائے عامہ کی ترجمان ہونے کی بنا پر قانون، پولیس اور فوج سے بھی زیادہ حیثیت رکھتی ہے۔ جن کی پشت پر یہ مشینری نہیں ہے، وہ ان کارتوسوں کی مانند ہیں جو چھوٹ چکے ہیں جن وزراء کے پیچھے کانگریس ہے، ان کے لیے قانون، پولیس اور فوج سب بے کار ہیں۔ اور کانگریس میں بھی اگر ضبط نہ ہو تو وہ بیکار ہے۔ اس لیے اگر کانگریس برسر اقتدار ہے تو ہر جگہ جبر نہیں بلکہ رضاکارانہ ضبط ہوگا۔ (ہریجن، ۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء)

کیا اسی کا نام عدم تشدد ہے؟

نیچے ایک اُستاد کے خط کا خلاصہ دیا جاتا ہے جو اناطلی یونیورسٹی سے آیا ہے!

" گزشتہ نومبر کی کسی تاریخ میں پانچ یا چھ طلبا کی ایک جماعت نے یونیورسٹی یونین کے سکریٹری پر جو خود بھی ایک طالب علم تھا، منظم حملہ کر دیا۔ وائس چانسلر شری نواس شاستری نے طلبا کی اس حرکت پر ایک سخت قدم اٹھایا اور اس جماعت کے لیڈر کو یونیورسٹی سے خارج کر دیا اور باقی کو اس تعلیمی سال کے ختم تک معطل کر دیا۔

ان سزا یافتہ طلبا کے بعض دوستوں اور ہمدردوں نے جماعتوں سے غیر حاضر ہونا اور کام چھوڑ دینا چاہا۔ دوسرے دن ان سزا یافتہ لڑکوں نے طلبا کا ایک جلسہ کیا اور بطور احتجاج انھیں بھی اسٹرائک کرنے کی ترغیب دینے لگے۔ لیکن اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی، اس لیے کہ طلبا کی اکثریت نے یہ محسوس کیا کہ ان چھ طلبا کو جو سزا دی گئی ہے، وہ اس کے مستحق تھے۔ اس لیے انھوں نے ان کے ساتھ شریک ہونے یا ان کے لیے کسی قسم کی ہمدردی ظاہر کرنے سے انکار کر دیا۔

دوسرے دن تقریباً ۲۰ فیصدی طلبا اپنی جماعتوں میں نہیں

گئے اور باقی ۸۰ فیصدی حسبِ معمول شریک ہوئے۔ میں یہ بھی عرض کردوں کہ اس یونیورسٹی میں کل تعداد طلبا کی ۸۰۰ کے قریب ہے۔

جس طالب علم کو خارج کیا گیا تھا، وہ اس کے بعد اسٹرائیک کی رہنمائی کے لیے دارالاقامہ کے اندر آیا۔ یہ دیکھ کر کہ اسٹرائیک ناکام رہی، وہ شام کو اور طریقے استعمال کرنے لگا، مثال کے طور پر دارالاقامہ سے نکلنے کے جو راستے تھے، ان پر لیٹ جانا، دارالاقامہ کے بعض پھاٹکوں میں تالے ڈال دینا، بعض چھوٹے لڑکوں کو ان کے کمروں میں بند کر دینا، خاص طور سے جن لڑکوں کو جن پر ان کا زور آسانی سے چل سکتا تھا۔ اس طرح سے سہ پہر میں دارالاقامہ کے پھاٹکوں پر پچاس یا ساٹھ کے قریب آ کر رک گئے۔

منتظمین نے یہ دیکھ کر کہ پھاٹک سب بند ہیں، تاروں میں سے راستہ بنانا چاہا، لیکن جب وہ یونیورسٹی کے ملازمین کی مدد سے تار ہٹانے لگے، تو اسٹرائیک کرنے والوں نے ان راستوں سے طلبا کو کالج کے اندر جانے سے روک دیا۔ انھوں نے ان روکنے والوں کو ہٹانا چاہا لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے۔ منتظمین نے یہ دیکھ کر کہ صورتِ حال قابو سے باہر ہو گئی ہے، پولیس سے درخواست کی کہ وہ اس خارج شدہ لڑکے کو دارالاقامہ کے حدود سے باہر نکال دے اس لیے کہ یہی تمام فتنہ کی جڑ تھا، اور پولیس نے اسے نکال باہر کر دیا۔ اس سے قدرتاً بعض اور طلبا جو ناراض ہو گئے جنھوں نے اسٹرائیک والوں کے ساتھ ہمدردی

ظاہر کرنی شروع کردی۔ دوسرے دن اسٹرائیک کرنے والوں نے یہ دیکھا کہ تمام تار دارالاقامہ سے ہٹا دیئے گئے ہیں، وہ کالج کے حاطہ میں بے روک ٹوک داخل ہوگئے اور دوسرے طالب علموں کو جماعتوں میں جانے سے روکنے لگے۔ اس طرح کہ وہ سیڑھیوں اور جماعتوں کے دروازوں پر لیٹ گئے۔ شری نواس شاستری نے اس پر یونیورسٹی میں ڈیڑھ مہینے کی یعنی ۲۹ نومبر سے ۱۶ جنوری تک لمبی چھٹی کردی۔ انھوں نے اخبارات میں ایک بیان شایع کیا ہے، جس میں طلبا سے یہ درخواست کی ہے کہ اب وہ اپنے گھروں سے تعلیم کے لیے زیادہ سچے دل اور خوشی کے ساتھ واپس آئیں۔

لیکن جب کالج کھلا تو اسٹرائیک کرنے والے اور زور و شور کے ساتھ واپس آئے جنھیں تعطیلات کے زمانہ میں . . . . . سے مزید مشورے ملے تھے۔ وہ غالباً راجا جی کے پاس گئے لیکن انھوں نے انھیں وائس چانسلر کے احکامات کی تعمیل کرنے کی ہدایات کی اور اس میں مداخلت کرنے سے انکار کردیا۔ انھوں نے اسٹرائیک کرنے والوں کے پاس وائس چانسلر کی معرفت دو تار بھی بھیجے اور ان سے درخواست کی کہ وہ اسٹرائیک بند کردیں، کالج کی کلاسوں میں شریک ہوں اور خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگ جائیں۔ اگرچہ اچھے طلبا کی اکثریت پر ان تاروں کا بہت اثر ہوا، لیکن اسٹرائیک کرنے والے اپنی ضد پر قائم رہے۔ دھرنا اب تک جاری ہے۔ اور یہ تقریباً مستقل سا ہوگیا

ہے۔ اسٹرائیک کرنے والوں کی تعداد تقریباً ۳۵ سے ۴۵ تک ہوگی ان کے کوئی ۵۰ کے قریب ہمدرد ہوں گے جو باہر آنا اور اسٹرائیک والوں کے ساتھ شریک ہونا نہیں چاہتے۔ لیکن اندر ہی اندر رہ کر وہ دشواریاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہر روز ساتھ مل کر آتے ہیں اور جماعتوں کے دروازوں کے سامنے اور پہلی منزل پر جانے کے لیے زینوں کے آگے لیٹ جاتے ہیں تاکہ طلباء جماعتوں میں نہ جا سکیں۔ لیکن اساتذہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں اور کلاسیں لیتے جاتے ہیں قبل اس کے کہ دھرنا دینے والے اس جگہ پہنچیں۔ سو ہر گھنٹے کلاسوں کی جگہیں بدلتی رہتی ہیں بعض وقت جماعتیں کھلے میدان میں ہوتی ہیں تاکہ دھرنا دینے والے لیٹ کر راستہ نہ روک سکیں۔ ان موقعوں پر اسٹرائیک کرنے والے یا تو شور مچا کر یا ان طلباء کو مخاطب کرکے جماعتوں کا نقصان کرتے ہیں جو اپنے اپنے اُستادوں کے لیکچروں میں اکٹھا ہوتی ہیں

"کل ایک اور نئی بات ہوئی۔ اسٹرائیک کرنے والے طلباء جماعتوں میں آئے، زمین پر لوٹنے لگے اور چیخنے چلانے لگے۔ بعض اسٹرائیک کرنے والوں نے اُستاد کے آنے سے قبل تختۂ سیاہ پر لکھنا شروع کر دیا۔ اگر کوئی اُستاد ذرا نرم مزاج ہے تو بعض اسٹرائیک کرنے والے اسے ڈراتے دھمکاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے وائس چانسلر کو بھی دھمکی دی ہے کہ اگر انھوں نے ان کے مطالبات منظور نہیں کیے تو وہ انھیں جان سے مار ڈالیں گے۔

"ایک اور اہم بات جو مجھے آپ کو لکھنی ہے، وہ یہ ہے کہ

اسٹرائیک کرنے والوں کو بعض باہر کے لوگوں سے بھی امداد ملتی ہے انھوں نے غنڈوں کو لگا رکھا ہے جو یونیورسٹی کے حدود میں داخل ہوتے ہیں اور کاروبار کا نقصان کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ایسے بہت سے غنڈے دیکھے، اور ایسے لوگ جو طالب علم نہیں ہیں، برآمدوں اور جماعتوں کے قریب پھرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبا وائس چانسلر کے خلاف فحش الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔

بہرحال جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہم سب یہ محسوس کرتے رہے ہیں یعنی بعض اساتذہ اور طلبار کی ایک بڑی تعداد، کہ یہ حرکتیں سچائی اور عدم تشدد پر مبنی نہیں ہیں اور اس لیے 'ستیا گرہ' کے منافی ہیں۔

"مجھے بڑے معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ بعض اسٹرائیک کرنے والے طلبا اس بات پر مُصر ہیں کہ یہ عدم تشدد پر مبنی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر مہاتما گاندھی جی اسے تشدد آمیز کہہ دیں تو وہ یہ سب باتیں روک دیں گے۔"

یہ خط ۷/ ار فروری کا لکھا ہوا ہے اور کالکا صاحب کالیلکر کے نام ہے جنھیں یہ اُستاد صاحب اچھی طرح جانتے ہیں۔ خط کا جو حصہ میں نے شایع نہیں کیا ہے، اس میں کالکا صاحب کی رائے دریافت کی گئی ہے کہ آیا طلبار کا یہ فعل عدم تشددانہ کہا جاسکتا ہے اور اس گستاخانہ رویہ کی مذمت کی گئی ہے جو ہندستان کے اتنے سارے طلبار میں عام ہوتا جا رہا ہے۔

اس خط میں ان لوگوں کے نام بھی دیے ہوئے ہیں جو اسٹرائیک کرنے

والوں کو ان باتوں پر برابر اکسا رہے ہیں۔ اسٹرائیک کے بارے میں میری رائے شائع ہونے پر ایک طالب علم نے مجھے بہت غصہ کا تار دیا اور لکھا کہ اسٹرائیک کرنے والوں کا رویہ بالکل عدم تشدد ہے۔ میں نے جو بیان شائع کیا ہے، اس کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے مجھے اس کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ طلبا کا یہ رویہ قطعی تشدد آمیز ہے۔ اگر کوئی شخص میرے گھر کا راستہ روک دے تو یقیناً اس کا یہ فعل اس قدر تشدد آمیز ہوگا جس قدر یہ کہ وہ مجھے دھکا دیکر دروازے سے باہر نکال دے۔

اگر طلبا کو اپنے اساتذہ سے واقعتاً کوئی شکایت ہے تو انھیں اسٹرائیک کرنے اور اپنے اسکول یا کالج پر دھرنا دینے کا بھی حق ہے، لیکن یہ انھیں نہایت نرمی سے ان طلبا کو منع کرنا ہوگا جو جماعتوں میں جانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ زبان سے کہہ کر یا اشتہار تقسیم کرکے کر سکتے ہیں لیکن جو طلبا اسٹرائیک نہیں کرنا چاہتے ہیں وہ ان کا راستہ نہیں روک سکتے ہیں یا ان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈال سکتے ہیں۔

اور ان طلبا نے کس کے خلاف اسٹرائیک کی ہے؟ شری نواس شاستری ہندوستان کے بہترین فاضلوں میں سے ہیں۔ وہ ایک استاد کی حیثیت سے اس سے کہیں پہلے بڑی شہرت پا چکے ہیں جبکہ بہت سے طلبا پیدا بھی نہیں ہوئے تھے یا اگر ہو گئے تھے تو ۱۸،۱۹ برس سے زیادہ نہ ہوں گے۔ دنیا کی کوئی یونیورسٹی بھی انھیں وائس چانسلر کی حیثیت سے اپنے ہاں رکھنے اور ان کے علم و فضل کی عظمت اور ان کی سیرت کی شرافت پر فخر کرے گی۔

اگر کالج صاحب کے نام اس خط کے لکھنے والے نے ان واقعات کو صحیح طور پر پیش کیا ہے جو انا ملائی یونیورسٹی میں پیش آئے ہیں تو میرے خیال

میں شاستری نے حالات کو سنبھالنے کے لیے جو کچھ کیا ہے، بالکل صحیح کیا ہے۔ میرے خیال میں طلبا اپنے رویہ سے خود اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ میں اس پرانے مکتب خیال سے تعلق رکھتا ہوں جو اُستادوں کی عزت کرنے کا قایل تھا۔ میں یہ تو سمجھ سکتا ہوں کہ ایک ایسے اسکول میں نہ جاؤں جس کے اُستادوں کے بارے میں میرے دل میں کوئی عزت نہیں ہے۔ لیکن میں اپنے اُستادوں کی بے عزتی یا ان کی برائی نہیں کر سکتا ہوں۔ ایسی باتیں غیر شریفانہ ہیں اور ہر غیر شریفانہ بات تشدد آمیز ہوتی ہے۔

('ہریجن'، ۴ مارچ ۱۹۳۹ء)

نقد جاں نہیں نذرِ دل!

یہ آگرہ کے طلبا کے ایڈریس کا جواب ہے، جس میں انھوں نے یہ لکھا تھا کہ ہمیں آپ کے مقاصد سے تو اتفاق ہے۔ لیکن ہم اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ان پر عمل کرنے سے مجبور ہیں، اس لیے ہم صرف اپنے دل کی نذر آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں اور بس۔ (مرتب)

یہ اس قسم کی باتیں نہ تھیں جو وہ ملک کے نوجوانوں سے سُننے کے لیے اُمید کرتے تھے۔ وہ اپنی امید اور تقویت کے لیے اگر ملک کے نوجوانوں

سے رجوع نہ کریں تو کس سے کریں؟ وہ گویا موت کے منہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور اب ملک کے نوجوان ان سے یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنے دل دینے کے لیے تو تیار ہیں لیکن وہ اس قدر کمزور ہیں کہ ان کے پیغام کی تعمیل نہیں کر سکتے ہیں۔ نوجوان قوم کی روح ہوتے ہیں۔ اس قوم کے لیے پھر کیا اُمید ہو سکتی ہے، اگر روح جسم سے نکل گئی ہو۔ آگے چل کر انھوں نے فرمایا کہ "میں طلبا سے ان کی نااہلی کا یہ اعتراف سننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ تمہارا تمام علم، تمہارے شیکسپیئر اور ورڈسورتھ کا تمام مطالعہ تمہارے لیے بےکار ہے، اگر اسی کے ساتھ ساتھ تم اپنا کیریکٹر نہیں بناتے ہو اور اپنے خیالات اور اعمال پر قابو حاصل نہیں کرتے ہو۔ جب تم اپنے اوپر قابو حاصل کر لوگے اور اپنے جذبات کو اپنے قابو میں رکھنا سیکھ لوگے، تو تم اس قسم کی مایوسانہ باتیں نہیں کروگے۔"

('ینگ انڈیا'، ۱۹ ستمبر ۱۹۲۹ء)

طلبا کی دشواری

سوال:- ہم لوگ پوٹنہ میں طالب علم ہیں۔ ہم بے تعلیمی دور کرنے کی مہم میں حصہ لے رہے ہیں۔ جن علاقوں میں ہم جاتے ہیں، ان میں کچھ شرابی ہیں جو ہمیں دھمکاتے ہیں، اگر ہم لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے جاتے ہیں۔ جتنا

لوگوں میں ہم کام کر رہے ہیں، وہ ہریجن ہیں۔ وہ بے چارے ان کی اس دھمکی سے ڈر جاتے ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان شرابیوں کے خلاف کارروائی کرنی چاہیئے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ ہمیں آپ کے طریقہ پر انھیں رام کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی صورت میں آپ کیا مشورہ دیں گے؟

جواب:۔ آپ لوگ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ پڑھنا لکھنا سکھانا اور اس قسم کے دوسرے کام اس بڑی اصلاح کے نتائج ہیں جو غالباً موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی اصلاحات سمجھی جاتی ہیں۔ جہاں تک شرابیوں کا تعلق ہے، انھیں بیمار سمجھنا چاہیئے جو ہماری ہمدردی اور خدمت کے مستحق ہیں۔ اس لیے جب وہ صحیح حالت میں ہوں تو آپ ان سے معقولیت سے گفتگو کریں اور اگر وہ مار بھی دیں تو اسے برداشت کریں میں عدالتی کارروائی کے خلاف نہیں ہوں مگر اس سے یہ ثابت ہوگا کہ آپ میں کافی اہنسا نہیں ہے۔ لیکن آپ اپنی فطرت کے خلاف نہیں جا سکتے ہیں۔ اگر آپ نرمی سے برتاؤ کا اثر نہیں پاتے ہیں تو آپ کا کام اس دشواری کی وجہ سے رکنا نہیں چاہیئے۔ قانونی کارروائی اس وقت کی جا سکتی ہے لیکن قانون کی چارہ جوئی سے قبل آپ کو ایمانداری کے ساتھ تمام کوششیں کر لینی چاہئیں۔

(ہریجن، ۸ جون سنہ ۱۹۴۰ء)

ادب میں گندگی

ٹراونکور کے ہائی اسکول کے ایک ہیڈ ماسٹر لکھتے ہیں :-

"آپ جانتے ہیں کہ ٹراونکور کا سیاسی ماحول آج کل کا بہت خراب ہو رہا ہے۔ ہائی اسکول کے طلبا بھی اسٹرائیک کر رہے ہیں اور دوسروں کے خلاف دھرنا دیتے ہیں۔ طلبا میں یہ ایک خیال پیدا ہو گیا ہے کہ آپ طلبا کی اسٹرائیک بلکہ چھوٹے بچوں تک کی اسٹرائیک کے حق میں ہیں۔ میں اس معاملہ میں عام طلبا کے لیے آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں اس سے صورت حال صاف ہو جائے گی۔"

میرا خیال ہے کہ میں طلبا اور شاگردوں کی اسٹرائیک کے خلاف بجز شاذ موقعوں کے کافی بار لکھ چکا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ طلبا اور شاگردوں کا سیاسی مظاہروں اور جماعتی سیاست میں حصہ لینا بالکل غلط ہے ایسے ہنگاموں سے طلبا کی تعلیم کا بہت نقصان ہوتا ہے اور انھیں آئندہ شہری کی حیثیت سے کسی مخصوص کام کے قابل نہیں رکھتا۔ لیکن ایک چیز ہے جس کے لیے طلبا اور شاگردوں کا اسٹرائیک کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ مجھے انجمن فلاح طلبا ، لاہور کے اعزازی سکریٹری کا ایک خط ملا ہے جس میں انھوں نے ان درسی کتابوں سے جو مختلف یونیورسٹیوں نے تجویز کی ہیں نہایت گندی

اور جذبات انگیز عبارتوں کی بکثرت مثالیں نقل کی ہیں۔ وہ اگرچہ تجویز کردہ درسی کتابوں سے لی گئی ہیں تو انھیں پڑھ کر کوفت ہوتی ہے۔ لیکن میں ان صفحات کو انھیں نقل کرکے گندہ کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ میں نے تمام ادب میں جو میں نے پڑھا ہے ایسی گندگی کبھی نہیں دیکھی ہے۔ جو حصّے نقل کئے گئے ہیں وہ نہایت غیر جانبدارانہ طور پر سنسکرت، فارسی اور ہندی کے شعرا سے لیے گئے ہیں۔ میری توجہ سب سے پہلے مہیلا آشرم، وردھا کی لڑکیوں نے اس طرف دلائی تھی اور پھر ابھی حال میں میری بہو نے جو کنیا گرو کل، دہرہ دون میں پڑھتی ہے۔ جو اگرچہ بے پڑھی لکھی نہیں ہے، لیکن اسے کبھی ایسی گندگی سے سابقہ نہیں پڑا جیسی کہ اس نے اپنی بعض درسی کتابوں میں پائی۔ اس نے مجھ سے امداد کی درخواست کی ہے۔ میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے افسران کو ابھار رہا ہوں۔ لیکن بڑے ادارے ذرا مشکل سے حرکت میں آتے ہیں۔ اجارہ داریاں قائم ہو جاتی ہیں۔ مصنفین اور ناشرین کے اپنے مفاد اصلاح میں مانع ہوتے ہیں۔ ادب کا فرار خاص خوشبو چاہتا ہے۔ میری بہو نے یہ تجویز کی اور مجھے اس کی یہ تجویز بہت پسند آئی کہ وہ خواہ امتحان میں ناکامیاب کیوں نہ ہو جائے لیکن وہ ان گندے اور جذباتی حصوں کو یاد نہیں کرے گی۔ یہ اس کی طرف سے ایک ہلکی اسٹرائیک ہے لیکن جہاں تک اس کا تعلق ہے، ایک خاصی اچھی اور بہت موثر اسٹرائیک ہے۔ یہ ایک ایسا موقع ہے جس سے طلبا اور شاگردوں کو نہ صرف اسٹرائیک کرنے کا حق پہنچتا ہے، بلکہ میری رائے میں ان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے ادب کے خلاف بغاوت کریں جو ان پر زبردستی تھوپ دیا گیا ہے۔

ایک شخص کو جو اس کا جی چاہے، پڑھنے کی آزادی ہونی چاہیے لیکن ان نوجوان ذہنوں کے لیے ایسے ادب سے واقفیت جو ان کے حیوانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان میں ان باتوں کی غیر صحت مندانہ کرید پیدا کرے جو وہ بہرحال اپنے وقت پر اور ضرورت کے مطابق سیکھ لیں گے، یہ برائی اور بھی سخت ہو جاتی ہے جب وہ بڑی بڑی یونیورسٹیوں کی مہر لگا کر معصوم ادب کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

ایک منظم صورت میں طلبا کا اسٹرائیک کرنا ایسی اصلاح کے عمل میں لانے کا سب سے موثر طریقہ ہے۔ ایسی اسٹرائیک کو ہڑبونگ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ طلبا صرف ان امتحانات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیں جن میں ایسے قابل اعتراض ادب کا مطالعہ ضروری رکھا گیا ہے۔ ہر پاک ذہن طالب علم کا فرض ہے کہ وہ گندگی کے خلاف بغاوت کرے۔

انجمن نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں کانگریسی وزرا کو اس طرف توجہ دلاؤں کہ وہ ایسی درسی کتابوں یا ان کے ان حصوں کا جو قابل اعتراض ہیں، خارج کر دیئے جانے کی طرف قدم اٹھائیں۔ میں نہایت خوشی کے ساتھ نہ صرف ان سے بلکہ تمام صوبوں کے وزرائے تعلیم سے یہ اپیل کرتا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس بات سے سب کو یکساں دلچسپی ہوگی کہ طلبا کے ذہن صحت مندانہ طور پر نشو و نما پائیں۔

('ہریجن'، ۱۵ راکتوبر ۱۹۳۵ء)

طلبا کی دشواریاں

جنوبی ہند کے کسی ہائی اسکول کے استاد نے کچھ اقتباسات[1] بھیجے ہیں، جن میں طلبا کی بعض دشواریوں کا ذکر ہے۔

ان میں سے اکثر تو بغیر ایک لمحہ کے توقف کے دور ہو سکتی ہیں طلبا کے دماغوں کو بند نہیں رکھنا چاہیے اور نہ استادوں کے دماغوں کو ایسا کرنا چاہیے۔ اُستاد اپنے شاگردوں کو صرف بتا سکتے ہیں کہ وہ یا ریاست ان کے حق میں کون سی راہ بہتر سمجھتی ہے۔ یہ بتا دینے کے بعد پھر انھیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے شاگردوں کے خیالات اور جذبات کو دبائیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان پر پھر کسی ضبط و نظم کی پابندی نہیں۔ کوئی اسکول اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔ لیکن ضبط کا طلبا کی مجموعی نشو نما پر عارضی پابندیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ممکن نہیں ہوگی جہاں ان کے خلاف خفیہ کارروائیاں کی جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ابھی تک ایسے ماحول میں رہتے رہے ہیں جو قومیت کے سخت منافی ہوتا تھا، جہاں یہ باتیں کھلے بندوں نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہ صورت حال بالکل ختم ہو جانی چاہیے۔ طلبا کو جاننا چاہیے کہ قومیت کا جذبہ پیدا کرنا جرم نہیں بلکہ ایک مستحسن فعل ہے۔

ہریجن۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۴۷ء

۱۔ یہ اقتباسات نہیں دیے گئے ہیں، اس لیے کہ جن خیالات میں گاندھی جی نے اظہار کیا ہے، اس کے لیے ان کے دینے کی ضرورت نہ تھی۔

پانچواں باب

مختلف قسم کی تعلیم

١- چھوٹے بچوں کی تعلیم

ایک مثالی مدرسہ

معمولاً چھوٹے بچوں کی تعلیم کا کام سب سے آسان ہونا چاہیے، لیکن نہ جانے کس بنا پر یہ سب سے مشکل ہو گیا ہے یا بنا دیا گیا ہے۔ تجربے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچے ہمیشہ کچھ نہ کچھ سیکھتے رہتے ہیں، خواہ ہم اسے محسوس کریں یا نہ کریں اور جو کچھ وہ سیکھتے ہیں، خواہ وہ اچھا ہے یا بُرا، یہ بات بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہوگی لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں کہ کون بچہ ہے، تعلیم کیا ہے، اور کون بچوں کو تعلیم دینے کا سب سے زیادہ اہل ہے؟ تو جو بات اوپر کہی گئی ہے وہ عجیب نہیں معلوم ہوگی، بلکہ ممکن ہے بالکل صحیح معلوم ہو۔

بچوں سے ہماری مراد وہ لڑکے اور لڑکیاں ہیں جو ١٠ برس سے زیادہ کے نہ ہوں۔ پھر تعلیم کا مطلب صرف پڑھنا لکھنا ہی نہیں ہے۔ پڑھنا لکھنا تعلیم کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ سچ پوچھیے تو تعلیم نام ایک شخص کے حواس کے صحیح استعمال کا ہے جس میں دماغ بھی شامل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ بچہ کو اپنے کام کے اعضاء جیسے ہاتھ، پاؤں وغیرہ اور اسی کے ساتھ علم کے ذرائع کا

جیسے ناک آنکھ، کان وغیرہ کا صحیح استعمال آنا چاہیئے۔ ایک لڑکا جو یہ جانتا ہے کہ اسے اپنے ہاتھ چیزوں کے چرانے یا مکھیوں کے مارنے یا چھوٹے بھائی، بہنوں اور ساتھیوں کے ستانے میں نہیں استعمال کرنا چاہیئے، اس نے تعلیم کا کام گویا شروع کر دیا ہے۔ اسی طرح یہی بات اس لڑکے کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے جو دانت، زبان، کان، آنکھ، ناخن وغیرہ کے صاف رکھنے کی ضرورت سمجھتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ ایک لڑکا جو کھانے یا پینے کے وقت شرارت نہیں کرتا ہے، جس نے کھانا یا پینا خواہ اکیلے ہو یا ساتھ مل کر قاعدے سے سیکھا ہو، جو صحت بخش اور غیر صحت بخش کھانے کا فرق جانتا ہو اور صرف صحت بخش چیزیں کھاتا ہو، جو پیٹو نہیں ہے، جو ہر نئی چیز دیکھ کر اس پر مچلتا نہیں اور جو اسے نہ پاکر خاموش رہتا ہے، ایسے بچے کو کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی تعلیم میں بہت ترقی کی ہے۔ جس بچے کا تلفظ ٹھیک ہو، جو اپنے علاقہ کا جغرافیہ اور تاریخ بیان کر سکتا ہو خواہ وہ ان ناموں سے واقف نہ ہو، جو جانتا ہو کہ مادرِ وطن کا کیا مطلب ہے، ایسے بچے نے تعلیم کی راہ پر کافی فاصلہ طے کر لیا ہے۔ اسی طرح جس بچے نے سچ اور جھوٹ میں، اچھے اور برے میں تمیز کرنا سیکھ لیا ہو، پھر اس کے لیے اس کے مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تصویر میں باقی رنگ خود بھر سکتے ہیں۔ میں صرف ایک بات صاف کرنی چاہتا ہوں: جن چیزوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، انھیں سیکھنے کے لیے لکھنا پڑھنا جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ چھوٹے بچوں کو حروف تہجی سکھانا ان کے ننھے ننھے دماغوں پر غیر ضروری بوجھ ڈالنا ہے اور ان کی آنکھوں اور ہاتھوں کا غلط استعمال کرنا ہے۔ ایک صحیح تربیت یافتہ بچہ لکھنا پڑھنا بغیر کسی خاص کوشش کے سیکھ لیتا ہے اور اس سے زیادہ یہ کہ وقت پر خوشی سے کر لیتا ہے۔ لیکن آج کل یہ

باتیں اس پر ایک بوجھ ہوتی ہیں۔ اس کے قیمتی وقت کا بڑا حصہ جو زیادہ مفید کاموں میں لگایا جا سکتا ہے، ضایع جاتا ہے اور آخر میں بجائے خوشنما حرف لکھنے یا اچھے لب و لہجہ کے ساتھ تلفظ کرنے کے، وہ جو کچھ کر پاتے ہیں، وہ یہ کہ ٹیڑھے میڑھے حرف بنائیں اور بدخط ہوں۔ جہاں تک پڑھنے کا تعلق ہے، وہ جو پڑھتے ہیں اس سے بہتر ہے کہ وہ نہ پڑھتے اور جس بے تکے پن سے پڑھتے ہیں، اس کا کوئی لب و لہجہ درست نہیں ہوتا۔ اسے تعلیم کہنا اس لفظ کی توہین کرنا ہے۔ بچے کو لکھنا پڑھنا سیکھنے سے پہلے اسے ابتدائی معلومات دینی چاہئیں اگر یہ کر لیا جائے تو ہمارا غریب ملک بہت سے خرچ کے بارے بچ جائے گا جو مختلف ریڈروں، بچوں کی کتابوں اور دوسری اسی قسم کی لغویتوں پر کیا جاتا ہے۔ اور بچوں کی کتابیں ایسی ہی ضروری سمجھی جائیں تو وہ اُستادوں کے استعمال کے لیے لکھی جائیں نہ کہ ان بچوں کے لیے جن کا تصور میں نے پیش کیا ہے۔ اگر ہم عام رَو کے ساتھ بہہ نہ جائیں تو یہ باتیں ہمارے لیے روزِ روشن کی طرح صاف اور واضح ہیں۔

جس قسم کی تعلیم کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، اس قسم کی تعلیم بچے صرف گھروں میں پا سکتے ہیں اور وہ بھی ماؤں کے ہاتھوں۔ ایک طرح پر سب بچے اپنی ماں سے کسی نہ کسی طرح کی تعلیم پاتے ہیں لیکن یہ دیکھ کر کہ ہمارے گھر کا شیرازہ گویا بکھر گیا ہے اور بہت سے والدین اس کام کے اہل نہیں ہیں، بچوں کو ایسے ماحول میں رکھنا چاہیے جہاں انھیں وہی فضا مل سکے جو گھر پر ہونی چاہیے تھی۔ چونکہ سب میں ماں ہی اس قابل ہوتی ہے کہ بچوں کی تعلیم کا فرض اپنے ذمہ لے سکے، اس لیے یہ کام عورتوں ہی کے سپرد کرنا چاہیے۔ معمولاً مرد محبت اور صبر میں عورت کی بہ نسبت زیادہ پیچھے ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو بچوں

کی تعلیم کا مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی حل نہ کیا جائے۔ اور میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ جب تک ہم صحیح معنوں میں ماں کی طرح معلمات نہ رکھیں گے جو ہمارے بچوں کو صحیح تعلیم دے سکیں اس وقت تک وہ بے تعلیم یافتہ رہیں گے، خواہ وہ مدرسوں میں بھی جاتے رہیں۔

اچھا آئیے، اب میں مختصر طور پر بچوں کی تعلیم کا ایک خاکہ آپ کے سامنے پیش کروں فرض کیجیے کہ ایک معلمہ کے سپرد پانچ بچے ہیں۔ ان بچوں کو آداب و تہذیب کی کوئی تربیت نہیں دی گئی ہے۔ وہ صاف طور پر بول نہیں سکتے ہیں۔ وہ چلنا نہیں جانتے اور نہ انھیں ٹھیک سے بیٹھنا آتا ہے۔ انکی ناک، آنکھ، کان اور ناخن سب گندے رہتے ہیں اگر ان سے بیٹھنے کے لیے کہا جائے تو وہ ٹانگیں پسار کر بیٹھتے ہیں اور جب وہ بولتے ہیں تو تتلا کر بولتے ہیں۔ ان کو سمت نہیں معلوم۔ ان کے کپڑے میلے ہوتے ہیں اور جیبیں اکثر گندی کھانے پینے کی چیزوں سے بھری ہوتی ہیں جو وہ ہر وقت کھاتے رہتے ہیں۔ سر کے ٹوپی کی باڑ اکثر چیکٹ دکھائی دیتی ہے اور اس سے بدبو آتی ہے۔ ایسی صورت میں وہی معلمہ ان بچوں کی تربیت کر سکتی ہے جو ماں کا سا دل رکھتی ہو۔ سب سے پہلا سبق جو اسے دینا ہوگا وہ صفائی کا ہوگا۔ وہ انھیں اپنی محبت سے شرابور کر دیگی اور انھیں مختلف طریقوں سے بہلائے گی جیسے صرف مائیں جانتی ہیں یا جس طرح کوشلیا، رام کے ساتھ کرتی تھیں اور اس طرح وہ انھیں اپنی محبت کے رشتے میں باندھ لے گی کہ وہ جو کچھ ان سے کرانا چاہے گی کرالے گی۔ وہ اس وقت تک چین نہ لے گی جب تک کہ یہ بچے صاف ستھرے رہنا سیکھ نہ لیں، جب تک کہ ان کے دانت، کان، ہاتھ

اور پاؤں صاف نہ رہنے لگیں، جب تک کہ وہ اپنے کپڑے صاف رکھنا اور اپنے تلفظ درست کرنا سیکھ نہ لیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ سب سے پہلے انھیں راماین پڑھائے گی۔ انھیں خدا کا نام سکھائے گی۔ اس کے بہت سے نام ہیں اور اس سے بحث نہیں کہ وہ کس نام سے پکارا جاتا ہے۔ 'دھرم' کے بعد 'ارتھ' یعنی دنیوی علم کا نمبر آتا ہے۔ چنانچہ اب وہ انہیں حساب پڑھانا شروع کرے گی۔ وہ انھیں پہاڑے یاد کرائے گی اور جوڑ اور گھٹا سکھائیگی۔ اس حد تک جہاں تک زبانی سکھایا جا سکتا ہے۔ ان بچوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ وہ انھیں دریاؤں، ندیوں، پہاڑوں وغیرہ کے بارے میں بتائے گی اور اس سلسلہ میں انھیں سمتوں کا علم بھی ہو گا۔ بچوں کے لیے وہ اپنے علم میں بھی اضافہ کرے گی۔ اس طریقہ تعلیم میں تاریخ اور جغرافیہ الگ الگ مضمون کے طور پر نہیں پڑھائے جائیں گے۔ دونوں، قصے کہانیوں کے طور پر بتائے جائیں گے۔ وہ اسی پر بس نہیں کرے گی۔ ایک ہندو ماں بچپن سے ہی اپنے بچوں کو سنسکرت کے شلوک سنائے گی تاکہ وہ سنسکرت لفظوں کے تلفظ سے آشنا ہو جائیں۔ وہ انھیں خدا کی تعریف میں سنسکرت شلوک بھی یاد کرائے گی۔ ایک محب وطن ماں ان کو ہندی بھی سکھائیگی، اس لیے وہ ان سے ہندی میں بات کرے گی۔ وہ انھیں ہندی کتابوں کے منتخب حصے پڑھ کر سنائے گی اور اس طرح انھیں دو زبانوں کا عادی بنائیگی۔ وہ اب بھی انھیں حروف، تہجی نہیں سکھائے گی بلکہ ان کے ہاتھوں میں برش دیگی۔ وہ ان کو جیومیٹری کی شکلیں بنانا سکھائے گی۔ خط مستقیم اور دائرے بنانا سکھائے گی۔ ایک لڑکا جو پھول، جگ یا مثلث نہ بنا سکے، وہ تعلیم یافتہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے علاوہ وہ انھیں اچھا گانا بھی سکھائے گی۔ جو

بچے ساتھ مل کر قومی گیت یا ترانہ وغیرہ نہیں گا سکیں گے، وہ انھیں ہرگز نہ چھوڑے گی۔ وہ انھیں وقت کے ساتھ ساتھ گانا سکھلائے گی۔ اگر ہو سکا تو وہ انھیں اکتارہ، یا جھانجھ بھی بجانے کو دیگی۔ ان کی جسم کی درستی کے لیے وہ ان سے جسمانی ورزشیں کرائے گی اور ان سے دوڑنے اور کودنے کی بھی مشق کرائے گی۔ پھر وہ لڑکوں میں خدمت اور دوسرے کاموں کا شوق بھی پیدا کرائے گی۔ اس لیے وہ انھیں کا تمام تمام لوازمات کے سکھا یگی جو کیاس چننے سے لیکر آخری منزل تک ہوگا۔ اور یہ بچے بڑے شوق کے ساتھ کم سے کم آدھ گھنٹہ روزانہ کاتیں گے۔

اکثر درسی کتابیں جو آج ہمارے پاس ہیں، اس مقصد کے لیے بیکار ہیں۔ اس لیے معلم نئی کتابیں تلاش کرے گی یا تیار کرے گی اور بچوں سے جو اسے محبت ہے، وہ اس کام میں مدد دے گا۔ ہر گاؤں کی خود اپنی تاریخ اور جغرافیہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قدرتاً اس کی اپنی تاریخ کی کتاب اور اپنی جغرافیہ کی کتاب ہوگی۔ حساب کی مشقیں بھی نئی ہوں گی۔ معلمہ ہر روز جو سبق بچوں کو پڑھانا چاہتی ہے، وہ خود تیار کرے گی۔ وہ نئے نئے حساب بنائے گی اور ہر روز بچوں کو نئی باتیں بتائے گی، جنھیں وہ اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا کرے گی۔ اس طرح اس کا سبق ایک سامیہ کانکی سبق نہ ہوگا بلکہ دلچسپ اور تخلیقی ہوگا۔

نصاب بچوں کی ترقی کے لحاظ سے بدلتا رہے گا۔ اس لیے یہ ہر تیسرے مہینے تیار کیا جائے گا۔ جو بچے اس جماعت میں ہوں گے، وہ مختلف گھروں سے آئیں گے اور ہر ایک کا تربیتی ماحول جدا ہوگا۔ اس لیے ہم سب بچوں کے لیے ایک نصاب نہیں رکھ سکتے ہیں۔ بعض وقت

ان سے یہ بھی کہنا ہوگا کہ انہوں نے جو کچھ سیکھا ہے، وہ اسے بھلا دیں۔ مثال کے طور پر اگر ایک چھ یا سات برس کے بچے نے پھوہڑ طور پر لکھنا سیکھا ہے یا وہ جو کچھ پڑھتا ہے بغیر سمجھے ہوئے پڑھتا ہے تو یہ معلمہ کوشش کرے گی کہ پہلے وہ سب بھول جائے۔ وہ یہ خیال دل سے نکالنا چاہے گی کہ بچہ صرف پڑھ کر ہی علم حاصل کر سکتا ہے۔ یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ جس شخص نے کبھی پڑھنا نہیں سیکھا ہے، وہ بھی عقلمند ہو سکتا ہے۔

میں نے اس مضمون میں تنہا معلمہ کا لفظ نہیں استعمال کیا ہے، بلکہ اس کی بجائے مادر معلمہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس لیے کہ ایک معلمہ کو حقیقت میں ان بچوں کی ماں ہونی چاہیے جنہیں وہ پڑھاتی ہے، جو عورت ماں کی جگہ نہیں لے سکتی ہے، وہ معلمہ بھی نہیں بن سکتی ہے بچے کو کبھی یہ احساس نہ ہونا چاہیے کہ اسے سکھایا جا رہا ہے۔ اسے صرف بچہ پر نگاہ رکھنی چاہیے اور اس کی رہنمائی کرنی چاہیے۔ ایک بچہ جو چھ گھنٹے مدرسہ میں صرف کرتا ہے، بہت ممکن ہے کہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہو، لیکن دوسرا ہر وقت جہاں تک صحیح معنی میں تعلیم کا تعلق ہے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔

یہ بہت ممکن ہے کہ بہ حالات موجودہ ہمیں اچھی معلمات نہ ملیں اگر ایسا ہے تو ہم مردوں سے کام لے سکتے ہیں۔ اس صورت میں ان معلموں کو ماں کی جگہ لینی ہوگی۔ لیکن اصل میں ماں ہی کو یہ کام کرنا ہوگا۔ لیکن اگر میں صحیح ہوں تو ہر ماں جسے بچوں سے محبت ہے، وہ آسانی سے اس کام کے لیے تیار ہو سکتی ہے۔ اور وہ اسی کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی تیار کر سکتی ہے۔

('نوجیون'۔ ۲ر جون ۱۹۲۹ء)

مونٹیسوری ٹریننگ کالج میں[1]

میں نے ان صفحات میں میڈم مونٹیسوری کی گاندھی جی سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایک روح کا دوسری روح سے ملنا تھا۔ وہ اس ملاقات سے اس قدر متاثر تھیں کہ انھوں نے لکھا "گاندھی مجھے ایک آدمی سے زیادہ روح نظر آئے، وہ میرے خیالات میں سالہا سال تک بسے رہے۔ میں نے انھیں اپنی روح سے سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کی نرمی، ان کی مٹھاس ایسی تھی جیسے دنیا میں سختی جیسی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ انھوں نے پورے طور پر اور نہایت آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا، گویا کہ کوئی قید اور رکاوٹ درمیان میں نہ تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ عظیم المرتبت شخصیت شاید ان معلموں کی مدد کر سکے جن کی تربیت میں کر رہی ہوں۔ استاد کو بہت کشادہ دل اور فیاض ہونا چاہئے اور اپنی روح کو بدل دینا چاہئے تاکہ وہ بالغوں کی سخت دنیا سے نکل آئے وہ دنیا جو تمام رکاوٹوں سے پُر ہے۔ اور جو انسانیت کی زندگی کو روکے ہوئے ہے۔ کاش ان کی ملاقات ہمارے معلموں سے انسانیت میں بچہ کی روحانی مدافعت کے کام میں ہماری مدد

---

[1] اس میں گاندھی جی نے میڈم مونٹیسوری اور ان کے اسکول کا ذکر کیا ہے جسے شری مہادیو دیسائی نے اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے۔ (مرتب)

کر سکے!

— گدیاں اور تکیے ہمارے بیٹھنے کے لیے ہمیں مہیا کیے گئے اور بچے جو اسلنگٹن کے غریب قصبہ سے آئے ہوئے تھے، ننھے ننھے فرشتوں کی طرح صاف ستھرے اور سادہ لباس پہنے ہوئے، ننگے پاؤں اور ننگی ٹانگوں کے ساتھ۔ سب نے گاندھی جی کو خالص ہندوستانی طرز کا سلام یعنی 'نمسکار' کیا۔ اور پھر ان بچوں نے ہمیں وہ سب کر کے دکھایا جو انھیں سکھایا گیا تھا۔ یعنی تال سُر کے ساتھ ہاتھ پاؤں کی حرکتیں، توجہ اور قوت ارادہ کی چھوٹی چھوٹی مشقیں، باجے کے ساتھ گانا اور سب سے آخر میں لیکن سب سے اہم 'مون سادھنا'۔ ان سب باتوں سے جو لوگ وہاں موجود تھے، بہت متاثر ہوئے۔ میڈیم مونٹیسوری کو دیکھ کر جو اپنے بچوں میں گھری ہوئی تھیں، ایک شخص کو یہ نظر آتا تھا کہ ایک عالم ہے جو بچوں کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ بچے جو اس خاص کائنات کی ایسی تخلیق ہیں جس میں خالق نے اپنی تمام صفات رکھ دی ہیں۔ اگر میڈیم مونٹیسوری کے تعلیمی حوصلے پورے طور پر بار آور نہ بھی ہوں پھر بھی اس نے والدین اور معلموں کی توجہ بچہ کے اندر صفات عالیہ کی طرف مبذول کر کے انسانیت کی بڑی خدمت کی ہے۔ نہایت پیاری اطالوی زبان میں انھوں نے گاندھی جی کا ایک مختصر خیر مقدم کیا۔ جس کا ان کے سکریٹری نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اور ترجمہ بھی ایک شخص کو اس کیفیت سے بھر دیتا ہے۔

"میں اپنے کورس کے طلباء اور ان دوستوں سے جو یہاں موجود ہیں، چند باتیں کہنی چاہتی ہوں۔ مجھے آپ سے آج ایک بڑی بات کہنی ہے اور وہ روحِ گاندھی کے بارے میں ہے، وہ بڑی روح جس کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں، آج یہاں اپنی جسمانی شکل میں موجود ہے۔ جو آواز آج ہم ابھی سنیں گے،

نہ، وہ آواز ہے جو ساری دنیا میں گونج رہی ہے۔ وہ محبت کے ساتھ بولتے ہیں اور وہ نہ صرف اپنی آواز کے ساتھ بولتے ہیں بلکہ اپنی پوری زندگی کے ساتھ بولتے ہیں۔ یہ ایک ایسی نایاب چیز ہے کہ جب وہ بولنا شروع کرتے ہیں تو ہر شخص گوش بر آواز ہو جاتا ہے ——— (گاندھی جی سے مخاطب ہو کر) آقائے محترم! مجھے فخر ہے کہ آج جو آواز آپ کا خیر مقدم کر رہی ہے وہ تمام لاطینی قوم کی آواز ہوگی۔ یہ آواز آج روم سے اٹھ رہی ہے، وہ روم کا شہر جو مغربی دنیا کے تمام مذہبی خیالات کا گہوارہ ہے۔ اے کاش! میں آج یہاں مغرب کی پوری زندگی اور خیالات ایک مجسم شکل میں مشرق کے احترام کے لیے پیش کر سکتی! میں یہاں اپنے طلبا کو آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں۔ یہاں نہ صرف میرے طلبا ہی ہیں، بلکہ میرے احباب بھی ہیں اور ان احباب کے احباب اور اعزہ بھی ہیں جو یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن میرے طلبا میں بھی بہت سی قوموں کے لوگ ہیں۔ یہاں فراخ دل انگریز استاد، میرے بہت سے ہندوستانی طالب علم، اطالوی طلبا، ڈچ، جرمن، ڈین، سویڈی، چیکوسلوکین، آسٹرین، ہنگرین، امریکن، آسٹریلین، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، کینیڈا اور آئرلینڈ کے طلبا، یہ سب یہاں بچہ کی محبت کی بنا پر یکجا ہوئے ہیں۔

آقائے محترم!

تہذیب اور بچہ، یہ ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے مربوط کرتا ہے اور آپ کے سامنے آنے کا سب سے بڑا موجب ہے، اس لیے کہ ہم بچہ کو رہنے کا طریقہ سکھاتے ہیں، آپ روحانی زندگی کا طریقہ جس پر امن

عالم کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلبا آج زندگی کے طریقہ کے متعلق آپ کی آواز سننے کے لیے یکجا ہوئے ہیں، اور آج ہم سب کے لیے طلبا ہوں، خواہ ان کے احباب، ہماری زندگی میں یہ ایک یادگار دن ہوگا۔ یہ ۴۲ چھوٹے چھوٹے انگریز بچے جنہوں نے آج آپ کے آنے کی تیاری میں بہت کام کیا ہے، آئندہ کے ہونے والے نئے بچوں کے زندہ نمونہ ہیں۔"

اس تقریر نے گاندھی جی کے دل کے تمام تاروں کو چھیڑ دیا، جس سے ایک ایسا نغمہ پیدا ہوا جو اس عظیم موقع کے مناسب حال تھا۔ یہ دنیا کے تمام حصوں کے بچوں کے لیے ایک پیغام بھی تھا اور ایک منشور بھی۔ میں اسے پورا کا پورا دے رہا ہوں۔

"محترمہ! آپ نے اپنے الفاظ سے مجھ پر بہت اثر ڈالا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے، میں اپنے تمام انکسار کے باوجود تسلیم کرتا ہوں، کہ خواہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو، میں اپنے وجود کے ہر رگ و ریشہ سے محبت کے اظہار کی کوشش کرتا ہوں۔ میں اپنے خالق کے وجود کو فوراً محسوس کرتا ہوں جو میرے نزدیک حق کا مظہر ہے۔ اور میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں یہ معلوم کر لیا کہ اگر مجھے حق کی تلاش ہے تو مجھے محبت کے قانون کی اتباع کرنی چاہیے، خواہ اس میں میری جان بھی کیوں نہ جائے۔ اور چونکہ قدرت نے مجھے بچے بھی عطا کئے ہیں، میں نے محسوس کیا کہ محبت کا قانون چھوٹے بچوں کے ذریعہ زیادہ اچھی طرح سمجھا اور سکھا جا سکتا ہے۔ اگر یہ ہمارے لیے نہ ہوتا کہ ان کے جاہل، غریب والدین ہیں، تو ہمارے بچے بالکل معصوم ہوتے۔ میرا اسی کے ساتھ یہ بھی اعتقاد ہے کہ بچے اپنے برے معنی میں شریر نہیں پیدا ہوتا۔ اگر والدین اچھی طرح رہیں سہیں جبکہ بچہ پیدائش سے

قبل اور پیدائش کے بعد، نشو ونما پاتا ہے، تو یہ ایک مسلّم واقعہ ہے کہ بچہ خلقی طور پر حق کے اصول اور محبت کے قانون کی اتباع کرے گا۔ اور جب میں نے یہ سبق اپنی زندگی کے ابتدائی حصے میں سیکھا، تو میں اپنی زندگی میں ایک تدریجی لیکن نمایاں تبدیلی پانے لگا۔

"میں یہاں آپ کے سامنے ان مختلف مراحل کو بیان کرنا نہیں چاہتا جن سے میری طوفانی زندگی گزری ہے، مگر میں نہایت سچائی اور انکسار کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس حد تک میں نے اپنی زندگی، اپنے خیالات، اپنے الفاظ اور اپنے عمل کے ذریعہ اس محبت کا اظہار کیا ہے، میں نے وہ سکون محسوس کیا ہے جو فہم سے بالاتر ہے۔ میں نے اپنے بہت سے دوستوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے، جب انھوں نے مجھ میں یہ سکون دیکھا جس پر وہ رشک کرتے رہے ہیں اور انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس بیش بہا دولت کا سبب کیا ہے۔ میں اس کا سبب انھیں سوائے اس کے اور کچھ نہیں بتا سکا کہ اگر میرے دوستوں کو یہ سکون مجھ میں نظر نہیں آیا ہے، تو یہ صرف اس قانون پر جو ہماری زندگی کا سب سے بڑا قانون ہے، عمل کرنے کی کوشش سے ہے۔

"سنہ ۱۹۱۵ء میں جب میں ہندوستان آیا، اس وقت میں سب سے پہلی بار آپ کے کاموں سے واقف ہوا۔ یہ امریلی نام کی ایک جگہ تھی جس میں میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا اسکول ہے جو مونٹیسوری طریقہ پر چل رہا ہے۔ آپ کا نام میں اس سے پہلے سن چکا تھا۔ مجھے یہ اندازہ کرنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ اس اسکول میں آپ کی تعلیم کی روح نہیں پائی جا رہی ہے۔ ظاہری انداز ضرور رہتا، لیکن اگرچہ کم و بیش ایماندارانہ کوشش کی جا رہی

تھی۔ پھر بھی میں نے دیکھا کہ بہت کچھ اوپری لیا پوتی تھی۔
پھر میں نے اور بھی کئی ایسے اسکول دیکھے اور جتنے اسکول بھی دیکھے
میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کی بنیاد اچھی اور مضبوط ہو گی اگر بچوں کی تعلیم فطرت
کے قوانین کے ذریعہ ہو۔ وہ فطرت جو شرف انسانی سے ہم آہنگی رکھتی ہو، نہ
وہ جو بہایم پر حکومت کرتی ہے۔ میں نے جبلی طور پر یہ محسوس کیا کہ بچوں کی
جس طرح پر تعلیم ہوتی ہے اگرچہ ان کی تعلیم کچھ بہت اچھی ہوتی کبھی نہیں
ہے، پھر بھی ان کی اصل تعلیم کی بنیاد اسی بنیادی قانون پر ہے۔ اس وقت
سے میں آپ کے کئی شاگردوں سے ملا ہوں، ایک نے تو اٹلی کا سفر بھی کیا ہے
اور آپ کی شفقتیں بھی اسے حاصل ہیں۔ میں یہاں آپ کے بچوں اور آپ سے
ملنے کا خواہش مند تھا اور ان سے مل کر مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ میں نے
ان ننھے بچوں کے بارے میں بھی کچھ سیکھنے کی کوشش کی۔ میں نے جو کچھ
یہاں برمنگھم میں دیکھا، اس سے پہلے اس کی ایک جھلک دیکھ چکا تھا اور
ان دونوں میں میں نے بڑا فرق پایا۔ لیکن میں نے یہ دیکھا کہ وہاں بھی انسانی
فطرت اپنے اظہار کے لیے کوشاں تھی۔ میں یہاں بھی وہی چیز دیکھ رہا ہوں
اور میرے لیے یہ انتہائی مسرت کا مقام ہے کہ بچپن ہی سے بچوں کو خاموشی
کی خوبیاں سکھائی جاتی ہیں اور کس طرح وہ اس خاموشی کے عالم میں اپنی
معلمہ کے اشارے پر ایک ایک کرکے آگے بڑھتے ہیں۔ مجھے اس سے بھی بڑی
خوشی ہو رہی تھی، جب میں تال سُر کے ساتھ ان کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا،
اس وقت مجھے غریب ہندوستان کے لاکھوں بچوں کا خیال آیا اور میں نے
اپنے دل سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ جو تعلیم و تربیت آپ کے طریقہ پر یہاں
دی جا رہی ہے، وہ ان بچوں کو بھی میسر آسکتی ہے؟ ہم ہندوستان میں

غریب سے غریب طبقہ کے بچوں میں اس کا تجربہ کر رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ تجربہ کہاں تک کامیاب ہوگا۔ ہمارے سامنے ہندوستان کے ان تنگ و تاریک جھونپڑوں کے بچوں کو صحیح اور اعلی تعلیم دینے کا مسئلہ ہے اور ہمارے پاس کوئی مادی وسائل نہیں ہیں۔

"ہمیں اس لیے اُستادوں کی رضاکارانہ امداد کا سہارا لینا پڑے گا" لیکن جب میں اُستادوں کی طرف نظر اُٹھاتا ہوں تو وہ پہلے کم دکھائی دیتے ہیں اور اس قسم کے تو خاص طور پر اور کم ملتے ہیں۔ جو بچوں کی صحیح فہم رکھتے ہوں، جو ان کی انفرادیت کا مطالعہ کر سکتے ہوں اور پھر انھیں ان کے وسایل پر، ان کے اپنے وقار پر رکھ سکیں اور آپ یقین کریں کہ میں اپنے سیکڑوں بلکہ ہزاروں بچوں کے تجربہ کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ بچے میرے اور آپ کی بہ نسبت کہیں زیادہ لطیف احساس وقار کا رکھتے ہیں۔ زندگی کے بڑے سے بڑے سبق، اگر ہم اپنے کو ذرا نیچے لائیں تو ہم بڑے عالم و فاضل لوگوں سے نہیں بلکہ ان نام نہاد جاہل بچوں سے سیکھیں گے۔ حضرت مسیحؑ نے اس سے بڑی اور بلند حقیقت اور نہیں کہی جب انھوں نے یہ فرمایا کہ عقل شیر خوار بچوں کے منہ سے آتی ہے۔ مجھے اس پر اعتقاد ہے اور میں نے خود اپنے تجربہ میں دیکھا ہے کہ ہم بچوں کے سامنے انکسار اور معصومیت کے ساتھ آئیں تو ہم ان سے بہت کچھ عقل و دانش سیکھ سکتے ہیں۔

"میں آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا۔ میں نے صرف آپ کے سامنے اس وقت وہ باتیں رکھی ہیں جو میرے دماغ کو پریشان کر رہی تھیں یعنی ان لاکھوں بچوں کی جن کا میں نے آپ سے تذکرہ کیا، انسانی معنوں میں ان کی بہترین صلاحیتوں کو اُبھارنا۔ لیکن میں نے صرف ایک سبق

سیکھا ہے اور وہ یہ کہ جو انسان کے لیے ناممکن ہے، وہ خدا کے لیے ایک بازیچہ
اطفال ہے اور اگر ہمیں اس قدرت پر ایمان ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ مخلوق کی
قسمت پر بھی حاوی ہے، تو مجھے کوئی شبہ نہیں کہ سب باتیں ممکن ہیں اور اسی
اُمید پر میں جیتا ہوں اور اس کی مرضی پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس لیے
میں پھر دوبارہ کہتا ہوں کہ آپ بھی جہاں اپنے مختلف اداروں کے ذریعہ ان بچوں
سے محبت کی بنا پر انھیں وہ تعلیم دینے کی کوشش کر رہی ہیں جو ان کے اندر
کی بہترین صلاحیتوں کو اُبھار سکتی ہے، وہاں مجھے یہ اُمید ہے کہ اس قسم کی
تعلیم صرف امراء اور خوشحال گھرانوں کے بچوں ہی کے لیے ممکن نہیں ہے
بلکہ غریبوں کے بچوں کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔ آپ نے بہت صحیح فرمایا ہے کہ
اگر ہمیں اس دُنیا میں امن حاصل کرنا ہے اور اگر ہمیں جنگ کے خلاف جنگ کرنی
ہے تو ہمیں یہ کام بچوں سے شروع کرنا ہوگا، اور اگر وہ اپنی اس فطری معصومیت
کے ساتھ بڑے ہوں گے تو ہمیں نہ جنگ کرنے کی ضرورت ہوگی اور نہ بے کار
رزولیوشن پاس کرنے کی، بلکہ ہم روز بہ روز محبت اور امن میں ترقی کرتے
جائیں گے، یہاں تک کہ دنیا کے تمام گوشے اس محبت اور امن سے معمور ہو
جائیں گے جس کی ساری دُنیا شعوری یا غیر شعوری طور پر بھوکی ہے۔"

(ینگ انڈیا، ۱۹ نومبر ۱۹۳۱ء)

یا ان ملکوں کے بادشاہوں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کی تاریخ یاد کر لیں گے۔

میرا اپنا تجربہ اس کے برعکس ہے۔ لڑکوں کو یقیناً اس قسم کی چیزوں کا جیسے کہ نفس، حقیقت، محبت وغیرہ کا تصور دیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ ہم ایسی زبان استعمال کریں جو ان کی سمجھ سے قریب ہو۔ آپ نے لڑکوں کو اکثر مردہ لاش دیکھ کر یہ سوال پوچھتے سُنا ہوگا کہ "اس کی جان کہاں گئی؟" ایک لڑکا جو یہ سوال کر سکتا ہے، اس کے بارے میں یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ وہ نفس کے بارے میں بھی سمجھ سکتا ہے۔ ہمارے کروڑوں بے پڑھے بچے جھوٹ اور سچ میں اس وقت سے فرق کرنے لگتے ہیں، جب ان میں سمجھ پیدا ہونی شروع ہوتی ہے، کیا کوئی ایسا بچہ ہے جو جبلّی طور پر محبت اور غصہ کے درمیان فرق نہیں کر سکتا جب وہ اپنے باپ ماں کی آنکھوں کو دیکھتا ہے۔ سوال کرنے والے صاحب شاید خود اپنا بچپن کا زمانہ بھول گئے ہیں۔ میں انھیں یاد دلاؤں گا کہ لکھنا پڑھنا سیکھنے سے پیشتر انھوں نے اپنے والدین کی محبت کا مزہ کیا نہیں چکھا تھا اور اسے نہیں سمجھا تھا؟ اگر محبت، سچائی اور روح کی حقیقت ان تک سوائے زبان کے اور ذریعہ سے نہ پہونچائی گئی ہوتی تو وہ کب کے ختم ہو گئے ہوتے۔

جو ترجمہ ان طالب علم صاحب نے نقل کیا ہے، اس میں فلسفیانہ حقیقتوں کی خشک اور بے روح بحث سے مراد نہیں ہے بلکہ ایسی ابدی خوبیوں کا جیسے سچ وغیرہ ہیں، عملی طور پر ان کی روزمرہ کی زندگی میں پیش کرنا مقصود ہے اور اس طرح یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ خوبیاں ان میں بھی ہیں، پڑھنے لکھنے کی ایک قیمت ہے لیکن ایک اچھی سیرت کا پیدا کرنا اس سے زیادہ اہم ہے۔ علمی قابلیت کو سیرت پر ترجیح دینا ایسا ہی ہے جیسے گاڑی کو گھوڑے کے آگے

رکھتا ہے۔ ولیس جو ایک بہت بڑا سائینسداں اور ڈارون کا ہمعصر تھا، اس نے نوّے ۹۰ برس کی عمر میں جا کر کہیں یہ کہا ہے کہ اس وقت جو قومیں تعلیم یافتہ اور مہذب کہی جاتی ہیں، میں نے ان کی سیرت میں اور غیر مہذب جاتیوں کی سیرت میں کوئی فرق نہیں پایا ہے۔ اگر ہم آج کل کے زمانے کی بعض سطحی باتوں کے گرویدہ نہیں ہو گئے ہیں تو ہم ولیس کے اس قول کی حقیقت کو سمجھ سکیں گے اور اپنی تعلیم کو مختلف انداز میں سوچ کر اس کی تنظیم کریں گے۔

اس سوال کے جواب میں کہ آیا راون کے دس سر تھے، میں ایک اور سوال کروں گا، لڑکوں کے لیے کون سی بات قبول کرنی آسان ہے: یہ کہ ایک دس سروں والا شخص تھا — جو لغو معلوم ہوتا ہے — جس کا نام راون تھا یا یہ کہ برائیوں کا ایک دس سروں والا راکشش جو چور کی طرح ہر وقت انسان کے دل میں موجود رہتا ہے؟ ہم ان کے ساتھ بڑی ناانصافی کرتے ہیں اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں تخیل اور سمجھ نہیں ہوتی ہے — نہ صرف یہ بلکہ ایسا سمجھنے میں ہم اپنی کم فہمی کا ثبوت دیتے ہیں۔

ہم کو اس جملے کا کہ 'لڑکے کافی سمجھدار ہوتے ہیں'، یہ مطلب ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بغیر کہے بھی سمجھ لیں گے، یہ بات کہ ایک دس سروں والا آدمی ہو سکتا ہے، آپ خواہ کتنا ہی سمجھائیں، ایک لڑکے کی سمجھ میں مشکل سے آ سکتا ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس بات کا مطلب کہ ایک دس سروں والا راون جو ہر وقت ہمارے دلوں میں موجود رہتا ہے، فوراً سمجھ لیں گے۔

مجھے امید ہے کہ اب ان طالب علم صاحب نے اچھی طرح سمجھ لیا

ہوگا کہ میں لڑکوں کو تلسی داس کی رامائن یا ویاس کی گیتا سنانے میں کیوں نہیں جھجکتا، میرا انھیں کرم تیاگ یا شیتا پراجنا کا فلسفہ پڑھانے کا کوئی منشا نہیں ہے، میں نہیں سمجھتا کہ خود میں نے کبھی اسے پورے طور پر سمجھا ہے۔ شاید اگر میں کرم وغیرہ کے فلسفہ پر کوئی عالمانہ کتاب پڑھوں تو میں اسے سمجھ سکوں، اگرچہ یہ بھی مشروط ہے، اور اگر میں اسے سمجھ بھی لوں تو میں اس سے اکتا جاؤں گا۔ لیکن جب میں گیتا کو ایک ایسی قربانی خیال کرتا ہوں جو میں اپنے لاکھوں بے زبان ہم وطنوں کے لیے کر رہا ہوں اور پھر اپنی تمام خوشیوں کو ترک کر دیتا ہوں، پھر اس وقت نیند کا خیال خواہ اس میں کتنا ہی مزہ آئے، ایک خطرناک سانپ سے کم نہیں دکھائی دیتا اور میں آنکھیں پھاڑے جاگتا رہتا ہوں۔ یہ میرا پختہ عقیدہ ہے جو میرے اپنے تجربہ پر مبنی ہے، کہ اگر بچپن میں گیتا کی تعلیم ایک سادہ طریقے سے دی جائے تو لڑکے کی زندگی میں آگے چل کر اچھا نتیجہ نکلے گا اور اس لیے یہ دینے کے قابل ہے۔

(نوجیون، ۹ ستمبر ۱۹۲۸ء)

ایک مشکل سوال

ایک استاد صاحب لکھتے ہیں:

"ہمارے پرانوں میں جو قصے آتے ہیں، ان میں دیوی دیوتاؤں کا بہت عجیب و غریب ذکر آتا ہے اور ان کے

متعلق مختلف قسم کے خیالی قصّے بیان کیے گئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ فطرت کی یا انسانی دماغ کی مختلف طاقتوں کی علامات ہیں۔ ہم ان کی اسی طرح پوجا کرتے ہیں، اگرچہ ہم سوال کر سکتے ہیں کہ آیا ان کی یہی شکلیں ہیں یا واقعتاً وہ سُورگ، یا کیلاش، یا بیکنٹھ، میں رہتے ہیں، پھر بھی ہم ان قصّوں کو تسلیم کرتے ہیں اور انھیں استعمال کرتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان میں مذہبی تعلیم ہے یا یہ بہ طور شاعری ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم انھیں بچوں کے سامنے کیسے پیش کریں؟ اگر ہم صرف ان کی روح یا اندرونی معنی باقی رکھیں اور ان کی اس شکل کو بدل دیں جس میں وہ ظاہر کیے گئے ہیں تو ہمیں پھر بہت سی روایات اور قصّوں کو ختم کر دینا ہوگا۔ علاوہ اس کے ہمیں بچوں سے یہ بھی کہنا پڑے گا کہ ان میں بہت سے فرضی ہیں (مثلاً ایک یہ روایت کہ راہو چاند اور سورج کو نگل جاتا ہے) بہت سے اور قصّوں میں (مثلاً شنکر اور پاربتی کا، لہروں کا اٹھنا وغیرہ) اگر دیوی اور دیوتاؤں کی شکلوں کا ذکر چھوڑ دیا جائے تو پھر ان کی ساری کشش جاتی رہتی ہے، پھر کیا ہم وقتاً فوقتاً انھیں بتاتے رہیں کہ ہمارے اکثر قصّے اور روایات خیالی ہیں؟ یا ہمیں پھر ان سب کو فوراً مسترد کر دینا چاہیے؟ لیکن کیا اس سے تمام تعلیم میں مثالیت کی تردید نہیں ہوگی جو بچوں کے دماغوں پر نہایت گہرا اثر ڈالتی ہے اور جس میں بڑی

شعریت بنی ہے ؟ کہا جاتا ہے کہ جس وقت مذہبی قصّے سنائے
جائیں اس وقت ایک پُروقار ماحول پیدا کیا جائے۔
اس میں کسی نقاد کی گنجائش نہیں ہے۔ یا ہم جیسا اس
وقت کر رہے ہیں، اسی کو جاری رکھیں اور یہ سمجھتے رہیں
کہ بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی پرستش غلط نہیں ہے بلکہ
یہ ایک ادنیٰ درجہ کی حقیقت ہے جو اس وقت تک کے لیے
عارضی مقصد کو پورا کر رہی ہے جب تک لڑکے بڑے نہ
ہو جائیں اور اصل حقیقت کو سمجھ سکیں ؟ آیا یہ حقیقت
کی توہین ہوگی یا نہیں ؟ یہ مسئلہ ایک عملی حیثیت رکھتا
ہے، اس لیے کہ یہ سوال قصّے کہانیاں سنانے کی جماعت
میں پیدا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہمارا بہ حیثیت ایک ہندو
اور استاد ہونے کے پُرانوں کے قصّے کہانیوں کے
متعلق کیا رویہ ہونا چاہیئے ؟"

میں اس سوال کے جواب دینے کی کوشش اس لیے کر رہا ہوں
کہ میں بھی ایک طرح کا معلّم ہوں، اور اس لیے کہ میں نے اس میدان
میں کچھ تجربے کئے ہیں اور اب بھی کر رہا ہوں۔ یہ سوال ایک دوست
نے اٹھایا ہے۔ یہ اور اس قسم کے اور سوالات کے جواب میرے ذمہ کچھ
عرصہ سے باقی چلے آرہے ہیں۔ یہ صاحب جنہوں نے یہ سوال کیا ہے، یہ
نہیں چاہتے ہیں کہ اس کا جواب "نوجیون" کے ذریعہ دیا جائے، یہ خیال
کر کے کہ بہت سے استاد اپنی مشکل حل کرنے میں مجھ سے مدد چاہتے
ہیں اور ان میں سے بعضوں کو اس مسئلہ میں شاید میرے خیالات سے

رہنمائی ملے، میں نے اس کا جواب 'نوجیون' کے ذریعہ ہی دینا مناسب سمجھا ہے۔

ذاتی طور پر میں پُرانوں کو مذہبی کتاب سمجھتا ہوں اور دیوی اور دیوتاؤں پر بھی میرا عقیدہ ہے۔ لیکن میں ان پر اس طرح کا عقیدہ نہیں رکھتا، جس طرح پُرانوں کے مفسرین بیان کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اسی طرح بیان کریں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں اس طرح ان پر عقیدہ نہیں رکھتا جس طرح کہ عام سماج آج کل رکھ رہا ہے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ 'اندر'، 'ورُن' وغیرہ دیوتا آسمان میں رہتے ہیں اور یہ کہ ان کی علیحدہ کوئی ہستی ہے، یا یہ کہ سرسوتی وغیرہ دیویاں کوئی علیحدہ وجود رکھتی ہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ دیوی اور دیوتا مختلف قوتوں کے مظاہر ہیں۔ ان کے بیان میں کچھ شاعری ہے۔ مذہب میں شاعری کا بھی مقام ہے۔ ہندو مذہب نے ہر چیز کو جس پر ہم عقیدہ رکھتے ہیں، مذہبی کتاب کا جامہ پہنا رکھا ہے۔ ایک طرح سے تمام وہ لوگ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا میں لاتعداد طاقتیں ہیں، ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دیوی اور دیوتاؤں پر بھی عقیدہ رکھتے ہیں جس طرح خدا میں لاتعداد طاقتیں ہیں، اسی طرح اس کی لاتعداد شکلیں بھی ہیں ایک شخص کو اس کی عبادت جس نام اور شکل میں وہ بہتر سمجھتا ہے، کرنے کی آزادی ہونی چاہیئے۔ اس میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا ہے۔ جہاں اور جب ضرورت سمجھی جائے، ان علامتوں اور استعاروں کی تشریح کر دی جائے اور لڑکوں کو ان کے معانی بتا دیئے جائیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ایسا کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کروں گا۔ اور نہ میرا تجربہ مجھے

بتا تا ہے کہ اس سے کبھی کوئی مضر اثر پیدا ہوا ہے۔ یہ میں نہیں چاہتا کہ
لڑکوں کو غلط جانب لے جاؤں مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی دشواری
نہیں ہوتی کہ ہمالیہ، شیو دیوتا ہیں، اور گنگا، پاربتی کے روپ میں
اس کی جٹاؤں سے نکلی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سے خدا کے ساتھ
میرے جذبۂ عقیدت کو اور تقویت پہنچتی ہے اس سے مجھے اس بات
کے سمجھنے میں اور مدد ملتی ہے کہ ہر چیز میں خدا کا وجود ہے۔ ایک شخص
سمندر کی لہریں اٹھنے اور دوسرے شعبوں کی جس طرح چاہے تاویل
کرسکتا ہے۔ بہرحال اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ جو تاویلیں بھی
کی جائیں، وہ اچھے اخلاق اور اچھے چال چلن پیدا کرنے میں مددیں۔
علمار نے بے شک ایسی تاویلیں اپنی ذہانت کے مطابق پیش کی ہیں
لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ صرف علمار ہی ان کے مخفی معنی بتا سکتے ہیں جس
طرح انسان کے اندر نشو ونما کا ایک عمل ہوتا ہے اسی طرح الفاظ اور جملوں
کے معنی میں بھی ہوتا ہے جس طرح ہمارا ذہن اور دل نشو ونما پاتا ہے،
اسی طرح الفاظ اور جملوں کے معنی میں بھی نشو ونما ہونی چاہیئے اور ہوتی
ہے۔ جب لوگ معنی کو حدود کے اندر محدود کر دیتے ہیں اور اس کے
گرد بندش لگا دیتے ہیں، تو اس وقت سے اس میں اختلاط آنا لازم ہو
جاتا ہے۔ معنی اور معنی کی تاویلیں کرنے والے دونوں ساتھ ساتھ
ترقی کرتے ہیں اور ہر آدمی اپنی پسند اور تصور کے مطابق جو کچھ ان
کتابوں میں پڑھتا ہے، وہ اس کو توڑ مروڑ کر بیان کرے گا۔ جن کے
دماغ گندے ہیں، وہ بھگوت گیتا میں جنسی صحبتوں کی تفصیل دیکھے گا۔
لیکن ایکانا بھتہ نے اس سے خودی کے مظاہر پیدا کیے۔ میرا پختہ ایمان

ہے کہ بھگوت گیتا کے مصنف کا جنسی صحبتوں کی ہمت افزائی مقصود نہ تھی
لیکن آج کل کے زمانہ کے جو لوگ اس میں اپنے اخلاقی احساس کے خلاف
کوئی بات دیکھتے ہیں تو انھیں اس سے انکار کا پورا حق حاصل ہے۔ یہ
سمجھنا کہ جو کچھ چھپا ہوا ہے، خاص طور سے اگر یہ سنسکرت میں ہے، وہ سب
صحیح مذہب ہے، تو ایسا سمجھنا کورانہ توہم اور سخت حماقت ہے۔
اس لیے میں اس مسئلہ کے حل کا صرف ایک سنہری قاعدہ جانتا ہوں
اور میں یہ ان کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں جو استاد ہیں۔ ہم کو ہر اس چیز
سے انکار کر دینا چاہیے، خواہ وہ ویدوں میں ہو، پرانوں میں ہو یا اور
کسی مذہبی کتاب میں ہو، جو حق کے خلاف ہو یا جس سے برائی پیدا
ہونے کا امکان ہو۔ میں یہاں اپنا ایک تجربہ بیان کر دینا چاہتا ہوں
جو مجھے جیل میں پیش آیا تھا۔ میں نے اکثر لوگوں کو جے دیو کی گیتا گووند
کی تعریفیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ اس لیے میں اس کتاب کو جب جب
مجھے موقع ملتا پڑھنا چاہتا۔ اس نظم سے ممکن ہے بہت سے لوگوں کو
خط ملتا ہو، مجھے نہیں معلوم۔ لیکن مجھے اس کا پڑھنا سخت تکلیف کا باعث
ہوا۔ میں نے اسے پڑھا لیکن اس کے بیانات سے مجھے سخت تکلیف ہوئی
میں بلا تکلف تسلیم کرتا ہوں کہ اس میں قصور تمام تر میرا ہی ہوگا۔ میں اپنا
یہ تجربہ اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ پڑھنے والے کو ہمیشہ یہ آزادی ہے کہ
جو بات وہ اپنے اخلاقی احساس کے خلاف سمجھے، اسے وہ مسترد کر دے
چونکہ گیتا گووند نے میرے دماغ پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا، اس لیے
میں اس کو پڑھ نہیں سکا۔ اور میں نے اسے اس لیے مسترد کیا کہ ایسے
معاملات میں میں اپنا علیحدہ معیار رکھتا ہوں۔ صرف وہی باتیں

مذہبی اعتبار سے مفید ہو سکتی ہیں جو بُرے خیالات کو دُور کرنے اور اپنی اندھی پسند اور ناپسند کے کم کرنے کا موجب ہو سکیں، وہ چیزیں جو ایک شخص کے دماغ کو اس قدر مضبوط بنا سکیں کہ وہ حق پر سولی چڑھائے جانے پر بھی قایم رہے، پڑھنے کے قابل ہیں۔ گیتا گووندا اس معیار پر پورا نہیں اترا اور اس لئے میں اس کو پڑھ نہیں سکا۔

ہم میں بہت سے بوڑھے لوگ ہیں اور کچھ نوجوان بھی، جو یہ سمجھتے ہیں کہ ایک کام صرف اس وجہ سے کرنے کے قابل ہے کہ وہ مذہبی کتابوں میں دیا ہوا ہے۔ اس قسم کا غلط عقیدہ بہت مضر ہے اور یقیناً ہماری اخلاقی پستی کا باعث ہوگا۔ ہم صحیح طور پر نہیں جانتے کہ شاستر کیا ہے؟ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ شاستر میں ہے، وہ مذہب ہے اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں تو اس سے بُرے نتائج پیدا ہونے لازم ہیں۔ مثال کے طور پر منوسمرتی کو لیجیے۔ میں نہیں کہتا کہ اس کی کونسی آیتیں صحیح ہیں اور کونسی اضافہ شدہ، مگر ان میں کئی ایک ایسی ہیں جو اپنے معنی کے لحاظ سے مذہبی نہیں کہی جا سکتی ہیں۔ ایسی آیتوں کو ہمیں مسترد کر دینا چاہیے۔ مَیں تلسی داس کا بڑا مداح ہوں، اور میں راماین کو شاعری کے لحاظ سے ایک بہت بڑی چیز سمجھتا ہوں، لیکن میں اس خیال کی تائید نہیں کر سکتا جو اس نظم میں ہے: "ڈھول، گنوار، بیوقوف شودر، جانور، عورتیں ـــــ یہ پیٹنے ہی سے درست رہتے ہیں۔"

چونکہ تلسی داس نے زمانہ کے مروجہ خیالات کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی ہے اس لئے میرے لیے یہ ٹھیک نہ ہوگا کہ ہمیں شودر کہا جائے، یا اپنی بیوی کو یا جانوروں تک کو اگر وہ میرے قابو میں نہ آئیں تو مارنا

شروع کردوں۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ مراسلہ نگار نے جو سوالات کیے تھے، ان کا جواب صاف ہوگیا ہوگا۔ میں دیوی دیوتاؤں کو اس حد تک ماننے میں کوئی دشواری نہیں سمجھتا ہوں کہ اس سے اچھے کردار پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے میں یہ نہیں سمجھتا کہ اگر تمثیلوں کو عریاں کردیا جائے اور ان کے اندرونی معنی بیان کیے جائیں تو لڑکوں کی ان قصوں میں دلچسپی نہ رہے گی، لیکن یہ سمجھ کر کہ ان کی دلچسپی نہیں رہے گی' اس صورت میں، میں حقیقت کو قربان کرکے لڑکوں کو ان غلط تصورات کی طرف لے جانے کو اچھا نہیں سمجھتا۔

ہمیں طلبا کو حقیقت میں جو رس' بھی ہے' وہ دینا چاہیئے۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ یہ 'رس' ظاہر کیا جاسکتا ہے اور بچوں تک پہنچایا جا سکتا ہے سب سے پہلے تو ان سے صاف کہدینا چاہیئے کہ دس سروں کا شیطان بالکل ناممکن ہے، نہ کبھی پہلے تھا اور نہ آئندہ ہوگا۔ جب یہ بات صاف کردی جائے گی تو نہ یہ حقیقت کے خلاف ہوگی اور نہ اس کا رس جائے گا اس وقت ہم راون کا قصہ لڑکوں کو اس طرح سنائیں گویا وہ کسی زمانے میں موجود تھا۔ بچے اس قدر ذہین ہوتے ہیں کہ وہ یہ سمجھ جائیں گے کہ یہ دس سروالا راون اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ یہ وہ برائی ہے، جو ہمارے اندر رہے جس کے نہ دس سر بلکہ ہزار سر ہیں۔ ایسا پ کی کہانیوں میں چڑیاں اور جانور آدمیوں کی طرح بولتے ہوئے دکھائے گئے ہیں لڑکے اور لڑکیاں جانتے ہیں کہ پرندے اور جانور باتیں نہیں کرسکتے ہیں، پھر بھی اس سے ان کی دلچسپی ان قصوں میں ایک ذرہ کم نہیں ہوتی۔ (نوجیون ۱۸ر جولائی ۱۹۲۶ء)

حقیقت کا مسخ کرنا

ایک مراسلہ نگار ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی مدد سے اسکول کے لڑکوں میں گیتا کی تعلیم رائج کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ایک جلسہ میں جو گیتا سنانے کے لیے منعقد کیا گیا تھا، ایک بینک کے منیجر صاحب کھڑے ہوئے اور یہ کہہ کر تمام کارروائی کو درہم برہم کرنا چاہا کہ طلبا کو گیتا پڑھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ کوئی کھیل نہیں ہے جو طلبا کے سامنے رکھ دیا جائے۔ اس مراسلہ نگار نے اس واقعہ کے متعلق ایک طویل اور مدلل خط مجھے لکھا ہے اور اپنی دلیل کی تائید میں رام کرشن پرم ہنس کے کچھ اقوال بھی نقل کیے ہیں، جس کو خلاصہ میں ذیل میں درج کر رہا ہوں :-

"لڑکوں اور نوجوانوں کو خدا کی تلاش کا شوق دلانا چاہیے۔ وہ ان پھلوں کی طرح ہیں جن پر ابھی چڑیوں نے چونچ نہیں ماری ہے، اور وہ دنیوی خواہشات سے بالکل پاک ہیں۔ ایک مرتبہ جب یہ خواہشات دماغ میں پیدا ہو جاتی ہیں، تو پھر انھیں نجات کے راستے پر چلانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔"

"میں نوجوانوں کو اس قدر کیوں عزیز رکھتا ہوں، اس لیے کہ وہ اپنے دماغوں کے کلی مالک ہوتے ہیں جو ان کے بڑے ہونے کے ساتھ تقسیم در تقسیم ہوتا جاتا ہے۔ ایک

شادی شدہ شخص کا نصف حصہ دماغ تو اپنی بیوی کی طرف چلا جاتا ہے۔ جب ایک لڑکا ہو جاتا ہے تو ایک چوتھائی وہ لے لیتا ہے اور بقیہ چار آنے والدین، دنیوی اعزاز، لباس وغیرہ پر چلے جاتے ہیں، اس لیے ایک نوجوان کا دماغ آسانی کے ساتھ خدا کو سمجھ سکتا ہے۔ بڑی عمر والوں کے لیے ایسا کرنا مشکل ہوتا ہے۔"

"طوطے کے حلق کی جھلی اگر عمر کے ساتھ موٹی ہو جائے تو اسے گانا نہیں سکھایا جا سکتا۔ اسے اسی وقت سکھانا چاہیے جب وہ چھوٹا ہوتا ہے۔ اسی طرح بڑھاپے میں دماغ کا خدا پر جمنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ جوانی میں یہ زیادہ آسان ہوتا ہے۔"

"اگر ایک سیر دودھ میں ایک چھٹانک پانی ملا ہو تو اس کا کھویا بنانے میں بہت کم محنت اور ایندھن کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اگر اسی دودھ میں تین پاؤ پانی ملا ہو تو پھر اس کا گاڑھا کرنا آسان نہیں ہوتا اور اس کے لیے بہت ایندھن کی ضرورت ہوگی۔ ایک نوجوان کا دماغ جو ابھی دنیوی خواہشات سے بہت کم متاثر ہے، اُسے آسانی کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے، لیکن ایسا بڑی عمر والوں کے دماغ کے ساتھ نہیں ہو سکتا ہے جو اس قسم کی خواہشات سے بہت متاثر ہو چکے ہوں۔

"نرم بانس آسانی کے ساتھ موڑا جا سکتا ہے۔ لیکن پکا ہوا

بانس اگر موڑا جائے تو ٹوٹ جائے گا۔ نوجوانوں کے دلوں کو
خدا کی طرف موڑنا آسان ہے، لیکن بڑوں کے دل اگر
اس طرف لائے جائیں تو وہ نکل بھاگتے ہیں؛

"انسان کا دماغ سرسوں کی ایک پوٹلی کی مانند ہے
جس طرح سرسوں کے دانے اگر پوٹلی پھٹ جائے تو ان کا
جمع کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ ہر طرف بکھر جاتے ہیں، اسی
طرح انسان کا دماغ بھی جب مختلف سمتوں میں چلا جاتا ہے
اور بہت سی دنیوی چیزوں میں پھنس جاتا ہے تو پھر اسے
یکجا کرنا اور مرکوز بنانا آسان نہیں ہوتا ہے۔ نوجوان کا دماغ
تو ابھی مختلف سمتوں میں نہیں لگا ہے، کسی چیز پر بھی آسانی
سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک بوڑھے آدمی کا دماغ جو
دنیوی باتوں میں پھنس چکا ہے، اس کا ان باتوں سے ہٹانا
اور خدا پر متوجہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے؛

"میں نے ویدوں کے سلسلے میں توحق کا لفظ سنا تھا، لیکن مجھے یہ
نہیں معلوم تھا کہ گیتا کے بارے میں بھی کچھ اوصاف کی ضرورت ہے،
جو منیجر صاحب اپنے دماغ میں رکھتے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر وہ صاحب ان
اوصاف کی نوعیت بیان کر دیتے جن کی ضرورت وہ گیتا پڑھنے میں سمجھتے
ہیں۔ خود گیتا میں یہ صاف طور پر لکھا ہے کہ وہ سب کے لیے ہے سوائے
ان کے جو اس کا مذاق اڑائیں۔ اگر ہندو طلبا، گیتا نہیں پڑھ سکتے ہیں تو
وہ اور بھی کتابیں بھی نہیں پڑھ سکتے۔ سچ پوچھیے تو ہندو مذہب میں ایک
طالب علم کی زندگی برہمچاری کی زندگی ہے جو اسے مذہب کے علم کے ساتھ

اس پر عمل سے شروع کرتا ہے تاکہ وہ جو کچھ سیکھتا ہے اُسے ہضم بھی کرتا جائے
اور مذہبی عمل کو اپنی زندگی کا ایک جزو بنالے۔

پرانے زمانے میں طالب علم مذہب عمل سے شروع کرتا تھا قبل اس
کے کہ وہ جانے کہ مذہب کیا ہے اور اس عمل کے ساتھ اسے علم کی روشنی بھی
ملتی تھی تاکہ وہ یہ سمجھ سکے کہ اس کے لیے یہ زندگی کیوں ضروری قرار دی
گئی ہے۔

اُس وقت حق بے شک تھا، لیکن یہ صحیح زندگی کا حق تھا، جسے پانچ
"یم"، یا بنیادی عہد کہتے ہیں:

(۱) "اہمسا، (عدم تشدد) ستیہ، (حق)، "استیہ، (چوری نہ
کرنا)" اپری گیرہ، (انکار ملکیت) اور برہمچریہ، (ترک تاہل)۔ یہ قاعدے
تھے جسے ہر شخص کے لیے ماننا ضروری تھا جو مذہب کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔
اسے مذہب کی ان بنیادی باتوں کی ضرورت ثابت کرنے کے لیے مذہبی
کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت نہ تھی۔

لیکن آج 'حق' کا لفظ دوسرے ایسے اہم لفظوں کی طرح مسخ ہو گیا
ہے اور ایک آوارہ شخص، صرف اس لیے کہ وہ برہمن کہلاتا ہے، ہمیں
شاستر بتانے کا حق رکھتا ہے، اور برعکس اس کے ایک دوسرا آدمی
جسے اس بنیاد پر اچھوت کہا جاتا ہے کہ پیدائشی طور پر ایک خاص گھر پیدا
ہوا ہے؛ خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو، ہمیں شاستر پڑھ کر نہیں
سنا سکتا ہے۔

لیکن مہابھارت کے مصنف نے گیتا جس ۔ ایک جزو ہے، یہ بڑی
کتاب اس غرض سے لکھی تھی کہ یہ فرق مٹ جائے اور بلا امتیاز ذات

ہر ایک کو اس کے پڑھنے کی اجازت تھی، بشرطیکہ میرے خیال سے وہ ان باتوں پر عمل کرتا ہو جو میں نے اوپر بیان کی ہیں۔ میں نے اپنے خیال کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ لکھنے کے وقت مجھے یاد نہیں کہ مہابھارت کے مطالعہ کے لیے یوں پر عمل کرنا کوئی لازمی شرط تھی۔ بہر حال تجربہ بتاتا ہے کہ صفائی قلب اور عقیدت مذہبی کتابوں کے صحیح فہم کے لیے ضروری ہیں۔

آج طباعت نے تمام قیود اٹھا دی ہیں اور مذہب کا مذاق اُڑانے والے بھی آج اسی آزادی کے ساتھ مذہبی کتابیں پڑھتے ہیں جس آزادی سے کہ مذہبی خیال کے لوگ پڑھتے ہیں۔ لیکن یہاں ہم مذہبی تعلیم اور مذہبی زندگی کے اعتبار سے طلبا کے گیتا پڑھنے کے حق سے بحث کر رہے ہیں۔ میں نہیں خیال کرتا کہ کوئی اور جماعت بھی طلبا سے زیادہ اس کی تعلیم کے لیے ان قیود کی پابند اور موزوں ہو سکتی ہے۔ بدقسمتی یہ کہ نہ تو بیشتر طلبا اور نہ اساتذہ ان پانچوں پابندیوں کے اصلی حق کا خیال کرتے ہیں۔

(ینگ انڈیا - ۸ دسمبر ۱۹۲۷ء)

گیتا قومی مدرسوں میں

ایک مراسلہ نگار صاحب دریافت کرتے ہیں کہ آیا گیتا قومی مدرسوں میں تمام لڑکوں کے لیے، خواہ وہ ہندو ہوں یا غیر ہندو، لازمی طور پر پڑھائی

جاسکتی ہے۔ جب میں اب سے دو سال قبل میسور کا سفر کر رہا تھا تو میں نے
اس بات پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ ایک ہائی اسکول کے ہندو طلبا گیتا
نہیں جانتے ہیں۔ اس لیے میں اس بات کا قایل ہوں کہ نہ صرف قومی مدرسے
بلکہ ہر تعلیمی ادارے میں گیتا کی تعلیم ہونی چاہیے۔ ہندو لڑکے یا لڑکی کے لیے
یہ بڑے شرم کی بات ہونی چاہیے کہ وہ گیتا نہ جانے۔
لیکن میرا اصرار لازمی نہیں قرار دیتا ہے، بالخصوص قومی مدرسوں
کے لیے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ گیتا عالمی مذہب کی ایک کتاب ہے لیکن یہ دعویٰ ہر
ایک کے لیے لازمی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ایک عیسائی، یا مسلمان، یا پارسی
اس دعوے کو نہیں تسلیم کر سکتا، یا اسی طرح کا دعویٰ وہ انجیل، قرآن اور
اوستا کے لیے نہیں کر سکتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ گیتا کی تعلیم تمام ان لوگوں
کے لیے بھی لازمی نہیں قرار دی جاسکتی جو خود کو ہندو کہلائیں۔ بہت سے
سکھ اور جین اپنے کو ہندو سمجھتے ہیں لیکن اپنے لڑکے اور لڑکیوں کے
لیے انھیں بھی گیتا کی تعلیم لازمی کرنے پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ فرقوں کے
اسکولوں کے لیے صورت مختلف ہو سکتی ہے۔
مثال کے طور پر میں ایک ویشنو اسکول کے لیے یہ بالکل مناسب
سمجھوں گا کہ گیتا مذہبی تعلیم کے جزو کے طور پر رکھی جائے۔ ہر پرائیویٹ
اسکول کو اپنا نصاب تعلیم مقرر کرنے کا حق ہوتا ہے۔ لیکن ایک قومی مدرسہ
کو خاص حدود کے اندر چلنا ہوتا ہے، جہاں مداخلت کا بہ طور حق سوال
نہیں، وہاں جبر بھی نہیں ہوتا۔ کوئی شخص بطور حق کسی پرائیویٹ
اسکول میں داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن قوم کے ہر فرد کو قومی مدرسہ میں
داخل ہونے کا حق ہے، لہٰذا ایک صورت میں جو داخلہ کی شرط ہو سکتی ہے

وہی دوسری صورت میں جبر خیال کی جا سکتی ہے، گیتا خارجی جبر سے کبھی عالمگیر نہ ہو گی۔ یہ صرف اسی وقت ہو سکتی ہے، جب اس کے عقیدت مند دوسروں پر اسے زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں گے بلکہ اس کی تعلیمات کو اپنی زندگی سے روشن کریں گے۔

(ینگ انڈیا۔ ۲۰ر جون ۱۹۲۹ء)

۳۔ تعلیم بالغان

بالغوں کی تعلیم

ہندوستان میں سماجی تعلیم یا عام لوگوں کی تعلیم کا مسئلہ بچوں کی تعلیم سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ بچوں کی تعلیم میں تو ہمارے سامنے مثالیں ہیں کہ کیسے دی جاتی ہے، لیکن عوام کی تعلیم کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اتنی رہنمائی بھی حاصل نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ہم اگر کچھ سیکھ سکتے ہیں تو باہر کے ملکوں سے سیکھ سکتے ہیں لیکن ہندوستان کے حالات بھی باہر کے ملکوں سے مختلف ہیں۔

ہمارے ہاں مختلف مذاہب ہونے کی وجہ سے آپس میں اختلاف رہتا ہے، اس لیے ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، تمام لوگوں کے لیے ایک سی تعلیم نہیں ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر لیجیے: ہم گائے کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کے سامنے وہی دلیلیں نہیں رکھ سکتے جو ہم ہندوؤں

کے سامنے رکھ سکتے ہیں، پھر بھی ہمیں ہندو اور مسلمان دونوں کو آپس کے جھگڑوں کی خرابیوں کے بارے میں تعلیم دینی ہے۔

سماجی اصلاح کا کام بہت بڑا اور بہت مشکل کام ہے۔ ہر جماعت کے اپنے اپنے مخصوص خیالات ہیں۔ ہر ایک میں چھوٹی چھوٹی ذاتیں ہیں۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ مسلمانوں میں ذاتیں نہیں ہیں۔ ہندوؤں کے اثر سے یہ برائی سب جماعتوں میں پیدا ہو گئی ہے۔

صحت، تندرستی اور سیاست صرف ایسے مضامین ہیں جن کی سب کو یکساں تعلیم دی جا سکتی ہے۔ میں سیاست میں معاشیات کی تعلیم کو بھی شامل سمجھتا ہوں۔

ہندوستان میں سیاست اور صحت کا بھی مذہب سے گہرا تعلق ہے، اگرچہ یہ بات کسی حد تک تعجب خیز معلوم ہو گی۔ مثلاً جو لوگ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں، وہ سب سیاست کو ایک نظر سے نہیں دیکھتے ہیں۔ اسی طرح بیماریوں کے علاج میں بھی مذہبی جذبات کا خیال رکھنا ضروری ہو جاتا ہے جو لوگ عوام کی تعلیم کے کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ بیماری کے بعد قوت لانے کے لئے گائے کے گوشت کی یخنی تجویز نہیں کر سکتے ہیں، نہ وہ مسلمانوں کو پینے کے پانی کے بارے میں حفظانِ صحت کے اصول برتنے کے لئے قائل کر سکتے ہیں۔

ایسے حالات میں کام کہاں سے شروع کیا جائے اور بالغوں کی تعلیم کے حدود کیا ہوں؟ سماجی نظامِ تعلیم جو کل قوم کی تعلیم کے مترادف ہے، اس کا مطلب صرف ایک مدرسہ شبینہ قائم کرنے اور تھکے ماندے مزدوروں کو حروف تہجی سکھا دینے سے نہیں ہے۔

پھر ایک استاد جو سماجی تعلیم میں لگا ہوا ہے، کیا کرے؟ سردست میں صرف دو صورتیں اس کے لئے تجویز کر سکتا ہوں: ایک تو یہ کہ وہ گاؤں میں جا کر مقیم ہو جائے، لوگوں سے ملے جلے اور ان کی خدمت کرے۔ جس حد تک وہ ان کی خدمت کرتا ہے، اس حد تک وہ ان کو تعلیم بھی دے رہا ہے۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ سیدھی سادی کتابیں جو لوگوں کی تعلیم کے لئے مفید ہوں، تیار کرائی جائیں اور کم سے کم قیمت پر فراہم کرنی چاہئیں اور لوگوں میں ان کو رائج کرنے کی ایک مہم چلائی جائے جو لوگ اس کام میں دلچسپی رکھتے ہوں، وہ ان کتابوں کو بے پڑھے لکھے لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور رفتہ رفتہ یہ ایک مستقل دستور بن جائے۔

اگر لوگوں کی تعلیم کا یہ تصور صحیح ہے، تو سب سے پہلے ہمیں جو بات کرنی ہے وہ صحیح استاد تیار کرنا ہے۔ لوگوں کو اب تک یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ سماجی تعلیم ہے کیا چیز؟ کانگریس نے اس سلسلہ میں البتہ کچھ کام کیا ہے لیکن وہ بھی بالواسطہ۔ لیکن اس نے یہ کام استاد کے نقطۂ نظر سے کبھی بھی نہیں کیا ہے جس کا مقصد سیرت کی تعمیر ہوتا ہے۔ سیاست داں تو خاص طور پر سیاست میں دلچسپی رکھتا ہے۔ لیکن سوراج کیسے حاصل کیا جائے؟ وہ سمجھتا ہے کہ سوراج کے حصول کے بعد عوام کی عام تعلیم از خود ہو جائے گی۔ برعکس اس کے استاد یہ سمجھتا ہے کہ آپ کو سوراج صرف اس وقت مل سکتا ہے جب آپ میں کیریکٹر ہو۔ ہمارے سامنے وقت صرف تعلیمی نقطۂ نظر سے ہے۔ سیاست داں ممکن ہے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے، اگرچہ کیریکٹر نہ بھی ہو لیکن ایک سماجی تعلیم کا استاد بغیر کیریکٹر کے مطمئن نہیں۔ اگر اس میں اس کی کمی ہے تو گویا وہ اس کھانے

کی طرح ہے جس میں نمک نہ ہو۔

اب اس سے زیادہ اس موضوع کے بارے میں لکھنے کی ضرورت نہیں۔

ایک سوال کے جواب میں کہ ہمارا بالغوں کی تعلیم سے کیا مقصد ہے، آیا پڑھنا لکھنا سکھانا یا بالغوں کو مفید معلومات دینا؟ گاندھی جی نے بتایا کہ:

جو لوگ بلوغ کی عمر کو پہنچ گئے ہیں اور کسی پیشہ میں لگ گئے ہیں ان کی سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ پڑھنا لکھنا جانیں۔ عوام میں کثرت سے لوگ اَن پڑھ ہیں، جو ہندوستان کے نامۂ اعمال کا سب سے بڑا گناہ ہے اور بڑے شرم کی بات ہے۔ اسے جلد سے جلد دور کرنا چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پڑھنا لکھنا سکھانے کی مہم صرف حرف شناسی سے شروع ہو کر وہیں ختم نہیں ہو جانی چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مفید علم بھی دیا جانا چاہیئے۔

اسی کے ساتھ ساتھ اور اسی سے ملتا ہوا ایک دوسرا مسئلہ بھی ہے، یعنی بالغوں کی اس تعلیم سے دلچسپی، وہ گاندھی جی نے اس سوال کے جواب میں کہ بالغوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ اسے کیسے قائم رکھیں؟— فرمایا کہ بالغوں کو اس سے بہت پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسے مختصر نصاب کے بعد ان کا سب بھول بھلا جانا بالکل قدرتی بات ہے۔ یہ صرف اس وقت دور ہو سکتا ہے، جب ان کی تعلیم کو ان کے روزمرہ کی ضرورتوں سے مربوط کیا جائے۔ صرف پڑھنا لکھنا جیسا خشک اور غیر دلچسپ مشغلہ نہ اب گاؤں والوں کی زندگی کا کوئی مستقل جزو ہے اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ انھیں ایسا علم دینا چاہیئے، جسے وہ اپنے روزمرہ کی زندگی میں کام میں لا سکیں۔ یہ ان پر ٹھونسنا نہیں چاہیئے۔ انھیں اس کا شوق بھی ہونا چاہیئے۔ آج جو کچھ انھیں مل رہا ہے، نہ وہ انھیں چاہیئے اور نہ اس کی

ان کے دلوں میں کوئی جگہ ہے۔ گاؤں والوں کو گاؤں کا حساب، گاؤں کا جغرافیہ، گاؤں کی تاریخ اور ایسا علم دو جو وہ روزمرہ استعمال کرسکیں۔ مثلاً خطوں کا پڑھنا اور لکھنا وغیرہ۔ وہ ایسے علم کو بڑے شوق سے حاصل کریں گے اور اسے آگے کی منزل تک لے جائیں گے۔ ان کے لیے ایسی کتابیں بیکار ہیں جو ان کے روزمرہ کے کاموں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں۔

گاندھی جی کے عام تعلیمی مسائل میں گاؤں کے لوگ سب سے پہلے آتے ہیں۔ بالغوں کی تعلیم میں بھی وہ گاؤں کے بالغوں کو خاص طور پر سامنے رکھتے ہیں اور ان کی اصلاح اور انھیں صحیح تعلیم دینا ان کا سب سے پہلا کام ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس تعلیم کو جو ہم گاؤں والوں کو دینی چاہتے ہیں، ہمیں اور وسیع معنوں میں لینا چاہیئے۔ یہ تعلیم پڑھنا لکھنا سکھا دینے سے کچھ اور زیادہ ہونی چاہیئے۔

بالغوں کی تعلیم کے سلسلہ میں انھیں گاؤں کے بالغوں میں صحت و صفائی کا احساس پیدا کرنا، سب سے ضروری معلوم ہوا، چنانچہ اس سلسلہ میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

وہ بہت سی باتوں سے ناواقف ہوتے ہیں جن کا جاننا ان کے روزمرہ کی زندگی میں بہت ضروری ہوتا ہے اور ان میں بہت سے احمقانہ توہمات بھی پائے جاتے ہیں۔

گاؤں کے حالات صحت کے اعتبار سے بہت افسوسناک ہوتے ہیں۔ صحت سے متعلق ضروری اور آسانی سے بہم پہنچنے والی معلومات کا نہ ہونا بھی ہمارے افلاس اور غریبی کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ اگر ہمارے گاؤں کے لوگوں کی صحت درست ہو جائے تو ہزاروں روپے بچ سکتے ہیں اور اس

حد تک ہمارے دیہات کے لوگوں کے معاشی حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک کسان جس کی تندرستی خراب ہے، وہ اتنا کام نہیں کر سکتا ہے جتنا ایک تندرست کسان کر سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں موت کی شرح پیدائش اس سے کہیں زیادہ ہے، جتنی ہونی چاہیئے۔ اس سے جو نقصان ہمارے ملک کو پہنچتا ہوگا، وہ کسی طرح نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں۔

کہتے ہیں کہ ہماری تندرستی کا سب سے اندوہناک سبب ہماری غریبی ہے اور اگر یہ غریبی دور ہو جائے تو ہماری صحت آپ سے آپ درست ہو سکتی ہے۔ ایک شخص جو حکومت کو برا بھلا کہنا چاہتا ہے یا ہماری مفیبتوں کی تمام ذمہ داری حکومت کے سر ڈالنا چاہتا ہے، وہ ایسا کہہ سکتا ہے لیکن اس بیان میں پوری سچائی نہیں ہے۔ میری رائے میں جو تجربہ پر مبنی ہے، ہماری غریبی کو ہماری صحت کی خرابی میں بہت کم دخل ہے اور اسباب بھی ہیں لیکن میں ان کی تفصیل میں اس وقت یہاں نہیں جانا چاہتا ہوں۔

ان مضامین کے لکھنے کی ایک بڑی غرض یہ ہے کہ کچھ ایسی تجویزیں سوچی جائیں جن سے وہ بیماریاں دور کی جا سکیں جو آسانی سے دور ہو سکتی ہیں۔ اور جو ان کی جہالت اور خراب عادتوں کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہو گئی ہیں۔

آیئے، ذرا ہم اس نقطۂ نظر سے اپنے گاؤں کی حالت کو دیکھیں اکثر گاؤں کوڑے خانہ معلوم ہوتے ہیں۔ لوگوں میں نہ کوئی شرم کا احساس ہے اور نہ صفائی کا۔ وہ بغیر اس کا خیال کیے ہوئے، جہاں ہوتا ہے، رفع حاجت کے لیے بیٹھ جاتے ہیں اور خود اپنے کھیتوں اور میدانوں کو خراب کرتے ہیں اور پھر یہ کہ اپنے پاخانہ یا پیشاب پر تھوڑی مٹی بھی نہیں ڈال

دیتے، گاؤں کی سڑکیں کبھی صاف نہیں ہوتیں اور جگہ جگہ ان میں مٹی پتھر اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ اس سے ان سڑکوں پر انسانوں اور جانوروں دونوں کا چلنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ جہاں تالاب ہوتے ہیں، وہاں تالابوں کے پانی کا صحیح استعمال نہیں رکھا جاتا۔ وہ اپنے برتن اور کپڑے سب اس میں دھوتے ہیں ۔ وہ انسانوں اور جانوروں کے نہلانے کے کام آتا ہے، بڑے اور چھوٹے سب اس میں آبدست لیتے ہیں، اور سب سے برا یہ ہے کہ یہی پانی پینے اور کھانا پکانے کے کام میں بھی آتا ہے

اسی طرح ان کے مکانات بھی بغیر کسی ترتیب و نظم کے بنے ہوتے ہیں۔ وہ ان کے بنانے میں یہ نہیں سوچتے کہ پڑوسیوں کو ان سے کہاں تک دشواری یا مصیبت پیش آئے گی اور نہ اس کا خیال رکھتے ہیں کہ ان میں کافی ہوا اور روشنی آ سکے گی۔

گاؤں والوں میں باہم تعاون اور اشتراک نہ ہونے کی وجہ سے وہ ایسی چیزیں بھی نہیں پیدا کرتے جو صحت کے لیے ضروری ہیں، وہ اپنے خالی اوقات کا بھی کوئی صحیح استعمال نہیں کرتے، اس لیے ان کی جسمانی اور دماغی نشوونما بھی درست نہیں ہوتی۔

صحت کے قوانین سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ گاؤں والے جب بیمار پڑتے ہیں تو ان بیماریوں کا صحیح علاج کرنے کے بجائے، جھاڑ پھونک کرنے والوں کے ہاتھ میں پڑ جاتے ہیں اور اس لیے یہ اور مصیبت مول لے لیتے ہیں۔ وہ خرچ کرنے کو روپیہ بھی خرچ کرتے ہیں، لیکن اپنی بیماریوں کی مدت اور شدت دونوں بڑھا دیتے ہیں۔

لہٰذا یہ تجویز ہے کہ تعلیم بالغان کے ذریعہ ان تمام باتوں کی جو ہمارے گاؤں والوں کی تباہی کا باعث ہیں، اصلاح اور درستی کریں تاکہ وہ ان مصیبتوں سے نجات پائیں۔

نوٹ: یہ سلسلۂ مضامین گجراتی کی ایک کتاب "گمدانی وہارے" (GAME-DANI VAHARE) سے لیے گئے ہیں۔

(۱۸ راگست ۱۹۲۹ء)

تعلیم بالغان کا مقصد

سوال:- ہماری تعلیم بالغان کی اسکیموں میں آیا تعلیم بالغان کا مقصد لکھنا پڑھنا سکھانا ہونا چاہیے یا مفید علم سکھانا؟ اور عورتوں کی تعلیم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:- جو لوگ سن رسیدہ ہیں اور جو کام میں لگے ہوئے ہیں، ان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ پڑھنا لکھنا جانیں۔ عام طور سے لوگ جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ہیں وہ ہندوستان کا سب سے بڑا گناہ ہے اور شرم کی بات ہے، اور اسے بہرصورت دور ہونا چاہیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ لکھنے پڑھنے کی مہم صرف حروف شناسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم نہ ہو جانی چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ مفید علم کی تعلیم بھی ہونی چاہیے۔ مگر میونسپل جماعتوں کو اس سے آگاہ رہنا چاہیے کہ وہ ایک وقت میں دو گھوڑوں پر سواری کر رہی ہیں، ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں نیچے

نہ آگریں۔

"جہاں تک عورتوں میں بے تعلیمی کا تعلق ہے، اس کا سبب سستی اور بے توجہی نہیں ہے جیسا کہ مردوں کے معاملے میں ہے، اس سے زیادہ اہم سبب ان کا کم درجہ ہونا ہے جو ان کے ساتھ روایۃً بے جا طور پر چلا آرہا ہے۔ مردوں نے انہیں ایک خانگی غلام اور اپنے لطف و خوشی کا ایک سامان بنا رکھا ہے، بجائے اس کے کہ وہ ان کو اپنا رفیق اور نصف اعلیٰ سمجھتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا سماج آدھا مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ عورت کو نسل انسانی کی ماں کہا گیا ہے، جو بہت صحیح ہے۔ ہم نے جو زیادتیاں اس کے ساتھ کی ہیں، اس کا دور کرنا ہم پر فرض ہے۔"

کپڈونج، ضلع کھیڈا کے ایک دوست نے سوال کیا کہ "آپ بعض مسائل پر مختلف وقتوں میں مختلف رائیں ظاہر کرتے رہے ہیں۔ ان سے بعض وقت ہمارے مخالفین ہمارے کاموں کی مخالفت کرنے میں ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

گاندھی جی نے جواب دیا کہ ان معاملات میں جو تضاد نظر آتا ہے وہ بالکل سطحی ہے اور ان کی آسانی سے توجیہ کی جا سکتی ہے۔ ایک سب سے آسان قاعدہ یہ ہے کہ بہ لحاظِ ترتیب سب سے آخر کا جو بیان ہو، اسے سب سابقہ بیانات پر مرجح سمجھنا چاہیے۔ لیکن میرا کوئی بیان خواہ آخر کا ہو یا اول کا، اگر تمہارے دل اور دماغ کو اپیل نہیں کرتا تو وہ تمہیں پابند نہیں کرتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرا نقطۂ نظر غلط تھا۔ لیکن ایک ایسا نقطۂ نظر تسلیم کرنا جسے تم نہ پسند کرتے ہو، اور نہ جذب کر سکتے ہو، صحیح ہوگا

(ہریجن، ۱۸؍فروری ۱۹۳۹ء)

بالغوں کا لکھنا پڑھنا

گاندھی مشن سوسائٹی، تیرووتا، نیلور نے بالغوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے کام کی اپنی ششماہی رپورٹ مجھے بھیجی ہے۔ اس کے لحاظ سے بالغوں کی مجموعی تعداد جس نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے، ۱۹۷ ہے۔ لیکن ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ جو ہے وہ یہ کہ جن بالغوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے وہ اسے قائم کیسے رکھیں۔ رپورٹ میں لکھا ہے کہ :-

"تقریباً آدھے اراکین جو پہلے سیشن میں شریک ہوئے تھے، وہ اپنی جماعت کے کارکن کے پاس آکر یہ کہتے ہیں کہ انھیں پھر دوبارہ وہ سب کچھ پڑھایا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ پھر ان پڑھ کے ان پڑھ ہو گئے۔ کارکن بے چارے سخت پریشان ہیں کہ وہ کیا کریں جس سے وہ پھر سب کچھ بھلا نہ دیں"

کارکنوں کو بالکل پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ ایسے مختصر نصابوں کے بعد سب کچھ بھول جانا لازم ہے۔ یہ اسی صورت میں روکا جا سکتا ہے جب ان کی تعلیم گاؤں والوں کی روزمرہ کی ضروریات سے مربوط کر دی جائے صرف لکھنے پڑھنے کا علم گاؤں والوں کی زندگی کا مستقل جزو نہ اب ہے اور نہ پہلے کبھی رہا ہے۔ انھیں ایسا علم دیا جانا چاہیئے جسے وہ روزانہ استعمال کر سکیں۔ یہ ان پر تھوپا جانا نہیں چاہیئے۔ بلکہ اس کی ان کو خواہش ہونی چاہیئے۔ آج جو کچھ ان کو ملتا ہے، اس کی نہ تو انھیں ضرورت ہے

اور نہ قدر۔ گاؤں والوں کو گاؤں کا حساب، گاؤں کا جغرافیہ، گاؤں کی تاریخ پڑھاؤ۔ اور ایسا علم دو جو وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال کریں یعنی خطوں کا لکھنا پڑھنا وغیرہ وہ ایسے علم کی قدر کریں گے اور پھر آگے بڑھیں گے۔ انہیں ایسی کتابوں سے کوئی فائدہ نہیں جو ان کو روز مرہ کے کام کی کوئی بات نہ بتائیں۔

(ہریجن، ۲۲ جون ۱۹۴۰ء)

صحیح تعلیمِ بالغان

پترخا جینتی کے سلسلے میں جو بہت سارے خطوط اور تار آئے ہیں، ان میں ایک ہندوستانی زبان کے خط نے جو اندور کی انجمن تعلیم بالغان نے بھیجا ہے، میری توجہ خاص طور پر اپنی طرف مبذول کی۔ اس خط کا خلاصہ یہ ہے کہ انجمن مذکور نے اس جینتی کے ہفتہ میں جینتی منانے کے سلسلہ میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اس نے ایک بہت ضروری اور مفید کام انجام دیا ہے یعنی یہ کہ چھوٹے بڑے، امیر غریب، سرکاری اور غیر سرکاری سب نے مل کر ایک ایسی گھاس کھیتوں سے کھود کر نکال ڈالی جو جانور اور انسان دونوں کے لئے سخت مضر تھی۔ اگر ایسا اشتراک عمل کسی بستی کی زندگی کا مستقل جزو بن جائے تو یہ چھوٹے اور بڑے دونوں کے لئے بہترین تعلیم کا کام ہوگا اور یہ اس بستی کی شکل بدل دے گا جس میں یہ انجام پائے گا۔

(ہریجن، ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۰ء)

گاؤں والوں کا ہوّا

واقعہ یہ ہے کہ گاؤں والے تمام امید کھو بیٹھے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر اجنبی آدمی کا ہاتھ ان کا گلا دبانے کے لیے بڑھتا ہے اور وہ ان کے پاس ان سے کچھ نہ کچھ اینٹھنے کے لیے آتا ہے۔ ان کی عقل اور محنت میں کوئی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے ان کی سوچنے کی طاقت بالکل بے کار ہو گئی ہے، وہ اپنے کام کے اوقات سے بھی پورا پورا فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں۔ کام کرنے والے کو ایسے گاؤں میں محبت اور امید کے ساتھ جانا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ جہاں مرد اور عورتیں بے سمجھے بوجھے کام کرتے ہوں اور نصف سال بیکار رہتے ہوں تو [illegible] تک کام کرتا رہے گا اور کام اور عقل میں رشتہ رکھے گا وہ ان گاؤں والوں کا اعتماد حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور ان کے ساتھ کام کر کے اپنی روزی بھی ایمانداری کے ساتھ اور اچھی طرح پیدا کر سکتا ہے۔

لیکن امیدوار کارکن یہ کہتا ہے کہ "میرے بچوں اور ان کی تعلیم کا کیا ہوگا؟" اگر میرے بچے جدید طرز کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو میں ان کی کوئی مفید رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اگر انھیں تندرست، توانا، ایماندار اور ذہین گاؤں والا بنانا کافی سمجھا جائے اور وہ اپنے والدین کے گھر میں رہ کر اپنی روزی کما سکیں تو ان کی عام تعلیم ان کے والدین کے گھر پر ہونی چاہیے اور جس وقت اپنے شعور کو پہنچ جائیں اور اپنے ہاتھ قاعدے کے ساتھ استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں، وہ جزوی طور پر اپنے خاندان کے کمانے والے رکن

بن جائیں گے۔

ایک اچھے گھر سے بہتر کوئی اسکول نہیں ہے اور ایماندار اچھے والدین کے برابر کوئی استاد نہیں ہے۔ جدید ہائی اسکولوں کی تعلیم گاؤں والوں پر ایک بار ہے۔ ان کے بچے اسے کبھی نہیں حاصل کر سکیں گے اور خدا کے فضل سے انھیں اس کا افسوس بھی نہ ہوگا اگر انھیں ایک اچھے گھر کی تربیت حاصل ہو گئی ہے۔ اگر گاؤں کا کارکن ایک اچھا مرد یا عورت نہیں ہے اور اچھا گھر نہیں چلا سکتا ہے تو اسے گاؤں کے ایک کارکن بننے کے شرف اور عزت حاصل کرنے کی آرزو نہ کرنی چاہیئے۔

(ہریجن۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۳۵ء)

۴- جنسی تعلیم

والدین کی ذمہ داری

(۱)

جو والدین اپنے بچوں کو اسکول یا آشرم میں بھیجتے ہیں ان پر کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اگر یہ ذمہ داریاں پوری نہ کی جائیں تو ان بچوں، اداروں، جہاں وہ بھیجے گئے ہیں اور خود والدین کا بہت بڑا نقصان ہوگا۔ سب سے پہلے انھیں اس ادارے کے قواعد سے واقفیت حاصل کرنی چاہیے جہاں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انھیں اپنے لڑکوں کی عادتوں اور ضرورتوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

مثلاً بچوں کو ایک ادارے سے ایک مرتبہ جب وہ اس میں داخل کر دیے جائیں، تو اپنی تعلیم پوری کرنے تک ہٹانا نہیں چاہیے۔ اکثر والدین اپنے لڑکوں کو اداروں سے اٹھا لیتے ہیں اگر انھیں کوئی اچھی ملازمت مل گئی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، اور نہ انھیں شادی اور دوسری اس قسم

تقریبوں میں شرکت کے لئے چھٹی لینی چاہیئے۔ جس طرح والدین اپنے بچوں کو اپنے بہت سے کاموں میں لیے لیے نہیں پھرتے ہیں، اسی طرح انھیں شادی وغیرہ میں کبھی نہیں لے جانا چاہئے۔ بچوں کو اپنی پوری توجہ اپنی تعلیم پر صرف کرنے دینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ بچوں کو اپنی تعلیم کے زمانے میں پورا برہمچاری رہنا سکھانا چاہیئے۔ اگر وہ شادیاں اور اس قسم کی دوسری دنیوی تقریبیں دیکھنے کا شوق بڑھانے لگے تو یہ ان کی اپنی تعلیم پر توجہ دینے اور برہمچریہ پر عمل کرنے میں بہت بڑی رکاوٹ ہوگی۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ انھیں اس قسم کی باتوں سے دور رکھا جائے۔ علاوہ اس کے اس زمانے میں جب شادی کا تصوّر بھی نہیں ہوسکتا ہے، یہ بہت بڑا ظلم ہے کہ ایک لڑکے کو جو اس سے دور رہنا چاہتا ہے، کسی شکل اور صورت میں کیوں نہ ہو، اس کا شوق دلایا جائے۔ موجودہ زمانہ میں جب لوگ کمزور ارادہ ہوتے ہیں، جب لوگوں میں آزمائشوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بہت کم ہوگئی ہے، اگر ہم کسی کو کوئی اخلاقی عہد پر عمل پیرا ہوتے ہوئے دیکھیں تو ہمیں اس کے ارادے کو اور مضبوط کرنے اور اسے پورا کرنے میں مدد دینی چاہیئے۔ اس کے برعکس اگر ہم خود اس عہد کے توڑنے میں مدد دیں تو ہم اپنی موجودہ کمزوری میں اور اضافہ کریں گے۔ یہاں جو کچھ شادی کے بارے میں کہا گیا ہے، وہ دوسری باتوں پر بھی صادق آئے گا۔

جو والدین اپنے بچوں کی اچھی اور صحیح تربیت کرنی چاہتے ہیں، انھیں کتنے ہی ایسے مواقع ملیں گے، جبکہ انھوں نے ان کی نشوونما میں مدد کرنے کی بجائے غالباً نادانستہ طور پر سخت رکاوٹیں پیدا

کی ہیں۔

('نوجیون'۔ ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۱ء)

(۲)

ایک صاحبہ جو جانتی ہیں کہ وہ کیا لکھ رہی ہیں، لکھتی ہیں :۔

"جب تک ہمارے لڑکے اپنی قوتوں کو محفوظ رکھنا نہیں سیکھیں گے، ہندوستان کو کبھی ایسے آدمی نہیں ملیں گے، جیسے کہ ملنے چاہئیں۔

میں تقریباً ۱۷ سال سے ہندوستان میں لڑکوں کے اسکولوں کی انچارج رہی ہوں۔ یہ بہت افسوس ناک بات ہے کہ کتنے ہی لڑکے — خواہ وہ ہندو ہوں، مسلمان ہوں یا عیسائی — جب وہ اسکول میں داخل ہوتے ہیں تو قوت، شوق اور امید سے بھرے ہوتے ہیں لیکن جب وہ اسکول چھوڑ کر جاتے ہیں تو جسمانی اعتبار سے تباہ ہو کر نکلتے ہیں۔ تقریباً سیکڑوں صورتوں میں میں نے دیکھا ہے کہ اس کا اصل سبب مشت زنی، اغلام یا اوائلِ عمر کی شادی ہے۔ میرے پاس اس وقت ۴۴ لڑکوں کے نام ہیں جو اغلام بازی کے مرتکب ہیں اور ان میں سے کوئی لڑکا بھی ۱۳ سال سے زیادہ کا نہیں ہے۔ استاد اور اتالیق ان باتوں سے انکار کریں گے کہ ایسا ہوتا ہے، لیکن اگر صحیح طریقہ اختیار کیا جائے تو ان

باتوں کا پتہ لگ سکتا ہے اور تقریباً لڑکے ہی اس کا اقرار کر لیں گے۔ ایک بڑی تعداد لڑکوں کی ایسی ملے گی جو یہ اقرار کرے گی کہ انھیں بڑے آدمیوں نے پکڑا ہے جن میں اکثر ان کے اپنے رشتہ دار رہے ہیں"

یہ کوئی خیالی تصویر نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اکثر اسکول کے استاد جانتے ہیں اور اسے چھپاتے ہیں۔ مجھے اس کا پہلے بھی علم تھا، سب سے پہلے مجھے دہلی کے ایک استاد نے بتایا جسے اب تقریباً آٹھ سال ہوتے ہیں۔ لیکن میں اب تک خاموش رہا ہوں اور صرف افراد سے اس کے علاج کے بارے میں گفتگو کرتا رہا ہوں۔ یہ برائی کچھ ہندوستان تک محدود نہیں ہے۔ لیکن ہندوستان میں اس کا ناگوار اثر اس وجہ سے اور زیادہ ہے کہ یہاں بچپنے کی شادی کی لعنت بھی ہے۔ اس مشکل اور نازک مسئلہ پر علانیہ بحث اس لئے ضروری ہے کہ آپ اچھے اچھے اخباروں میں جنسی معاملات کا تذکرہ نہایت آزادی کے ساتھ دیکھتے ہوں گے جو اب سے چند سال قبل ممکن نہ تھا۔

آج کل جنسی فعل کو فطری، ضروری، اخلاقی، دماغی اور جسمانی صحت کے لئے مفید سمجھنے کا جو عام چلن ہو گیا ہے، اس سے یہ برائی اور بڑھ گئی ہے۔ مہذب لوگوں نے انسداد تولید کے آزادانہ استعمال کی جو وکالت شروع کر دی ہے اس سے ایک ایسا ماحول پیدا ہو گیا ہے جس سے جنسی میلانات کی نشو و نما اور زیادہ ہو گئی ہے۔

نوجوانوں کے نازک اور اثر پذیر دماغ اس سے فوری طور پر

یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ ان کی ناجائز اور ہتا؛ کن خواہشیں حق بہ جانب ہیں اور والدین اور استاد اس مہلک بُرائی پر افسوس ناک بلکہ مجرمانہ غفلت اور تحمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر ہمارا سماجی ماحول بالکل صاف نہ کیا گیا تو میری رائے میں اس بُرائی کا انسداد نا ممکن ہے۔ ایک ایسا ماحول جو جنسی اثرات سے متاثر ہو اس ملک کے اسکول جانے والے بچوں پر غیر شعوری اور گہرا اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شہری زندگی کا ماحول، ادب، ڈراما، سینما، گھر والوں کی ملاقات اور بازدید، مختلف سماجی تقریبات سب ایک ہی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور وہ جنسی میلان کی ترغیب ہے، چھوٹے بچوں کے لئے یہ نا ممکن ہے جن میں اس کم بخت جنس کا شعور پیدا ہو چکا ہے کہ وہ ان اثرات کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کے جواب میں صرف تسکین دینے والی بات کافی نہیں ہے۔ اصلاح بڑوں سے شروع ہونی چاہیئے، اگر وہ نوجوان نسل کے ساتھ اپنی ذمہ داری پوری کرنا چاہتے ہیں۔

ینگ انڈیا — ۱۲ ستمبر ۱۹۲۶ء

(۳)

ایک استاد صاحب لکھتے ہیں:۔

"آپ نے ان برائیوں کے بارے میں لکھا ہے جو ہمارے نوجوانوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ میں بہر حال سمجھتا ہوں کہ اس کے ذمہ دار خود والدین ہیں۔ اگر بڑے لڑکے اور لڑکیوں کے والدین برابر بچے پیدا کرتے جائیں، تو اور

کیا امید ہو سکتی ہے؟ کیا یہ صحیح نہ ہوگا کہ ایسی شادی کو زنا کاری کہا جائے؟ میں اس کی ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔ ایک لڑکا اپنی ماں کے انتقال کے بعد اپنے باپ کے ساتھ سویا کرتا تھا۔ باپ نے دوبارہ شادی کی اور ایک علیحدہ کمرے میں سونے لگا، یعنی دروازہ بند کر کے۔ اس سے لڑکے کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ باپ نے اس کے ساتھ سونا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ وہ دل میں سوچنے لگا کہ جب اس کی ماں زندہ تھی، تو ہم تینوں کے تینوں ایک ساتھ سوتے تھے، پھر اب وہ کیوں اس نئی ماں کے آنے پر مجھے اپنے ساتھ سونے نہیں دیتے ہیں؟ لڑکے کا تجسس بڑھتا رہا۔ اس نے سوچا کہ میں دروازہ کی دراز سے کیوں نہ دیکھوں؟ اس کی حیرت اور استعجاب کی اس کیفیت کا اندازہ کیجیے، جب اس نے دروازے سے جھانک کر اندر کا منظر دیکھا۔

"اس قسم کی باتیں ہمارے سماج میں تقریباً روزانہ ہی ہوتی ہیں۔ جو قصہ میں نے اوپر بیان کیا ہے، وہ میرے تخیل کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ واقعہ ہے جو مجھ سے تیرہ یا چودہ سال کے لڑکے نے بیان کیا تھا۔ یہ لڑکے اور لڑکیاں جو اپنی ابتدائی عمر میں اس طرح اپنی تباہی کے راستے پر لگا دی جاتی ہیں، کس طرح سوراج کے لیے لڑیں گی؟ والدین، استاد، دارالاقامہ کے نگراں یا

اسکاوٹ ماسٹر صاحبان کا یہ فرض ہے کہ وہ بچوں کو ایسے افسوسناک تجربوں سے محفوظ رکھیں۔ نوعمر بچوں کے لیے لفظ برہمچریہ کے معنی سمجھنا مشکل ہے۔ بجائے اس کے کہ لڑکوں کی ایک تعداد کو اکٹھا کر کے اور انھیں برہمچریہ پر لیکچر دیا جائے، یہ زیادہ مناسب ہوگا، اگر استاد ایک ایک کر کے انھیں اپنے اعتماد میں لیں، ان سے میل جول پیدا کریں اور ابتدائے عمر سے ان میں اخلاق کی محبت اور اس کا احترام پیدا کریں۔

"اب رہا بڑی عمر کے مرد اور عورتوں کا سوال، ایک سوسائٹی یا جماعت جو ایسے لوگوں کو لینے سے خارج کر دینے کے لئے تیار رہتی ہے جو کسی دوسری ذات کی عورت کے ہاتھ کا کھانا کھا لیتے ہیں، ایسے لوگوں کو اپنے سے کیوں نہیں خارج کر دیتی جو اپنی بیوی کے علاوہ دوسری عورتوں کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھنے کے جرم میں پلائے گئے ہوں؛ ایک جماعت جو ایسے لوگوں کو سزا دیتی ہے جو سیاسی جلسوں میں اچھوتوں کے ساتھ بیٹھتے ہیں، زنا کرنے والوں کو کیوں نہیں سزا دیتی؟ ایسی بے اصولیوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی جماعت ایسے تزکیۂ نفس پر اصرار کرے تو اس کی تعداد اور کم ہو جائے گی اور وہ کمزور پڑ جائے گی، جو بات وہ بھول جاتے ہیں، یہ ہے کہ ایک مضبوط روح مضبوط جسم ہی میں رہ سکتی ہے۔ بہت سی جماعتوں کے بڑی عمر کے لوگ بھی شراب نوشی اور زناکاری

جیسی برائیوں کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ دوسروں میں ان کی کوئی اہمیت نہیں دیتے، ایسا نہ ہو کہ خود ان پر یہ الزام آپڑے۔ جہاں تک دوسروں کے اخراج کا سوال ہے، وہ اس کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں! ہماری یہ سوسائٹی کب اپنی حالت کو درست کرے گی اور ترقی کے راستہ پر لگے گی؟ ایک ملک جو سیاسی ترقی کرنا چاہتا ہے، اسے پہلے سماجی ترقی حاصل کرنی چاہیئے۔ بغیر سماجی ترقی کے سیاسی ترقی ایسی ہی ہے جیسے بغیر بنیاد کے مکان تعمیر کیا جائے ــــــ"

یہ ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ لکھنے والے نے جو کچھ کہا ہے، اس میں بہت حقیقت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب ایک شخص کے بچے بہت بڑے ہو جائیں، تو پھر "بچے" پیدا کرنا کچھ بہت مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا بڑے بچوں کے دماغوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ لیکن اگر اس کے لیے ضبطِ نفس ممکن نہیں ہے، تو باپ کو چاہیئے کہ بڑے لڑکوں کے رہنے سہنے کا علیحدہ انتظام رکھے، یا وہ خود ایک علیحدہ کمرے میں رہے تاکہ بچے نہ کچھ دیکھ سکیں اور نہ سن سکیں۔ اس سے کم سے کم تہذیب کا تقاضا تو پورا ہو گا۔ اگرچہ بچپن کا زمانہ معصومیت میں گذرنا چاہیئے، والدین جو عیش کے شائق ہوتے ہیں وہ اپنے بچوں کے دماغوں کو خراب کر دیتے ہیں، 'دان پرستا آشرم' کا طریقہ بچوں میں اخلاق کا احساس پیدا کرنے، انھیں آزادی کا طالب بنانے اور اعتمادِ نفس پیدا کرنے کا اچھا طریقہ ہے۔

خط کے مصنف نے استادوں کو جو مشورے دیئے ہیں، وہ نظری

اعتبار سے بالکل صحیح ہیں۔ لیکن اگر جماعت میں چالیس سے پچاس تک لڑکے ہوتے ہیں اور اگر استاد کا تعلق لڑکوں سے صرف پڑھائی تک محدود ہوتا ہے، تو پھر کوئی استاد اگر چاہے بھی، لڑکوں سے روحانی تعلق کیسے پیدا کرسکتا ہے؟ علاوہ اس کے، اگر مختلف استاد مختلف مضامین پڑھاتے ہیں تو ان میں سے کس کے ذمّے ایک اچھے اخلاق کی تعلیم کی ذمہ داری ہوگی؟ آخری بات یہ کہ کتنے استاد واقعی اس کام کے کرنے، طلبا کو اخلاق کے راستے پر لے چلنے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں؟ اسی سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح تعلیم کے تمام نظام کو مرتب کرنا چاہیئے۔ چونکہ یہ ایک طویل مضمون ہے، ہم اس پر یہاں بحث نہیں کرسکتے ہیں۔

ہمارے سماج میں لوگ ایک دوسرے کے پیچھے اس طرح چلتے ہیں جیسے بھیڑوں کا گلہ، اور اسی کو ترقی سمجھتے ہیں۔ لیکن ان مایوس کن حالات کے اندر بھی ہمارے لیے انفرادی طور پر یہ آسان ہے کہ صحیح راستے پر چلیں جو لوگ یہ جانتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ اپنے دائرے کے اندر اخلاقی ماحول پیدا کریں اور اسے پھیلائیں۔ سب سے پہلے انھیں اپنی اصلاح کرنی چاہیئے جب ہم دوسروں کی برائیاں دیکھتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم برائی سے بالکل پاک و صاف ہیں۔ لیکن اگر ہم اپنی طرف توجہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم برائیوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنے متعلق فیصلہ کریں، قبل اس کے کہ ہم دوسروں پر نظر اٹھائیں علاوہ اس کے، اس سے دوسروں کے لیے بھی راہ کھلتی ہے کہ وہ اپنی اصلاح کریں۔ یہ اس ہندی مثل کے منجملہ اور معنوں کے ایک معنی ہیں:-

"اگر تم اچھے ہو تو دنیا آپ سے آپ اچھی ہو جائے گی۔"

تلسی داس نے کہیں سادھو کی تشبیہ 'پارس منی' سے دی ہے۔ انھوں نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ ہم سب کو اچھا بننا چاہیئے۔ اچھائی کوئی ایسی چیز نہیں جو اوپر سے خدا نے ہم میں جو غیر معمولی انسان ہے، اس کے لیے اتاری ہو، یہ ہم میں سے ہر ایک کا فرضِ منصبی ہے۔ یہی ایک انسان کی زندگی کے حقیقی معنی ہیں۔

(نوجیون' — ۲۶ ستمبر ۱۹۲۶ء)

جنسی بے عنوانیاں

(۱)

چند سال ہوئے حکومت بہار نے اپنے محکمۂ تعلیم کے ماتحت اسکولوں کے اندر غیر فطری جنسی بُرائیوں پر ایک تحقیقات کرائی تھی اور تحقیقاتی کمیٹی نے یہ معلوم کیا تھا کہ استادوں میں بھی یہ بُرائیاں پائی جاتی ہیں جو اپنی غیر فطری خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنے لڑکوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ڈائرکٹر تعلیمات نے ایک سرکلر اس مضمون کا گشت کرایا تھا کہ اگر کسی استاد میں یہ بُرائی پائی گئی تو اس کے خلاف محکمہ کی طرف سے سخت کارروائی کی جائے گی۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس سرکلر کا کیا نتیجہ نکلا۔

اور صوبوں سے بھی میرے پاس ایسے مواد آئے ہیں جن میں مجھے اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ تقریباً تمام ہندوستان

میں خواہ پبلک اسکول ہوں یا پرائیویٹ، یکساں پھیل رہا ہے۔ لڑکوں کی طرف سے ذاتی خطوط بھی موصول ہوئے ہیں جن سے اس اطلاع کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ بُرائی اگرچہ غیر فطری ہے، پھر بھی یہ بہت قدیم زمانہ سے ہم میں چلی آرہی ہے۔ مخفی برائیوں کا علاج بہت مشکل ہوتا ہے، اور یہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، اگر اس کا تعلق لڑکوں کے سرپرستوں سے ہو جو کہ اُستاد ہوتے ہیں۔ اگر نمک اپنا مزہ کھو بیٹھے، تو پھر اسے نمکین کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ میری رائے میں محکمہ کی طرف سے کارروائی، اگر جرم ثابت ہو جائے، تو ضروری ہے، پھر بھی اس سے بُرائی کی اصلاح مشکل ہے۔ لوگوں کی رائے عامہ بیدار کرنے سے اس برائی کا علاج ہو سکتا ہے۔ لیکن اکثر معاملات میں اس ملک میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے موثر رائے عامہ کہہ سکیں۔ بے بسی کا جو احساس ہماری سیاسی زندگی میں ہے، وہ ہمارے تمام شعبہ ہائے زندگی میں پایا جاتا ہے، اس لئے ہم اکثر بُرائیوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے جو ہماری نظروں کے سامنے ہوتی رہتی ہیں۔

ایک ایسا نظام تعلیم جو تمام تر علمی تحصیل پر زور دیتا ہے، وہ نہ صرف اس بیماری کے علاج کے لئے نامناسب ہے بلکہ واقعتاً اس میں اضافہ کا موجب ہوتا ہے۔ جو لڑکے پہلے صاف تھے، پبلک اسکولوں میں گئے، وہ اپنے اسکول کی تعلیم ختم ہونے پر ناصاف، نرمخے اور نامرد ہو کر نکلے۔

بہار کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ لڑکوں کے دماغوں میں مذہب

کا احترام پیدا کیا جائے، لیکن بلی کے گلے میں ہار کون ڈالے۔ استاد ہی مذہب کا احترام پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن خود ان میں مذہب کا احترام نہیں۔ لہذا اصل سوال مناسب استادوں کے انتخاب کا ہے۔ لیکن اچھے استادوں کے انتخاب کا مطلب یا تو بڑی تنخواہیں دینا ہے یا معلمی کو ایک پیشہ نہیں بلکہ زندگی بھر کا ایک مقدس فریضہ سمجھ کر اختیار کرنا ہے۔ یہ آج بھی رومن کیتھولک فرقہ میں پایا جاتا ہے۔ پہلی بات ظاہر ہے، ہمارے جیسے غریب ملک کے لیے ناممکن ہے۔ دوسرا راستہ مجھے صرف کھلا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر بہ صورت ایسے نظام حکومت میں جس میں ہر چیز کی قیمت ہے اور جو دنیا میں سب سے گراں قیمت حکومت ہے، ہمارے لیے ممکن نہیں۔

اس برائی کا علاج اس وجہ سے اور مشکل ہو جاتا ہے کہ والدین عام طور پر اپنے بچوں کے اخلاق کے معاملہ میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ ان کا فرض پورا ہو جاتا ہے جب وہ انھیں اسکول بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح یہ صورت حال ہمارے لیے اس درجہ تاریک نظر آتی ہے لیکن اس بات سے کچھ امید بندھتی ہے کہ تمام برائیوں کا ایک علاج ہے اور وہ عام تزکیہ ہے۔ بجائے اس کے کہ اس برائی کی زیادتی سے ہم گھبرا جائیں، ہم میں سے ہر ایک کو جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے قریبی ماحول کو لینا چاہیے اور سب سے پہلے اپنی ذات کو اپنی کوششوں کا محور بنانا چاہیے۔ ہم کو اس خیال سے خوش نہ ہونا چاہیے کہ ہم دوسروں کی طرح نہیں ہیں۔ غیر فطری برائی کوئی الگ چیز نہیں ہوتی۔ یہ اسی برائی کی ایک کھلی علامت ہے۔ اگر ہم میں گندگی ہے، اگر ہم جنسی اعتبار سے گرے ہوئے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہیے قبل اس کے کہ اپنے پڑوسیوں کی شروع کریں، ہم دوسروں

پر بہت زیادہ نکتہ چینی کرتے ہیں اور خود کو بہت محفوظ سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ یہ ہوتا ہے نہ وہ۔ جو لوگ اس بات کو صحیح سمجھتے ہیں، انھیں اس بُرائی سے نکلنا چاہیے اور پھر وہ دیکھیں گے کہ ترقی اگرچہ کبھی آسان نہیں ہوتی ہے، بہت حد تک ممکن ہو جاتی ہے۔

(ینگ انڈیا، ۲۶ جون ۱۹۲۷ء)

(۲)

سناتن دھرم کالج، لاہور کے پرنسپل صاحب لکھتے ہیں:-

"براہِ کرم یہ اخبار کے تراشے، اطلاعات وغیرہ جو میں ہمراہ منسلک کر رہا ہوں، ملاحظہ فرمائیے جن کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ "انجمن فلاح نوجوانان" پنجاب میں بہت مفید کام کر رہی ہے۔ اس نے علمی اور انتظامی حلقوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی ہے اور لڑکوں کے روشن خیال سرپرستوں میں گہری دل چسپی پیدا کر دی ہے۔ بہار کے پنڈت سیتا رام داس اس تحریک کے بڑے سرگرم روحِ رواں ہیں جنھوں نے بہت سے ممتاز اشخاص کو اپنے سرپرستوں میں شامل کر لیا ہے۔

نوجوان لڑکوں کے اغوا کی مصیبت بلاشبہ پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں ہندوستان کے کسی اور حصّہ کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔

کیا میں آپ سے درخواست کر سکتا ہوں کہ دھرم کی

یا کسی اور اخبار میں آپ ایک نوٹ یا خط کے ذریعہ ملک کو اس مرض کی طرف توجہ دلائیں؟۔

یوتھ لیگ کے سکریٹری نے مجھے بہت عرصہ پہلے اس نازک مسئلہ کے بارے میں لکھا تھا۔ مراسلہ ملنے کے بعد میں نے ڈاکٹر گوپی چند سے خط و کتابت شروع کی جنہوں نے ان تمام باتوں کی تصدیق کی جو لیگ کے سکریٹری نے اپنے خط میں لکھا تھا۔ لیکن میں نے اس مسئلہ پر اس پرچہ یا اور کسی اخبار میں بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے اس شکایت کا علم تھا لیکن مجھے اس کا یقین نہیں تھا کہ اخبارات میں اس پر بحث چھیڑنا کچھ زیادہ مفید ہوگا۔ اور نہ مجھے اب کچھ بہت یقین ہے۔ لیکن میں پرنسپل صاحب کالج کی اپیل کو ٹال بھی نہیں سکتا۔

یہ برائی کوئی نئی نہیں ہے۔ یہ بہت عام طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ چونکہ اسے لازماً مخفی رکھا جاتا ہے، اس لیے اس کی گرفت آسانی سے ممکن نہیں یہ آرام طلب زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ پرنسپل صاحب نے جس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اس میں استاد خود اپنے طلبا کے خراب کرنے والوں میں ہیں، جب نمک خود اپنا مزہ کھو دے تو پھر وہ کیسے نمکین بنایا جاسکتا ہے۔؟

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے نہ کوئی کمیشن اور نہ کوئی حکومت کامیابی سے حل کر سکتی ہے۔ یہ اخلاقی مصلح کا کام ہے۔ والدین کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلانا چاہیئے، طلبا کو ایک صاف زندگی سے قریب لانا چاہیئے۔ یہ خیال کہ اخلاقیات اور صاف زندگی ایک صحیح تعلیم کی اصل بنیاد ہیں، کثرت سے پھیلانا چاہیئے۔ تعلیمی اداروں کے سرپرستوں کو استادوں کے

انتخاب کے معاملہ میں بہت محتاط رہنا چاہیئے اور جب وہ انتخاب کر لیے جائیں تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ اس معیار پر برابر قایم رہتے ہیں۔ یہ چند طریقے ہیں جن سے یہ خطرناک برائی اگر بالکل ختم نہیں تو کم سے کم قابو میں رکھی جا سکتی ہے۔

(ہریجن ۔ ۲۷ اپریل ۱۹۳۵ء)

(۴)

اگر اساتذہ اپنی طالبات سے مخفی تعلقات رکھتے ہیں اور بعد میں جب وہ تعلقات مخفی نہیں رہ سکتے ہیں تو انہیں قانونی شکل دینے کے لیے شادی کر لیتے ہیں، اس سے ان تعلقات کا جائز ہونا نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہ میرا پختہ یقین ہے کہ جس طرح ایک بھائی بہن میاں بیوی کے تعلقات نہیں رکھ سکتے ہیں، اسی طرح ایک استاد اور اس کی طالبہ میں بھی میاں بیوی کے تعلقات نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک سنہری قاعدہ ہے اور اس کی عدم تعمیل کا نتیجہ ادارہ کی تباہی ہے۔ یہ قاعدہ لڑکیوں کو اپنے استادوں سے محفوظ رکھنے کی ایک بڑی ضمانت ہے۔ استاد کا ایک بڑا مرتبہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کا اپنے لڑکے اور لڑکیوں پر بہت اثر پڑتا ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے، اسے وہ ایک حقیقت زمی سمجھتے ہیں۔ وہ کبھی اس سے ناجائز منصوبوں کا شبہ بھی نہیں کر سکتے ہیں اور اس لیے اسے ان ضروری قاعدوں کا خیال رکھنا چاہیئے جہاں روح کی حفاظت کا خیال جسم سے علیحدہ رکھا جاتا ہے وہاں

ایسے تعلقات (جیسے استاد اور طالبہ کے درمیان شادی) قطعاً ناجائز ہیں اور انھیں ایسا ہی سمجھنا چاہیئے۔

('ہریجن بندھو' ۲۹ر نومبر ۱۹۳۶ء)

جنسی تعلیم

سری جت مگن بھائی دیسائی نے جنھیں گجرات ودیا پیٹھ سے ایم اے کے مساوی ڈگری ملا ہے، مجھے گجراتی میں ایک خط لکھا ہے، جس کا خلاصہ میں ذیل میں درج کر رہا ہوں:۔

"کیا میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرا سکتا ہوں کہ آپ 'ہریجن بندھو' کے کالموں میں ایک ایسے مسئلے کے بارے میں بحث چھیڑیں جسے آپ نے اب تک چھیڑا نہیں ہے۔ میری مراد نوجوانوں کو جنسی تعلیم دینے کے مسئلے سے ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، سری جت ... گجرات میں اس کے ایک بہت بڑے وکیل سمجھے جاتے ہیں۔ ذاتی طور پر مجھے ہمیشہ اس میں شبہ رہا ہے لیکن اس کے علاوہ مجھے یقین نہیں ہے کہ یہ حضرات اس کام کے لیے موزوں بھی ہیں۔

نتائج بہرحال کچھ ہمت افزا نہیں ہیں۔ ان صاحبا

کے خیال کے مطابق تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنسی تعلیم کا نہ ہونا ہمارے سارے تعلیمی مسئلوں اور سماجی برائیوں کی جڑ ہے۔ وہ اور ان کے خیال جیسے سوچنے والے جھٹ جدید نفسیات کے اس نظریہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ انسان کے اندر ایک قسم کا سویا ہوا جنسی جذبہ ہے جو ہی اس کے تمام افعال کا اصل محرک ہے، اور بغیر مزید سوچے سمجھے انھوں نے اس کو سر پر بٹھانا اور خدا بنانا شروع کر دیا......! آکسفورڈ کے اس شیطان کے بچہ نے ایک دن مجھ سے کہا کہ تم اس جنس کے ابلیس کے بارے میں کیا جانتے ہو جو ہر ایک سینہ میں ہوتا ہے؟" اس کے اس جملہ سے اس کے اخلاقی احساس کی مرقی کا پتہ چلتا ہے نہ کہ زندگی کا۔ اس جنسی تعلیم کے نام سے نادانستہ طور پر آج جو خرابیاں ہو رہی ہیں، اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس مضمون پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں، ان کے مسلسل اڈیشن نکل رہے ہیں اور ہر اڈیشن کی تعداد ہزاروں سے اوپر ہوتی ہے۔ بعض ہفتہ وار صرف اسی پر چل رہے ہیں اور وہ اس کی اشاعت سے خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ بازاروں میں ان کی بڑی بکری ہے۔ اس سے جو ذہنی اور اخلاقی نقصان ہو رہے ہوں گے ان کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سماج کو وہی ملتا ہے جو وہ چاہتا ہے اور جس کا وہ مستحق ہے لیکن ایک مصلح کے لئے یہ کوئی تسکین کا باعث نہیں جس کا کام

اس شہوت انگیز لٹریچر کی اشاعت سے حد درجہ مشکل ہو جاتا ہے جو جنسی سائنس کے نام پر شائع ہو رہا ہے۔"

"اس لئے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ اس مسئلہ پر عام بحث کیجئے۔ کیا جنسی تعلیم ہمارے بچوں کے تعلیمی نصاب میں شامل ہونی چاہیئے؟ — کون اسے دے؟ اس کام کے لئے ضروری صفات کیا ہونی چاہئیں؟ کیا اس مضمون کی تعلیم جغرافیہ یا ارتھمیٹک کی طرح ہر ایک کو دی جائے؟ یا اس کی کوئی قید ہونی چاہیئے؟ اور اگر ہونی چاہیئے تو کون حد مقرر کرے اور کہاں پر؟ پھر آیا جنسی تعلیم کا مقصد اس مخفی جذبہ جنس کا مقابلہ کرنا ہے یا اسے محض فطرت کا ایک ناگزیر واقعہ سمجھنا چاہیئے جسے ہمیں ماننا اور تسلیم کرنا چاہیئے۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو اس سلسلہ میں میں ایک خاص درخواست بھی کروں۔ علاوہ اس کے کہ آپ انگریزی میں اس مضمون پر کچھ بھی لکھیں، کیا آپ گجراتی پڑھنے والوں کے لئے گجراتی میں کچھ نہ لکھیں گے؟ آپ جانتے ہیں کہ یہ آپ سے ہماری بہت پرانی اور مستقل شکایت ہے کہ آپ نے ہمیں اپنے اصل خیالات گجراتی میں دینے بند کر دیئے ہیں۔ میں اس کے ساتھ اس موضوع پر ایل پی جیکس کے ایک مضمون کے کچھ اقتباسات بھیج رہا ہوں اس سے ان کی نظر اور تجربہ کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔"

جیسی مسئلہ آج کل گجرات میں نہایت تیزی سے بڑھ رہا ہے، جیسا کہ بقیہ ہندوستان میں حال ہے اور جو اس سے زیادہ بُرا ہے وہ یہ کہ جو لوگ اس اثر کے ماتحت آئے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی قابلِ تعریف بات ہے۔ جب کوئی غلام اپنی ہتھکڑیوں پر فخر کرنے لگے اور انھیں قیمتی زیوروں کی طرح اپنے سینے سے لگائے تو پھر یہ سمجھو کہ اس کے آقا کی کامیابی مکمل ہو گئی۔ لیکن عشق کے دیوتا کی یہ کامیابی، اگرچہ کتنی ہی قابلِ فخر کیوں نہ ہو، مجھے یقین ہے کہ بہت عارضی اور کم مایہ ہوگی اور بچھو کے زہر کی طرح ختم ہو کر رہے گی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس عرصہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ اس کی شکست کے یقین سے ہم کو بے جا اطمینان نہ ہونا چاہیے۔ خواہشِ نفسانی کی کامیابی ایک مرد یا عورت کے وجود کی سب سے بڑی کوشش ہوتی ہے۔ بغیر اس خواہشِ نفسانی پر کامیابی کے انسان اپنے اوپر کبھی حکومت نہیں کر سکتا ہے، اور اپنے اوپر حکومت کے بغیر سوراج یا رام راج نہیں مل سکتا۔ اپنے اوپر حکومت کے بغیر دوسرے لوگوں پر حکومت کا خیال ایسا ہی دھوکہ اور مایوس کن ثابت ہوگا جیسے رنگ ہوا آم جو بظاہر کتنا ہی خوبصورت معلوم ہو، لیکن اندر سے وہ خالی اور کھوکھلا ہوگا۔ کوئی کارکن جس نے اپنے نفس پر قابو نہیں پایا ہے، وہ کبھی ہریجنوں کی خدمت، فرقہ وارانہ اتحاد، کھادی، گئو رکشا، گاؤں کی تعمیر کا کام نہیں کر سکتا ہے۔ ایسے بڑے بڑے کام جیسے کہ یہ ہیں، صرف ذہنی صلاحیتوں سے انجام نہیں پا سکتے ہیں ان کے لئے روحانی کوشش یا روحانی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ روحانی قوت صرف خدا کی عنایت سے حاصل ہوتی ہے اور خدا

کی عنایت اس شخص پر نازل نہیں ہوتی جو نفس کا غلام ہو۔

پھر ہمارے نظام تعلیم میں جنسی علم کی تعلیم کی کیا جگہ ہے، یا اس کی کوئی جگہ ہے بھی؟ جنسی علم کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو جنسی میلان کو قابو میں رکھنے یا اس پر غلبہ پانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے، دوسری وہ جو اسے ابھارنے اور تشفی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی تعلیم بچے کی تعلیم کا ایسا ہی ضروری جزو ہے، جیسا دوسرا مضر اور خطرناک ہے اور اس کے لیے اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ تمام بڑے بڑے مذہبوں نے جنس کو انسان کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا ہے۔ غصہ یا نفرت کا اس کے بعد نمبر آتا ہے۔ گیتا کی تعلیم کے مطابق دوسرا جذبہ اس کا ایک نتیجہ ہے۔ گیتا میں بے شک "کاما" (جنس) کا لفظ خواہش کے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن اپنے محدود معنی میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے جو یہاں لیا گیا ہے۔

لیکن اس سوال کا جواب اب بھی باقی ہے کہ آیا چھوٹے بچوں کو اعضائے تناسل کے استعمال اور ان کاموں کے متعلق علم دینا مناسب بھی ہے۔ میرے خیال میں کسی حد تک اس کا علم دینا ضروری ہے۔ آج کل انھیں اس کا علم کسی نہ کسی طرح ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے غلط استعمال میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہم اس کی طرف سے آنکھ بند کر کے جنسی جذبہ کو نہ تو صحیح طور پر قابو میں رکھ سکتے ہیں اور نہ اس پر غلبہ پا سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے میں کم عمر لڑکے اور لڑکیوں کو ان کے اپنے اعضائے تناسل کی اہمیت اور ان کے صحیح استعمال سکھانے کے پورے طور پر حق میں ہوں اور میں نے اپنے طور

پر دونوں جنس کے بچوں کو جن کی تربیت میرے ذمہ تھی یہ علم دینے کی کوشش کی ہے۔

لیکن جس قسم کی جنسی تعلیم کا میں قائل ہوں، اس کا مقصد جنسی جذبہ کی تسخیر اور تصعید ہے۔ اس قسم کی تعلیم سے بچہ کے اندر انسان اور حیوان کا فرق از خود سمجھ میں آجائے گا اور انھیں اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ یہ انسان کی خاص فضیلت ہے کہ اسے دل اور دماغ ــــ دونوں کی قوتیں عطا کی گئی ہیں، وہ سوچنے کی بھی ویسی ہی صلاحیت رکھتا ہے، جیسی محسوس کرنے کی ــــ جیسا کہ ہندی کے لفظ منش (ــــ) سے ظاہر ہوتا ہے، اور عقل کی حکومت چھوڑ کر اندھے جذبات کی اتباع کرنا گویا انسان کا اپنی جائداد سے ہاتھ دھونا ہے انسان کے اندر عقل، جذبات کو اور تیز کرتی ہے اور ان کی صحیح رہنمائی کرتی ہے، جانور کے اندر روح ہمیشہ سوئی رہتی ہے۔ دل کو بیدار رکھنا گویا سوئی ہوئی روح کو بیدار رکھنا، عقل کو بیدار رکھنا اور اچھے اور برے کے درمیان امتیاز پیدا کرنا ہے۔

یہ صحیح جنسی علم کون سکھائے؟ ظاہر ہے کہ وہ جس نے اپنے جذبات پر پورا قابو پا لیا ہو ــــ علم ہیئت اور اس قسم کے دوسرے علوم سکھانے کے لئے ہمارے پاس ایسے استاد ہوتے ہیں جنھوں نے ان مضمونوں کی ٹریننگ پائی ہے اور اپنے فن کے استاد ہوتے ہیں، اسی طرح ہمیں جنسی علم یعنی جنسی میلان کو قابو میں رکھنے کا علم حاصل کرنے کے لیے بھی ایسے استاد رکھنے ہوں گے جنھوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے نفس پر پورا قابو پا لیا ہے۔ بڑے بڑے دعوے جن کے پیچھے خلوص اور تجربہ کی

طاقت نہیں ہے، بے روح اور بیکار رہوں گے، لیکن جو بات معرفت نفس اور صحیح تجربہ پر مبنی ہوتی ہے، وہ ہمیشہ مفید ثابت ہوتی ہے۔

آج ہمارا تمام کا تمام ماحول ہمارا پڑھنا، ہمارا سوچنا، ہمارا سماجی عمل سب عام طور پر جنسی میلان کی تشفی اور تسکین کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن یہ کام ایسا ہے کہ اس میں ہمیں اپنی بڑی سے بڑی کوششیں لگانی چاہئیں اگر ایک متقی بھر استاد بھی ایسے ہوں جو عملی تجربہ رکھتے ہوں، جو ضبطِ نفس کو انسان کا اعلیٰ ترین مقصد سمجھتے ہوں اور اپنے کام پر انھیں سچا اور پورا اعتقاد ہو، اور وہ ہمیشہ چوکنّے اور ہوشیار رہتے ہوں، ان کی محنتوں سے گجرات کے بچوں کے راستے روشن ہوں گے۔ وہ کمزوروں کو جنسیت کے گڈھے میں گرنے سے بچائیں گے اور انھیں نجات دلائیں گے جو اس وقت اس مرض میں مبتلا ہو چکے ہوں۔

(اصل گجراتی سے ترجمہ کیا گیا)

(۲) [1]

یہ خیال کرنا کہ نوجوان جنسی بے عنوانیوں سے صرف اس بنا پر محفوظ رہیں گے کہ انھیں جنس کے بارے میں پورے طور پر اور آزادانہ اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا ہے، میرے خیال میں ایک بہت خطرناک دھوکہ ہے۔ اور نہ میں اس استاد کی جگہ پر ہونا چاہتا ہوں، خواہ وہ مرد ہو

---

[1] یہ ایل، پی جیکس کی کتاب "پورے انسان کی تعلیم" کے کچھ حصّے ہیں جن کا تذکرہ پچھلے مضمون میں آیا ہے۔

یا عورت جو اس "پورے اور آزادانہ اظہار خیال" کا ذمہ دار ہے۔ اس معاملہ کی اصل نوعیت یہ ہے کہ اس کے بارے میں بحث بالخصوص نوجوانوں سے، ایک قسم کی تحریک ذہنی کا باعث ہوتا ہے، کچھ تو اس کے معمہ ہونے ہی میں یہ بات شامل ہے۔ اگر بحث سے کرید ایک شکل میں ختم ہوتی ہے تو دوسری صورت میں وہ پھر پیدا بھی ہو جاتی ہے۔

جس نوجوان نے جنس کی تعلیم میں ایسے استادوں سے فراغت حاصل کر لی ہے (جو خود بھی مشکل سے خطرے سے بری کہے جا سکتے ہیں) اور اس نے پورا مضمون، گویا حفظ کر لیا ہے، پودوں کی تخم ریزی سے لیکر آگے تک، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کا ان سب باتوں کا علم بالکل نامکمل ہے، جب تک کہ اس نے انہیں تجربہ کی کسوٹی پر نہ کس لیا ہو، اور گمان یہ ہے کہ وہ جلد ہی ان کا تجربہ بھی کرے گا۔ اسے ممکن ہے اس کا شبہ بھی ہوتا ہو کہ آیا اس کے سکھانے والوں نے اس معاملے کے بارے میں پوری حقیقت بھی بیان کی ہے اور یہ ایسی بات ہے کہ اس کے اخلاقی پہلو پر جتنا ہی زور دیا جائے، اسی قدر نوجوان کا شبہ اور بڑھتا ہے۔ اس صورت میں وہ تجربے کی طرف اور تیزی سے بڑھے گا، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اسے دھوکے میں رکھا گیا ہے یا نہیں۔

یورپ کے لاطینی ملکوں میں تیزی سے تجربے کی منزل کی طرف یعنی جنسی علم سے جنسی تجربہ کی طرف تیزی سے قدم بڑھانا کوئی بہت بڑی برائی نہیں سمجھا جاتا ہے، یا ممکن ہے کہ خود یہی مقصود رہا ہو لیکن سرد ممالک کے جنسی مصلحین کے ذہن میں نوجوانوں کو جنس کا علم بطور ایک مضمون کے سکھانے سے یہ منشا ہرگز نہیں ہے۔ ایسے علوم کے بارے میں جو

سائنٹفک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، عملی تجربہ کی ضرورت اس غرض سے کہ سبق مکمل ہو جائے اور اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے، ہر ایک تسلیم کرتا ہے۔ بچے کو جب سوال نظری طور پر سمجھایا گیا ہے تو اسے عملی طور پر بھی کرنا ہوگا، جس چیز کی نوعیت اسے بیان کر دی گئی ہے اسے اس چیز کا امتحان بھی کرنا ہوگا، اسے اس کے نمونے اور نقلیں بھی بنانی ہوں گی، جو چیز اسے جماعت میں سکھائی گئی ہے، اس کا لیبوریٹوری میں جا کر تجربہ بھی کرنا ہوگا، اسے عملی میدان میں جا کر اپنے علم کی جانچ بھی کرنی ہوگی۔ اور اسی طرح کی باتیں ــــ لیکن جو مسئلہ ہمارے سامنے ہے، اس میں استاد کو یہ نہیں کرنا ہے، اس کا مقصد تجربہ سے اور روکنا ہے نہ کہ اسے اور بڑھانا۔ اور خطرہ یہ ہے کہ جو نہ کرنا ہے وہی جلد ہونے لگے گا اور اس طریقہ پر، جس طریقہ سے اسے نہیں ہونا ہے۔ جب استاد "آکسیجن" کی خصوصیات یا ہاضمے کا عمل بتاتا ہے، تو اس کا سابقہ بے جان شے سے ہوتا ہے۔ لیکن اس صورت میں اس کا واسطہ زندہ شے سے ہے اور ایسی شے ہے جو تجربہ کے لئے بے قرار ہو۔ وہ گویا آگ سے کھیل رہا ہے۔

" استاد کے خطرے کو زیادہ وضاحت سے بتانے کی ضرورت نہیں صرف ایک بات کہہ دینی کافی ہے۔ جنس کے متعلق مخلص ہونا مشکل ہے۔ پھر اس معاملہ میں خلوص کے نہ ہونے کا ہلکے سے ہلکا شبہ بھی، جسے نوجوان فوراً پکڑ لیتے ہیں، ایک اچھے نتیجے کے لئے سخت مہلک ہے، جس طرح مذہب کے معاملہ میں ہوتا ہے۔" (صفحہ ۱۹۱ ـــ ۱۹۲)

" اس لئے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جنسی مسئلہ کا حل، جہاں تک ایک معلم کے حدود میں آتا ہے، وہ اصل میں تعلیم کے مقصد میں توسیع کا معاملہ

، یعنی تعلیم صرف حصولِ علم کا نام نہیں بلکہ تخلیق کا نام ہے، سادہ زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ فن کو (جسے ہمیشہ نہایت وسیع معنی میں لیا گیا ہے، یعنی یہ کہ جو کیا جائے وہ اس لائق ہے کہ بہت اچھی طرح کیا جائے) ہماری تعلیم میں ایک بہت بڑی اور زیادہ مرکزی جگہ ملنی چاہیے۔"

(صفحہ ۲۰۰)

"والدین کے فرائض کے سلسلہ میں اس پر بحث کرنا، اس سلسلہ میں جو کچھ میں نے کہا ہے، اس کی مزید تشریح ہونی چاہیے۔ اگر جنس کی تعلیم دینی ہی ہے تو والدین بلاشبہ اس کے بہترین معلم ہیں یا انہیں ہونا چاہیے۔ اگر اسے بے اثر کر دیا جائے یا یہ زہر آلود ہو جائے تو پھر جنس کی تعلیم گھر میں بھی ایسی ہی خطرناک ہوگی، جیسی کہ اور کہیں ہو سکتی ہے۔" (صفحہ ۲۰۲)

("ہریجن" ۲۱ر نومبر ۱۹۳۶ء)

برہمچریہ

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں 'برہمچریہ' پر کچھ اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ بعض مسائل ہیں جن پر حسبِ موقع 'نوجیون'، میں لکھتا رہتا ہوں، لیکن ان پر مشکل سے کبھی بولتا ہوں۔ 'برہمچریہ'، انہی میں سے ایک موضوع ہے۔ یہ ایک ایسا مضمون ہے جو صرف الفاظ کے ذریعے مشکل سے بیان کیا جا سکتا ہے، جس برہمچریہ، کے بارے میں تم سننا

چاہتے ہو، وہ معمولی برہمچریہ ہے۔ لیکن ایک اور، اور اس سے زیادہ مشکل برہمچریہ ہے، جو ہمارے تمام حواس کو قابو میں رکھنا سکھاتا ہے۔ معمولی برہمچریہ کا برتنا بھی شاستروں کا کہنا ہے کہ بہت مشکل کام ہے۔ یہ بات ننانوے فیصد صحیح ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ کل حقیقت میں صرف ایک فیصد کی کمی ہے۔ یہ اس وجہ سے مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ہم اور حواس کے قابو میں رکھنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ خاص طور پر ذائقہ کی۔ جو لوگ اپنی قوت ذائقہ پر قابو رکھ سکتے ہیں، ان کے لیے برہمچریہ کا برتنا زیادہ آسان ہے۔ حیاتیات کے ماہر کہتے ہیں کہ انسان برہمچریہ کے برتنے کی اتنی بھی کوشش نہیں کرتے جتنی جانور کرتے ہیں۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جانوروں کو اپنی قوتِ ذائقہ پر پورا قابو ہوتا ہے۔ یہی نہیں کہ وہ شعوری طور پر اس قابو کا اظہار کرتے ہیں، بلکہ یہ ان کی فطرت کا ایک جزو ہے۔ وہ خاص طور پر گھاس سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں، جو وہ پیٹ بھر کھاتے ہیں۔ وہ اس غرض سے کھاتے ہیں کہ زندہ رہیں، وہ کھانے کے لیے زندہ نہیں ہیں۔ لیکن ہماری حالت اس کے برعکس ہے۔ ماں اپنے بچے کو مختلف کھانے کی چیزیں دیتی ہے تاکہ وہ ذائقہ کے مختلف احساسات کا لطف اٹھا سکے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اپنے بچے کے لئے محبت کی بہترین شکل یہ ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ چیزیں کھانے اور ان کا لطف اٹھانے کے لیے دی جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسا کرنے سے ہم اپنی قوتِ ذائقہ کو اور کم کرتے ہیں، اس لئے کہ مزہ تو بھوک ہی کی حالت میں آتا ہے۔ ایک بھوکے آدمی کو ایک سادہ روٹی اس سے زیادہ میٹھی معلوم

ہوگی جتنی کہ ایک پیٹ بھرے کو لڈو۔ ہم اپنے مختلف کھانوں میں اپنے ذائقہ کو تیز کرنے اور اپنی بھوک کو بڑھانے کے لیے بہت سے مرچ مسالے استعمال کرتے ہیں۔ پھر ہم بدہضمی برتنے میں دشواری کی شکایت کرتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے ہمیں چیزیں دیکھنے کے لیے آنکھیں عطا کی ہیں، لیکن ہم ان سے ایسی چیزیں دیکھ کر جنھیں دیکھنا نہیں چاہیئے، ان کا استعمال خراب کرتے ہیں۔ ایک ماں گایتری کا منتر سیکھ کر اپنے بچے کو کیوں نہیں سکھاتی ہے؟ اگر وہ اس کے گہرے معنی میں نہ بھی جائے، وہ اپنے بچے کو زندگی بخش سورج کی پوجا کرنا سکھا سکتی تھی۔ آریہ سماجی اور سناتنی دونوں سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ صرف سورج کی پوجا گایتری کے صحیح معنی کا ایک ہلکا سا لگاؤ ہے۔ سورج کی پوجا کے کیا معنی ہیں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو اپنا سر اونچا اٹھانا چاہیئے، اسے دیکھتے رہنا چاہیئے اور اپنی آنکھوں کو پاک کرنا چاہیئے۔ اس منتر کے پڑھنے والے بڑے بڑے رشی تھے۔ سورج کی پوجا سے ان کی مراد یہ بتانا تھا کہ اس قسم کا منظر، خوشی اور حسن جو ہم سورج نکلنے کے وقت دیکھتے ہیں، وہ کہیں اور نہیں پا سکتے ہیں۔ کوئی اسٹیج آسمان سے زیادہ پُرمنظر نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی ڈائرکٹر خدا سے بڑھ کر نہیں مل سکتا۔ لیکن کتنی مائیں ہیں جو اپنے بچوں کو منہ دھلانے کے بعد صبح کا آسمان دکھاتی ہیں؟ بچہ جو کچھ اسکول میں پڑھتا ہے، وہ شاید آگے چل کر ایک اونچا سرکاری افسر بننے میں اسے مدد دے۔ لیکن کس نے اس قیمت کا اندازہ کیا ہے جو بچہ گھر پر شعوری یا غیر شعوری طور پر سیکھتا ہے؟ ہمارے والدین اپنے بچوں کے جسموں

کہ کپڑوں کی غیر ضروری مقدار سے ڈھکتے ہیں تاکہ وہ اچھے معلوم ہوں لیکن کیا اس سے واقعتاً بچوں کی خوبصورتی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ کپڑوں کی غرض جسم کو ڈھکنا، اسے گرمی و سردی سے بچانا ہوتا ہے نہ کہ اس کے حسن میں اضافہ کرنا۔ جو بر ہنجر بہ برتتا ہے، اس کا جسم لوہے کی طرح سخت اور مضبوط ہوتا ہے۔

ہم بچے کے جسم کو اسے گودوں میں لے کر خراب کر دیتے ہیں۔ ہم اس کے جسم کی گرمی کو اسے گھر کے اندر رکھ کر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں لیکن اس طرح جو گرمی پیدا ہوتی ہے، اس کی مثال کھجا لنے سے دی جا سکتی ہے۔ ہم نے اپنے جسموں کو حد سے زیادہ احتیاط کی وجہ سے نازک اور سخت کام کرنے کے ناقابل بنا دیا ہے۔ یہاں تک تو کپڑوں کے متعلق تھا۔

ہم بچوں کے دماغوں پر گھروں کے اندر اپنی اِدھر اُدھر کی باتوں سے بھی خراب اثرات ڈالتے ہیں۔ ہم ان کی شادی کی بات چیت کرتے ہیں۔ وہ ایسی باتیں دیکھتا ہے جن سے وہ اس کے متعلق اور اسی قسم کے دوسرے امور پر سوچنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ ہم لوگ وحشی کیوں نہیں ہو گئے! باوجود اس کے کہ اخلاق اور اچھے چال چلن کے قیود توڑنے کے بہتیرے موقع پیش آئے، پھر بھی ہمارے سماج میں وہ قیود باقی ہیں۔ انسان کچھ اس طرح کا ہے کہ اپنی تباہی اور بربادی کے مواقع ہوتے ہوئے بھی اپنے کو بچا لیتا ہے۔ اگر برہمچریہ کے برتنے میں یہ رکاوٹیں دور کر دی جائیں تو معاملہ بہت آسان ہو جائے۔

ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی ہم جسمانی طاقت اور صلاحیت میں دوسروں سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے دو طریقے ہیں، ایک خدائی ہے اور دوسرا شیطانی۔ شیطانی طریقہ اُن سب باتوں کو جائز سمجھتا ہے خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط، جو جسم کی طاقت کو بڑھا سکتی ہیں، مثلاً کسی چیز کا کھانا خواہ وہ گائے کا گوشت وغیرہ کیوں نہ ہو۔

میرے بچپن کے زمانے میں ایک دوست یہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں گائے کا گوشت ضرور کھانا چاہیئے، ورنہ ہم اپنے جسم انگریزوں کی طرح توانا اور مضبوط نہیں بنا سکتے ہیں۔ شاعر نرمداشنکر نے بھی اپنی نظموں میں سے ایک میں یہی مشورہ دیا ہے:

"انگریز ہمارے ملک پر حکومت کرتے ہیں۔ ہندوستانیوں نے نہایت خاموشی سے کندھے ڈال دیئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریز ہم سے جسمانی اعتبار سے بہت مضبوط ہیں۔"

نرمداشنکر کا گجرات پر بڑا احسان ہے۔ لیکن ان کی زندگی میں دو مختلف دور آتے ہیں، ایک آزادی کا اور دوسرا ضبطِ نفس کا۔ جس نظم سے میں نے اوپر کی سطریں نقل کی ہیں، وہ پہلے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ جاپان میں بھی جب اس نے اپنی قوت کا مقابلہ دوسرے ملکوں سے کرنا شروع کیا، تو لوگوں نے گائے کا گوشت کھانا تیار کر لیا۔ اگر کوئی شخص شیطان کی طرح اپنے جسم کو ترقی دینا چاہتا ہے، تو وہ ایسی ممنوع چیزیں کھا سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص خدائی طریقے پر اپنے جسم کو ترقی دینا چاہتا ہو

تو اس کے لئے برہمچریہ کا واحد راستہ کھلا ہوا ہے۔ مجھے اس سپاسنامہ میں جو مجھے دیا گیا ہے، ایک ناستک[1] برہمچاری کہا گیا ہے۔ میں کم سے کم جو بات کہہ سکتا ہوں، وہ یہ کہ اس سپاسنامہ کا لکھنے والا اس اصطلاح کے صحیح معنی سے قطعاً ناواقف ہے۔ ورنہ اس کے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ ایک شخص جو شادی شدہ ہو اور اس کے بچے بھی ہوں، وہ ناستک (برہمچاری) کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ناستک، برہمچاری کو کبھی بخار یا دردِ سر کی شکایت نہیں ہوتی، اور نہ اسے کھانسی یا اپنڈی سائیٹس ہوتی ہے، ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ 'اپنڈی سائیٹس، آنتوں کے اندر سنگترے کے بیج چلے جانے سے ہوتی" ہے لیکن بیج کسی ایسے شخص کے جسم میں نہیں رکے گا جو اسے صاف ستھرا اور تندرست رکھتا ہے۔ لیکن جب آنتیں تھک جاتی ہیں اور کمزور ہو جاتی ہیں تو وہ غیر ضروری مادہ خارج نہیں کر سکتی ہیں۔ میری آنتیں بھی اسی طرح تھک کر کمزور ہو گئی ہوں گی۔ اور اس وجہ سے میں غالباً ایسی چیزیں ہضم نہ کر سکا ہوں۔

لڑکے بہت سی بیکار چیزیں کھاتے ہیں۔ مائیں ان باتوں کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتیں، اس لئے کہ نوجوانوں کی آنتیں قدرتاً اتنی قوت رکھتی ہیں کہ اس قسم کے سب فضلہ مادے کو آسانی سے نکال پھینکتی ہیں۔ اس لئے کوئی مجھے ناستک، برہمچاری نہیں

---

[1] مکمل برہمچاری جو آخر عمر تک ترکِ لذات پر قایم رہے۔

کہہ سکتا اور جھوٹ کا مرتکب نہیں ہو سکتا ہے۔ پھر ایک ناستک برہمچاری کی روح کی تیزی مجھ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ میں ابھی ایک مکمل برہمچاری بھی نہیں ہوں، اگرچہ میں ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کے سامنے خود اپنے تجربے کی روشنی میں چند مثالیں دی ہیں جو ایک برہمچاری کی امتیازی خصوصیات ہو سکتی ہیں۔ برہمچاری ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں کسی عورت کو حتیٰ کہ اپنی بہن کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ضرور ہے کہ جس طرح ایک کاغذ کے چھونے سے میرے دماغ میں کوئی غلط جذبہ یا کام کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا، اسی طرح ایک عورت کو ہاتھ لگانے سے بھی کوئی غلط خیال یا کام نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر برہمچریہ میری بیمار بہن کے چھونے اور تیمارداری سے مجھے روکتا ہے تو اس قسم کا برہمچریہ قطعاً بے کار ہوگا۔ ہم اپنے کو اسی وقت برہمچاری کہہ سکتے ہیں، جب خوبصورت سے خوبصورت عورت کو ہاتھ لگانے پر بھی ہمارے دماغ پر کوئی اثر نہ ہو۔ اگر آپ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو اچھے برہمچاری بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو انھیں صحیح قسم کی تعلیم دینی ہوگی، اور آپ نہیں بلکہ صرف میرے جیسا برہمچاری خواہ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو، ایسی تعلیم کی اسکیم تیار کر سکتا ہے۔

برہمچاری اپنی فطرت کی بنا پر سنیاسی ہوتا ہے۔ برہمچریہ کا زمانہ سنیاس کے زمانہ سے بھی زیادہ اہم ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ہم نے اس کی پاکیزگی کو خراب کیا، ہمارا گرہست کا زمانہ بھی خراب رہا،

اسی طرح ، دان پرستا ، بھی خراب ہوا اور جہاں تک سنیاس آشرم کا تعلق ہے ، وہ تقریباً معدوم ہوگیا۔ یہ ہے ہماری حالت جہاں تک ہم پہنچے ہیں۔

جہاں تک اپنے جسموں کو شیطانی طریقہ پر بنانے اور ہمت اور طاقت کے پیدا کرنے کا تعلق ہے ، تو میں بتا دوں کہ اس طریقہ سے ہم ۵۰۰ برس کے بعد بھی پٹھانوں کے برابر نہیں ہو سکتے ہیں، لیکن خدائی راستے پر چلنے سے ہم بہت تھوڑی مدت میں ان کے برابر ہو سکتے ہیں۔ اگر جسم کے بنانے میں کئی سال لگتے ہیں، تو اس خدائی طریقے پر چل کر ہم اپنے اندر ذہنی تبدیلی اس سے کہیں تھوڑی مدت میں لا سکتے ہیں۔ بہرحال، ہم اس پر اسی وقت چل سکتے ہیں جب ہم ان پر نیک کاموں کی بنا پر جو ہم نے پہلے جنم میں کیے ہیں اور ہمارے والدین نے صحیح تربیت دے کر ہمیں تیار کیا ہے ، اس طرف مائل ہوں۔

(نوجیون، ۲۶ فروری ۱۹۲۵ء)

۵۔ عورتوں کی تعلیم

عورتوں کی تعلیم

اگرچہ بہت اونچا اور مفید کام بغیر پڑھنا لکھنا جانے بھی ہو سکتا ہے، پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ پڑھنا لکھنا جاننا ضروری ہے، اس لیے کہ آج کل اس کے بغیر کام چلانا بہت مشکل ہے۔ اچھی کتابیں پڑھنے سے ذہن کی نشو ونما ہوتی ہے اور پھر اس کے ساتھ لوگوں کی اور ملک کی خدمت کرنے کی صلاحیت بھی بڑھتی ہے۔ میں اس علم کی قدر کو ضرورت سے زیادہ نہیں بڑھانا چاہتا لیکن میں اور چیزوں کے ساتھ اس کا جو صحیح مقام ہے، وہ اسے دینا چاہتا ہوں۔ میں کئی موقعوں پر یہ بات کہہ چکا ہوں کہ عورتوں میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے مردوں کو یہ موقع نہیں ہونا چاہیے کہ وہ انھیں ان کے جائز انسانی حقوق سے محروم رکھیں۔ لیکن مناسب تعلیم ضروری ہے تاکہ وہ ان حقوق کا صحیح استعمال کر سکیں،

انھیں اچھا رکھ سکیں اور عوام میں انھیں پھیلا سکیں۔ بغیر صحیح تعلیم کے اور اس تعلیم کے ذریعہ بغیر صحیح علم کے لاکھوں آدمی ایسے ہیں جو اپنی ذات کے متعلق صحیح علم حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ بغیر تعلیم کے مسرت کا وہ لامحدود خزانہ بھی جو مختلف کتابوں میں جمع ہے ہمارے لیے مقفل ہے۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت کا اظہار ہے۔ ایک انسان بغیر تعلیم کے جانور سے کچھ بہت دور نہیں ہے۔ لہٰذا مرد کی طرح عورت کو بھی تعلیم کی ضرورت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت کی بھی اسی قسم کی تعلیم ہونی چاہیے، جیسی مرد کی ہوتی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ جیسی تعلیم سرکار ہمیں دیتی ہے وہ بڑی حد تک خراب اور مضر ہے۔ اس لیے مجھے مرد اور عورت دونوں معاف کریں، اگر اس کی خرابیاں دور بھی کر دی جائیں، پھر بھی میں عورتوں کے لیے اسے مناسب نہ سمجھوں گا۔ مرد اور عورت دونوں حیثیت میں برابر ہیں۔ لیکن وہ اپنی جسمانی یا دماغی ساخت میں ایک نہیں ہیں، وہ ایک عجیب و غریب جوڑہ ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اس قدر کہ ایک کا دوسرے کے بغیر وجود نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس چیز سے ان میں سے کسی ایک کی حیثیت میں فرق آئے گا، اس سے دونوں اپنے اپنے حصے کے بقدر تباہ ہوں گے۔ جو لوگ عورتوں کی تعلیم کا منصوبہ بناتے ہیں، انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔ مرد ایک شادی شدہ جوڑے کی زندگی کے بیرونی دائرے پر حکومت کرتا ہے، اس لیے اسے زندگی کے ان حصوں سے متعلق زیادہ علم

ہونا چاہیے۔ برعکس اس کے عورت اُس زندگی کے اندرونی یا خانگی دائرہ پر حکومت کرتی ہے، اس لیے اسے گھر کے انتظام، بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم وغیرہ کا خاص علم ہونا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرد یا عورت کو دوسرے کے حدود کا علم بالکل نہ ہونا چاہیے، لیکن جب تک ان کی تعلیم کا نصاب ان باتوں پر مبنی نہ ہوگا اس وقت تک وہ دونوں اپنے اپنے دائرے کے اندر کمال حاصل نہیں کر سکیں گے۔

چند باتیں اس سوال سے متعلق کہنی بھی ضروری ہیں کہ آیا عورتوں کو انگریزی جاننا ضروری ہے یا نہیں؟ میرا خیال ہے کہ عام طور پر تو انگریزی کا جاننا نہ مردوں کے لیے ضروری ہے نہ عورتوں کے لیے۔ مردوں کے لیے ممکن ہے اس کی ضرورت اپنی روزی کے لیے یا سیاسی کاموں میں حصہ لینے کے لیے ہو بھی، لیکن میں عورتوں کے لیے کمانا یا تجارتی کاروبار کرنا ضروری نہیں سمجھتا ہوں۔ اس لیے صرف عورتوں کی تھوڑی سی تعداد کے لیے انگریزی پڑھنا ضروری ہوگا۔ اور جو عورتیں ایسا کرنا چاہتی ہیں، وہ بہتر ہے کہ مردوں کے اسکولوں میں پڑھیں۔ انگریزی عورتوں کے تمام اسکولوں میں جاری کرنا اپنی بے چارگی کی مدت کو اور بڑھانا ہے۔ میں نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ انگریزی ادب کا انمول خزانہ عورتوں کے لیے بھی ویسا ہی کھلا رہنا چاہیے جیسا مردوں کے لیے۔ میں نہایت ادب سے کہوں گا کہ یہ ایک غلط خیال ہے اگرچہ اس کی غلطی عیاں نہ ہو۔ کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ انگریزی ادب کا خزانہ مردوں کے لیے تو کھلا رہے لیکن عورت کے لیے بند ہو جائے۔

جسے ادب سے محبت ہے، اسے پوری دنیا کے ادب کو کھنگالنا چاہیئے۔ کوئی شخص اسے ایسا کرنے سے نہ روک سکتا ہے اور نہ روکنا چاہیے گا بشرطیکہ اس میں پختہ ارادہ ہو۔

لیکن چونکہ ہمیں بالعموم اپنے لوگوں کی ضرورتوں کے لیے ایک منصوبہ بنانا ہے، ہم صرف چند ادب کے شیدائیوں کی مخصوص ضرورتوں کا خیال نہیں کر سکتے ہیں؛ ان کے لیے جب ہم کافی ترقی یافتہ اور دولتمند ہو جائیں گے تو یورپ کی طرح تعلیم اور تحقیق کے لیے علیحدہ ادارے ہوں گے۔ جب تعلیم عام ہو جائے گی، جب ہمارے اکثر مرد اور عورتیں تعلیم حاصل کرنے لگیں گے تو ہمیں یقین ہے کہ ہمیں میں سے بہتیرے مصنفین ایسے پیدا ہوں گے جو دوسری زبانوں کے ادب سے لطف اندوز ہونے کے مواقع بہم پہنچائیں گے۔ اگر ہم صرف انگریزی ادب سے ہی لطف اندوز ہوتے رہے تو ہماری زبان ہمیشہ غریب کی غریب رہے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بہ حیثیت ایک قوم کے بھی ہمیشہ ذہنی اعتبار سے غریب رہیں گے اگر آپ اس تشبیہ کے لئے مجھے معاف کریں تو میں یہ تک کہوں گا کہ دوسری زبان کے ادب سے لطف اٹھانے کی عادت اس چور کی سی ہے جو چوری کے مال سے لطف اٹھاتا ہے۔ انگریزی شاعر پوپ نے اپنی قوم کے لیے اپنی خوبصورت زبان میں اس لطف کو پیش کیا جو اس نے ایلیڈ کے مطالعہ سے حاصل کیا تھا اسی طرح فٹزجیرالڈ نے عمر خیام کی شاعری سے جو لطف اٹھایا، اسے ایک ایسی اچھی زبان میں پیش کیا کہ لاکھوں آدمی خیام کی رباعیات کے ترجمے کو اس شوق اور قدر کے ساتھ عزیز رکھتے ہیں، جیسے انجیل کو۔ ایڈوین آرنلڈ نے ہمارے

بھگود گیتا کا کچھ مزہ چکھا۔ اس نے اپنی قوم سے اس لطف اٹھانے کے لئے سنسکرت پڑھنے کو نہیں کہا جو لطف کہ وہ خود اٹھا چکا تھا بلکہ اس نے خود اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا جو ایسا ہی عمدہ ہے جیسے اصل سنسکرت اور اس کے علاوہ اس میں اس نے گویا اپنی روح نکال کر رکھدی ہے۔ یہ دیکھ کر کہ ہم اس میں ابھی بہت پیچھے ہیں ہم کو ترجمہ کے کام میں اور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب ہم اپنی تعلیم کے منصوبہ کو اس طرز پر لے آئیں جو میں نے تجویز کیا ہے اور اس کے مطابق عمل کریں۔ اگر ہم انگریزی سے عشق چھوڑدیں اور خود اپنی زبان کی قوت کو پہچانیں، تو یہ کچھ مشکل نہ ہوگا۔ ہر مرد یا عورت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ انگریزی اس غرض سے پڑھنے میں اپنا وقت صرف کرے کہ وہ اچھے ادب سے لطف اندوز ہو سکے گا۔ میں یہ صرف آپ کو ناراض کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ لطف جو انگریزی تعلیم یافتہ مشکل سے اٹھاتے ہیں، ترجموں کے ذریعہ ہم سب اٹھا سکیں۔ دنیا کی زبانیں انمول جواہرات سے بھری پڑی ہیں، اور ادب کے تمام جواہرات انگریزی میں ہیں بھی نہیں۔ میں ان تمام جواہرات کو چاہتا ہوں کہ ساری قوم پا سکے۔ اس کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ہم میں جو لوگ زبانوں کا شوق رکھتے ہیں، انھیں سیکھیں اور پھر ان غیر ملکی ادبی کلاسیکس کو اپنی زبان میں منتقل کریں۔

(۲)

احمد آباد کی گجرات ساہتیہ سبھا نے اپنی عورتوں کی تعلیم سے متعلق

ایک سوالنامہ گجرات کے بعض منتخب اشخاص اور اداروں کو بھیجا تھا گاندھی جی نے اس کا جو جواب دیا، ان میں بعض سوالات کے جوابات حسب ذیل ہیں۔ (مدیر)

ابتدائی تعلیم کے بعد ایک لڑکی کو چار یا پانچ سال اور ثانوی تعلیم کے ملتے ہیں۔ اس سوال کے جواب ہیں کہ آیا اس مدت میں اس کی تعلیم انگریزی کے ذریعہ ہونی چاہیئے یا مادری زبان کے ذریعہ گاندھی جی نے فرمایا:

"میرا خیال یہ ہے کہ ان حالات کے اندر انھیں انگریزی پڑھانا گویا جان سے مار ڈالنا ہے۔ سیکڑوں کیا ہزاروں کے لئے یہ کبھی ممکن نہ ہوگا کہ وہ انگریزی میں سوچ سکیں یا اپنے خیالات ظاہر کرسکیں اور اگر یہ ممکن ہو بھی تو یہ کچھ مناسب بھی نہیں ہے۔

جن عورتوں کے لئے ہم یہ خاکہ مرتب کر رہے ہیں، اگر ان کی اعلیٰ تعلیم مادری زبان کے ذریعہ ہو تو وہ اپنے گھروں کو ایسا ہی خوب صورت اور روشن بنا سکیں گی جیسے سونا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے اثرات اپنی غیر تعلیم یافتہ بہنوں پر بھی ڈال سکیں گی اور ان کی بیش قیمت خدمات انجام دے سکیں۔

سنسکرت کے متعلق گاندھی جی نے حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:

"میری رائے ہے کہ سنسکرت کی تعلیم ہونی چاہیئے اور

اگر ممکن ہو تو اسے نصاب میں داخل کر لینا چاہیے لیکن یہ سوچ کر کہ ہم ان چار یا پانچ برسوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہتے ہیں اس لئے سنسکرت کی تعلیم کو کوئی افضلیت نہیں دی جا سکتی ہے۔"

اخلاقی اور مذہبی تعلیم کے متعلق ان کا جواب یہ تھا:۔

"میں اخلاق اور مذہب میں کوئی فرق نہیں پاتا ہوں، میں محسوس کرتا ہوں کہ مذہبی تعلیم کی بہت سخت ضرورت ہے۔ لیکن ہندو مذہب ایسا ہے کہ ایک شخص بے سوچے سمجھے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کس طرح دینی چاہیئے۔ پھر بھی عام طور سے اگر پوچھئے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'گیتا' 'راماین'، 'مہابھارت'، اور 'بھگوت'، تمام ہندوؤں میں یکساں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں اور اگر انھیں طلباء کو اس غرض سے پڑھایا جائے کہ انھیں اپنے روحانی ذخیرے سے تعارف کرانا ہے تو یہ عام ضروریات کے لیے کافی ہے۔ اس سلسلے میں استاد کا انتخاب نصاب کے متعین کرنے کی نسبت زیادہ ضروری ہے۔

آپ دنیا میں جس طرح چاہیں، اپنے حالات کے مطابق رہیں، لیکن خدا تک پہنچنے کا مقصد ہمیشہ اپنے سامنے رکھیں (گیتا بھگوت نے یہ کہا ہے۔ اگر یہ اصول پیش نظر رکھا جائے تو مذہبی تعلیم کا مقصد اس صورت میں پورا ہو سکتا ہے۔

مخلوط تعلیم کے متعلق گاندھی جی سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے

فرمایا کہ:-

"مخلوط تعلیم کے میں نے تجربے کیے ہیں، یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ عام قاعدہ یہ ہونا چاہیے کہ لڑکے اور لڑکیاں الگ الگ اداروں میں تعلیم پائیں"

معلمات کی کمیابی کے سوال پر انھوں نے جواب دیا کہ:

"جب تک ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سب عورتوں کی بشمول ان کے جو تعلیم یافتہ ہیں، شادیاں ہونی چاہئیں تو معلمات کی ہمیشہ کمی رہے گی۔ البتہ اچھی معلمات وہ مل سکتی ہیں جو بیوہ ہیں لیکن جب تک ہندوستان بیوہ عورتوں کو ان کا صحیح مقام نہیں دیتا ہے، اور عورتوں کی تعلیم کی اسکیمیں ان ہندوؤں کے ہاتھوں میں رہیں گی جو مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں، اس وقت تک اچھی معلمات کا ملنا مشکل ہے خواہ وہ بیوہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ہمارے بہت سے منصوبے کسی نہ کسی سماجی رکاوٹ کی وجہ سے ٹھپ ہو جاتے ہیں اور ہم آگے قدم نہیں بڑھا سکتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ اصلاح شدہ طبقہ اور بقیہ حصہ قوم میں کوئی بنیادی رابطہ نہیں ہے"

(مراسی رسالہ آ نمو دھر، سے لیا گیا۔ جلد دوم صفحہ ۱۳۵)

پاربتی اور سیتا کی مثالیں

گاندھی جی نے ۱۹۲۷ء میں سیلون کا ایک سفر کیا تھا جس میں انھوں نے راماتھن گرلز کالج میں ایک تقریر کی تھی یہ حصہ اسی تقریر سے لیا گیا ہے۔

(مدیر)

"تم نے اپنے ایڈریس میں یہ وعدہ کیا ہے کہ تم اِس دن کو سالانہ تقریب کے طور پر منایا کرو گی اور اُس دن کو کھادی کے کام کے لیے چندہ کرنے میں وقف کرو گی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ صرف وعدہ ہی وعدہ نہ ہوگا بلکہ تم اس کو پورا بھی کرو گی۔ اگر وہ لاکھوں فاقہ زدہ جن کے لیے میں یہ سفر کر رہا ہوں، اپنی بہنوں کے اس عزم کو سمجھ سکیں تو مجھے یقین ہے کہ ان کا دل خوشی سے باغ باغ ہوجائے گا۔ لیکن تمھیں مجھ سے یہ سن کر تکلیف ہوگی کہ وہ بے زبان مرد اور عورتیں جن کے لیے تم نے یہ تھیلی مجھے پیش کی ہے ـــــ اور سیلون میں ایسی کتنی تھیلیاں مجھے پیش کی گئی ہیں ـــــ اگر میں انھیں بتانا بھی چاہوں تو وہ ایسی باتوں کے سمجھنے کے قابل نہیں ہیں۔ میں ان کی حالت زار کا کیسا ہی نقشہ کھینچوں، پھر بھی تم ان کا کچھ بھی اندازہ نہیں کر سکو گی۔

اس سے فوراً ہی میرے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ تم کو ان کے اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے لیے کیا کرنا ہے؟ یہ کہہ دینا بہت آسان ہوگا کہ انھیں اور سادہ زندگی بسر کرنی چاہیے، یا اور زیادہ محنت و

مشقت سے کام لینا چاہیئے۔ لیکن یہ اس سوال کا مذاق اڑانا ہے۔ انہی خیالات اور اس قسم کے دوسرے خیالات کی وجہ سے میں نے اس کا حل چرخے میں سمجھا ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا جس طرح میں آج تم سے کہہ رہا ہوں کہ اگر تم نے ان لاکھوں فاقہ زدہ اور اپنے درمیان کوئی زندہ تعلق قائم کر لیا تو پھر تمہارے، ان کے اور دنیا کے لیے امید کی کوئی کرن باقی رہ جائے گی۔

تم مذہبی تعلیم حاصل کر رہی ہو اور اس ادارے میں بہت اچھی حاصل کر رہی ہو۔ تمہارے ہاں ایک خوبصورت مندر بھی ہے۔ میں تمہارے ٹائم ٹیبل میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ تم پرارتھنا سے اپنے اسکول کا کام شروع کرتی ہو۔ یہ سب باتیں بہت اچھی اور تعریف کے قابل ہیں لیکن یہ سب کچھ ایک رسم بن کر بھی رہ سکتی ہیں اگر اس عبادت سے ہر روز کوئی نہ کوئی عملی کام نہ نکلے۔ اسی لیے میں کہوں گا کہ اس عبادت کے نتیجے میں تم کتائی کا کام ہاتھ میں لو، ہر روز آدھ گھنٹہ اس کام کے لیے دو اور پھر ان لاکھوں آدمیوں کا تصور اپنے دل میں لاؤ جن کا میں نے تم سے ذکر کیا ہے اور پھر خدا کا نام لے کر کہو کہ: "میں یہ چرخہ ان کے لیے کات رہی ہوں"۔ اگر تم اسے دل سے کرو گی اور یہ سمجھو گی کہ یہ نیک کام تم کس خاکساری اور نیک نیتی سے کر رہی ہو تو تمہیں کھادی پہننے میں کوئی تامل نہ ہوگا اور اس طرح تم اپنے اور ان لاکھوں آدمیوں کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم کر سکو گی۔

لیکن میں اس ادارے کی لڑکیوں سے صرف اتنا ہی نہیں کہنا

چاہتا ہوں ــــــ اگر تم راما ناتھن کی ان تمام شفقتوں اور عنایتوں کی مستحق بننا چاہتی ہو جو انھوں نے تم پر کی ہیں اور اب لیڈی راما ناتھن اور ان کی رفقاء تم پر کر رہی ہیں، تو تمہیں اور بہت سی باتیں کرنی ہوں گی۔ میں نے تمہارے رسالوں میں کس قدر فخر کے ساتھ اس کا تذکرہ دیکھا، جو اس ادارے کی پرانی لڑکیاں کر رہی ہیں۔ میں نے اس قسم کی اطلاعیں پڑھیں کہ فلاں فلاں لڑکی کی فلاں فلاں سے شادی ہو گئی ــــــ لیکن میں ان اطلاعات میں ایک چیز کہیں نہیں دیکھتا ہوں اور وہ یہ کہ کسی لڑکی نے اپنے کو صرف خدمت کے لیے وقف کر دیا ہو۔ اس لیے میں تم سے وہی بات کہنی چاہتا ہوں جو میں نے ہز ہائینس مہاراجہ کالج بنگلور کی لڑکیوں سے کہا تھا اور وہ یہ کہ ہمارے ماہرین تعلیم جو کوششیں کرتے ہیں اور تمہاری تعلیم پر جو فیاضانہ خرچ ہوتا ہے اس کا ہمیں کچھ صلہ نہیں ملتا، اگر تم محض گڑیوں کی طرح رہیں اور ایسے اداروں سے فارغ ہوتے ہی زندگی سے غائب ہو گئیں۔

لڑکیوں کی ایک بڑی اکثریت، جوں ہی وہ اسکول اور کالجوں سے نکلتی ہیں، پبلک زندگی سے غائب ہو جاتی ہیں۔ تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا ہے۔ تمہارے سامنے مس ایمری اور دوسروں کی مثال ہے جو اس ادارے میں نگراں رہی ہیں اور اگر میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں تو وہ کنواری رہی ہیں۔

ہر لڑکی اور ہر ہندوستانی لڑکی صرف شادی ہی کے لیے نہیں پیدا ہوتی ہے۔ میں بہت سی لڑکیاں دکھا سکتا ہوں جو آج نہ صرف

ایک شخص کی خدمت کر رہی ہیں بلکہ انھوں نے عام خدمت کے لئے اپنے کو وقف کر دیا ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہندو لڑکیاں پاربتی اور سیتا کی عظیم الشان مثال قایم کریں۔

تم اپنے کو شیو کی ماننے والی کہتی ہو — تمہیں معلوم ہے کہ پاربتی نے کیا کیا تھا؟ انھوں نے اپنے شوہر کے لیے روپیہ خرچ نہیں کیا، اور نہ انھوں نے خود نابینے ہوئے کیا اور آج وہ ہندوؤں کی سات ستیوں میں شمار کی جاتی ہیں — اس لئے نہیں کہ انھیں کسی تعلیمی ادارے سے ڈگری ملی تھی، بلکہ اپنی غیر معمولی ریاضت (تپسیا) کی وجہ سے۔

میرا خیال ہے کہ یہاں بھی جہیز کی وہ لعنت ہے جس سے بہت سی لڑکیوں کو مناسب بر ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بڑی لڑکیوں سے۔ اور میرے خیال میں تم میں سے بعض بڑی ہو بھی، یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ ان باتوں کو پسند نہیں کرتی ہوں گی۔ اگر تم ان بری رسموں سے پرہیز کرو گی، تو تم میں سے بعض کو یا تو عمر بھر یا کم سے کم کئی سال تک کنواری رہنا پڑے گا۔ پھر جب تمہاری شادی کا وقت آئے گا اور تم محسوس کرو گی کہ تمہیں زندگی کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہے، تو تم ایسے کی بھوکی نہ ہو گی جس کے پاس دولت ہے، شہرت ہے یا صورت شکل کی خوبصورتی ہے، بلکہ تمہیں ایسے رفیق کی تلاش ہوگی جس طرح سے کہ پاربتی کو تھی، جس میں تمام خوبیاں ہیں جو ایک اچھی سیرت کے انسان میں ہو سکتی ہیں۔

تمہیں معلوم ہے کہ نارد جی نے شیو کا پاربتی سے کن لفظوں میں

تذکرہ کیا تھا؟ انھوں نے کہا تھا کہ وہ ایک غریب شخص ہے جس کے جسم پر راکھ ملی ہوئی ہے، اس کے بارے میں کس خوبصورتی کا ذکر کیا۔ وہ ایک 'برہمچاری' ہے۔ اور پاربتی نے یہ سنتے ہی کہا کہ ہاں وہی میرا شوہر ہوگا۔ تم کو شیو کی بہت مثالیں نہیں ملیں گی، جب تک کہ تم میں بعض ریاضت (تپسیا) کے لئے تیار نہ ہوگی اور یہ ریاضت ہزاروں برس کی نہ ہوگی جیسی کہ پاربتی نے کی تھی یہ ہم جیسے کمزور انسان نہیں کر سکتے ہیں لیکن تم کم سے کم اپنی زندگی میں کر سکتی ہو۔

اگر تم یہ شرطیں منظور کروگی تو تم گڑیوں کی دنیا میں کھو جانا پسند نہ کروگی، بلکہ پاربتی، سیتا اور ساوتری کی طرح ستیوں میں ہونے کی آرزو کروگی۔ اس وقت تم میری رائے میں اس قسم کے ادارے کی مستحق ہوگی۔

خدا تمہارے دلوں کو اس قسم کے حوصلے سے گرمائے اور اگر تمہارے دلوں میں اس قسم کی گرمی پیدا ہے تو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا کرے۔"

"گاندھی جی سیلون میں" صفحہ ۴۶ تا ۴۹)

تعلیم کا قصور

کچھ مہینے ہوئے کہ 'اسٹیٹسمین' نے اپنے کالموں میں جہیز کی رسم سے متعلق ایک سلسلہ بحث کا چھیڑا تھا جو تقریباً سارے ہندوستان کی بہت سی ذاتوں میں مروج ہے اور پھر اس پر اپنا مقالہ افتتاحیہ بھی

لکھا۔ میں 'ینگ انڈیا' میں اس قسم کی قبیح رسموں کے بارے میں لکھا کرتا تھا۔ 'اسٹیٹسمین' کے ان مضمونوں سے اس قبیح رسم کی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ میرے اعتراضات زیادہ تر رسم کے 'دینی لینی' پہلو پر ہوتے تھے، جیسی کہ سندھ میں یہ کہلاتی ہے۔ بہت سے تعلیم یافتہ سندھی ایسے تھے جو لڑکی کے والدین سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے تھے، اگر وہ اپنی بچیوں کی شادی کسی اچھے گھر میں کرنا چاہتے تھے۔ 'اسٹیٹسمین' نے یہ جہاد عام رسم کے خلاف اٹھایا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ رسم بہت بری ہے۔ لیکن جہاں تک میری واقفیت ہے، یہ ان لاکھوں عوام تک نہیں پہنچی ہے۔ یہ رسم صرف متوسط طبقہ تک محدود ہے، جو ہندوستان کی آبادی میں ایک قطرہ سے زیادہ نہیں۔ جب کبھی ہم بری رسموں کا ذکر کرتے ہیں تو عموماً ہم متوسط طبقہ کا خیال دل میں رکھتے ہیں۔ لاکھوں انسان جو گاؤں میں رہتے ہیں، ان کی اپنی رسمیں اور مصیبتیں ہیں جن کا ہمیں ابھی تک کوئی علم نہیں ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمیں جہیز کی برائیوں کو نظرانداز کر دینا چاہیے اس لیے کہ یہ نسبتاً اس ملک کی تھوڑی تعداد تک محدود ہے۔ اس نظام کو بہرحال ختم کرنا ہے۔ ایسی شادی جسے والدین صرف پیسے کے لیے کریں، ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ نظام اصل میں ذاتوں کے ساتھ وابستہ ہے۔

جب تک انتخاب کا معاملہ کسی مخصوص ذات کے صرف چند سو نوجوان لڑکوں اور چند سو لڑکیوں تک محدود ہے، اس وقت تک یہ نظام

قی رہے گا، خواہ اس کے خلاف کچھ بھی کہا جائے۔ اگر اس بُرائی کو ختم کرنا ہے
تو لڑکے، لڑکیوں اور ان کے والدین کو ذات پات کی قید توڑنی ہوگی۔
اس کے علاوہ شادی کی عمر کو بھی اور بڑھانا ہوگا اور لڑکیوں میں اگر ضرورت
پڑے، تو کنواری رہنے کی ہمت ہونی چاہیئے، یعنی اگر انھیں کوئی مناسب
بر نہ ملتا ہو۔ ان سب کا مطلب ہے، سیرت کی ایک ایسی تعلیم جو قوم کے
نوجوانوں کی ذہنیت کی کایا پلٹ کردے۔ بدقسمتی سے ہمارے نظام
تعلیم کو ہمارے ماحول سے کوئی واسطہ نہیں ہے، جو ہماری قوم کے لڑکے
اور لڑکیوں کی ایک قلیل اقلیت کی تعلیم کی وجہ سے بالکل بے اثر رہتا ہے
اس لئے یہ بُرائی یا اس جیسی اور بُرائیوں کو دور کرنے کے لئے جو
کچھ بھی کیا جا سکتا ہے وہ صرف ایک ایسی تعلیم کے ذریعہ ہو سکتا ہے
جو ملک کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے۔ تعجب ہے
کہ اتنے لڑکے اور لڑکیاں جو کالج سے بھی نکل چکے ہیں وہ ایک ایسی
کھلی قبیح رسم کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں، جو ان کے مستقبل پر اس طرح اثر
انداز ہے جیسے کہ شادی۔ وہ تعلیم یافتہ لڑکیاں صرف اس وجہ سے
خودکشی کر لیں، اس لئے کہ وہ شادی کے لئے پسند نہیں ہو سکی ہیں؛
ان کی تعلیم کس قیمت کی ہے، اگر وہ انھیں اس قابل نہیں بناتی ہے
کہ وہ ایک ایسی رسم کا مقابلہ کر سکیں جو اخلاقی یا کسی اعتبار سے ایک
لمحے کے لئے بھی ٹھہر نہیں سکتی ہے؟ اس کا جواب صاف ہے۔ ہمارے
نظام تعلیم میں کوئی ایسی بنیادی خرابی ہے جو ہماری لڑکیوں اور لڑکوں
کو اس قابل نہیں بناتا ہے کہ وہ سماجی اور دوسری قسم کی برائیوں کے
خلاف جنگ کر سکیں۔ صرف وہی تعلیم کوئی قیمت رکھتی ہے جو ایک

طالب علم کی صلاحیتوں کو ابھارتی ہے جس سے ایک لڑکا یا لڑکی زندگی کے مسائل کو صحیح طور پر حل کر سکے، خواہ وہ کسی شعبہ سے تعلق رکھتے ہوں۔

('ہریجن'۔ ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء)

۶۔ کام کی تعلیم

فرصت کا چسکا

ایک بڑے محترم دوست جو ایک دن گاندھی جی سے باتیں کر رہے تھے یہ فرمانے لگے کہ کیا فرصت کا مسئلہ واقعی اس قدر مشکل مسئلہ ہے؟ انھوں نے پوچھا کہ "آپ آٹھ گھنٹے روزانہ ہاتھ کے کام پر کیوں زور دیتے ہیں؟ کیا ایک اچھے منظم سماج میں یہ ممکن نہیں کہ کام کے دن کو گھٹا کر دو گھنٹے کر دیا جائے اور لوگوں کے دماغی اور جسمانی مشاغل کے لئے کافی وقت دیدیا جائے؟"

"ہم جانتے ہیں کہ جنھیں اتنا سارا فرصت کا وقت ملتا ہے — خواہ وہ جسمانی کام کرنے والوں کا طبقہ ہو یا دماغی، اس کا پورا استعمال نہیں کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم اکثر یہ دیکھتے ہیں کہ جنھیں دماغی اعتبار سے فرصت ہوتی ہے، ان کا دماغ شیطان کا گھر بن جاتا ہے۔"

"لیکن نہیں، وہ بے کار وقت ضایع نہیں کرے گا۔ فرض کیجئے کہ ہم دن کو اس طرح تقسیم کریں کہ دو گھنٹے دماغی کام کے لیے رکھیں تو کیا یہ قوم کے لیے مفید نہ ہوگا؟"

میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ممکن ہو سکے گا۔ میں نے حسابی طور پر اس کا اندازہ نہیں کیا ہے لیکن اگر ایک شخص دماغی کام ذاتی نفع کیلئے کرتا ہے اور قوم کے فائدہ کے لیے نہیں تو مجھے یقین ہے کہ یہ اسکیم ناکام ہو گئی، سوائے اس کے کہ ریاست اسے دو گھنٹے محنت کے عوض اتنا کافی دے اور دوسرے کام بغیر معاوضہ کرنے کے لیے اسے مجبور کرے۔ یہ ایک اچھی چیز ہوگی لیکن یہ اس وقت تک نہ ہوگی جب تک ریاست ہر ایک کو مجبور نہ کرے۔"

لیکن مثال کے طور پر تم آٹھ گھنٹے جسمانی محنت نہیں کر سکتے ہو اور تمہیں آٹھ گھنٹے یا اس سے زیادہ دماغی کام کرنا پڑ رہا ہے تو تم اپنی فرصت کا غلط استعمال نہیں کر رہے ہو۔"

"یہ جبری کام ہے اور اس میں کوئی فرصت نہیں ہے، مثال کے طور پر یہ لو کہ میں ٹینس کھیلنے جا رہا ہوں۔ لیکن میں اپنی مثال لیتا ہوں اگر ہم آٹھ گھنٹے تک ہاتھ سے کام کرتے تو ہمارے دماغ کہیں زیادہ بہتر ہوتے۔ ہمارے دماغ میں بے کار خیال نہ آتا اور میں آپ سے کہتا ہوں کہ میرا دماغ بے کار خیالات سے بالکل پاک کبھی نہیں ہے۔ اب بھی میں وہ ہوں جو ہوں؛ اس لیے کہ میں نے اپنی ابتدائی زندگی میں جسمانی محنت کی قیمت سمجھی تھی۔"

"لیکن اگر جسمانی کام میں کوئی ایسی مخفی خوبی ہے تو ہمارے لوگ

آٹھ گھنٹے یومیہ سے زیادہ کام کرتے رہے ہیں، لیکن ان کے دماغوں کی قوت یا پاکیزگی میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا ہے۔

جسمانی محنت بذات خود کوئی تعلیم نہیں ہے جس طرح سے کہ دماغی محنت نہیں ہے۔ یہ ہم لوگوں کے حق میں مشقت سے کم نہ تھی اور انھیں اس کا علم بھی نہ ہوتا تھا جن سے ان کے نفیس جذبات مردہ ہو جاتے تھے۔ اسی لئے مجھے 'سوَرنا' ہندوؤں سے سخت شکایت ہے۔ انھوں نے کام کو پرولتاریا طبقہ کے لئے ایک مشقت بنا دیا ہے جن سے انھیں کوئی حظ نہیں ملتا اور نہ اس میں انھیں کوئی دلچسپی ہوتی ہے اگر انھیں دوسروں کی طرح سماج کا ویسا ہی رکن سمجھا گیا ہوتا، تو آج ان کی سب سے قابلِ فخر حیثیت ہوتی۔ یہ کلجگ سمجھا جاتا ہے، ست جگ، یا عہدِ زریں میں جب کبھی بھی وہ تھا، میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس وقت کا سماج آج سے کہیں بہتر حالت میں تھا۔ ہمارا ملک بہت قدیم ہے جہاں تہذیبیں آئیں بھی اور گئیں بھی، اور یہ کہنا مشکل ہے کہ کسی ایک زمانہ میں ہم واقعتاً کیا تھے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم جہاں تھے، وہیں ہیں، اس لیے کہ ہم نے عرصے شودروں کو پیچھے ڈال رکھا ہے۔ آج کی گاؤں کی تہذیب، اگر تہذیب اسے کہا جا سکتا ہے، نہایت بری تہذیب ہے۔ گاؤں کے لوگ جانوروں سے بھی بدتر حالت میں رہتے ہیں۔ قدرت جانوروں کو قدرتی طور پر کام کرنے اور رہنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ ہم نے اپنے مزدوروں کی جماعتوں کو اس قدر گرا دیا ہے کہ وہ قدرتی طور پر نہ کام کر سکتے ہیں اور نہ رہ سکتے ہیں۔ اگر ہم لوگ سمجھ بوجھ کے ساتھ کام کرتے

اور خوشی کے ساتھ، تو آج ہم بالکل مختلف ہوتے۔

"کام اور تہذیب ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جاسکتے؟"

"نہیں — لوگوں نے قدیم روم میں اسے الگ کرنے کی کوشش کی اور وہ نہایت بری طرح ناکام رہے۔ تہذیب بغیر محنت کے یا تہذیب جو محنت کا حاصل نہ ہو، وہ بقول ایک رومن کیتھولک مصنف کے "تفنن" ہوگی۔ رومیوں نے عیش و آرام کو ایک عادت بنالیا تھا اور وہ تباہ ہوئے۔ انسان محض لکھ پڑھ کر یا دن بھر تقریریں کر کے اپنی ذہنی نشو و نما نہیں کر سکتا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں نے جو کچھ مطالعہ کیا وہ اپنے ان فرصت کے اوقات میں جو مجھے جیل میں ملتے تھے اور مجھے اس سے اس لیے فائدہ پہنچا کہ یہ سب کچھ ایک نظام اور مقصد کے ساتھ ہوتا تھا اور اگرچہ میں نے مہینوں تک آٹھ گھنٹے روزانہ جسمانی محنت کی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ ذہنی اعتبار سے میں کچھ نقصان میں رہا ہوں، میں کبھی کبھی ۲۰ میل ایک دن میں پیدل چلا ہوں اور پھر کبھی سستی نہیں محسوس کی ہے۔"

"لیکن تمہارے پاس یہ سب ذہنی سازوسامان ہے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں — تم نہیں جانتے کہ میں جب اسکول میں پڑھتا تھا، یا انگلستان میں تھا تو اوسط درجہ سے زیادہ نہ تھا — میں مباحثہ کے جلسوں میں یا حامیانِ سبزی کے جلسوں میں کبھی بولنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ نہیں — لیکن یہ نہ سمجھو کہ مجھے قدرت نے کوئی غیر معمولی طاقتیں عطا کی تھیں

میرا خیال ہے کہ خدا نے مصلحتاً مجھ میں بولنے کی قوت نہیں رکھی تھی۔ تمہیں جاننا چاہیے کہ اپنے لوگوں میں میں سب سے کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔"

(ہریجن، یکم اگست ۱۹۳۶ء)

کتائی کی برکتیں

میں جانتا ہوں کہ بعض لوگوں نے میرے اس خیال پر کہ چرخا میری نجات کا ذریعہ ہے، میرا مذاق اڑایا ہے۔ لیکن اگر صحیح بھی ہو تو کیا ایک شخص جو مٹی کا ایک گولا بناتا ہے اور اسے پارکھتی ایشور چلتا منی کا نام دیتا ہے اور اس پر اپنی تمام صلاحیتیں اس امید پر صرف کر دیتا ہے کہ اس کے ذریعہ اسے "خدا کا جلوہ" نظر آئے گا، ان لوگوں کے نزدیک مضحکہ خیز ہوگا جو اس کے اس عقیدے سے اتفاق نہیں رکھتے ہیں۔ لیکن کیا وہ جو اس حقیقت کے پانے پر اس قدر تلا ہوا ہے، اس بنیاد پر اس کی پوجا کرنی چھوڑ دے گا؟ نہیں، بلکہ برعکس اس کے وہ اور بھی اس پر جما رہے گا، جب تک کہ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو جاتا۔ اور آخر میں وہ کامیاب ہوگا اور اس کے مخالفین اپنے مذاق اڑانے پر بہت نادم ہوں گے۔ اسی طرح اگر میرا چرخے کا تصور بھی میری خلوصِ نیت پر مبنی ہے، تو یقیناً یہ میرے لیے میری نجات کا ذریعہ ہوگا۔ ایک سچے ہندو کے کان آپ سے

آپ اُس طرف متوجہ ہو جائیں گے، جس طرف سے رام نام کی دُھن آ رہی ہو اور اُس وقت تک اس کے اندر تمام بُرے جذبات دبے رہ جائیں گے۔ اس سے کوئی بحث نہیں اگر اس متبرک نام کا وِرد دوسروں پر کوئی اثر نہیں پیدا کرتا ہے۔ ایک ہندو پر واللہ اکبر، کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ لیکن ایک مسلمان کے کان اس آواز پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح ایک اچھا انگریز جس وقت وہ خدا کے وجود کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے تو وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھتا ہے اور خود کو اس وقت تک کے لئے درست رکھے گا۔ عبادت کے پیچھے جیسی اسپرٹ ہوتی ہے، ویسا ہی عبادت کرنے والے کو پھل ملتا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ خدا بھی اپنی جگہ پر کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو اور میں نے اس کے اوصاف جو بتائے ہیں وہ اگر میرے تخیل کا نتیجہ ہیں تو پھر بھی یہ کم سے کم میرے لئے دکام دھینو، یعنی نفع بخش ثابت ہوگا۔

میں جب ایک تار بھی اس سے نکالتا ہوں تو مجھے ہندوستان کے غریبوں کا خیال آجاتا ہے۔ ہندوستان کے غریب کا خدا پر کوئی ایمان نہیں رہا ہے، اور یہ ایمان کی کمی متوسط طبقوں یا امراء میں اور زیادہ ہے، اس لئے کہ ایک شخص جو بھوک کی تکلیف سے بے چین ہو اور اسے سوائے پیٹ بھرنے کے اور کچھ نہ سوجھتا ہو تو اس کا پیٹ ہی اس کا خدا ہوگا۔ اس کے لئے جو بھی اسے روٹی دے، وہی اس کا مالک ہے اسی کے ذریعہ وہ خدا کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ ایسے

اشخاص کو خیرات دینا جو ہر طرح سے ہٹے کٹے ہیں خود کو بھی گراتا ہے اور ان کو بھی۔ انھیں جس چیز کی ضرورت ہے، وہ کوئی نہ کوئی کام ہے اور جو کام لاکھوں آدمیوں کو روٹی دے سکتا ہے، وہ صرف کتائی ہو سکتی ہے۔ لیکن میں کتائی پر اعتقاد لاکھوں آدمیوں کے دلوں میں تقریریں کر کے نہیں بلکہ خود کات کر پیدا کر سکتا ہوں، اس لئے میں نے اپنی کتائی کو کفارہ یا حلف کہا ہے۔ اور چونکہ میرا اعتقاد ہے کہ جہاں غریبوں کے ساتھ سچی اور عملی محبت ہوگی، وہاں خدا بھی ہوگا، اس لیے میں ہر تار میں جو چرخے سے نکالتا ہوں، خدا کو دیکھتا ہوں۔

تمہیں کیوں کاتنا چاہیئے؟

یہاں تک تو چرخے سے متعلق میرے تصور کا سوال تھا۔ اگر تم میرا یہ نقطۂ نظر تسلیم کرتے ہو تو پھر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ تمہیں میرا نقطۂ نظر قبول نہ ہو، پھر بھی بہت سے دلائل ہیں جن کی بنا پر تمہیں کاتنا چاہیئے۔ میں نیچے ان میں سے چند ایک دے رہا ہوں:-

۱۔ تم دوسروں کو کاتنے پر اسی وقت مائل کر سکتے ہو جب تم خود بھی کاتو۔

۲۔ تم خود کات کر اور اپنا سوت چرخا سنگھ کو دے کر کھادی کی قیمت کم کرانے میں مدد دے سکتے ہو۔

۳۔ کتائی سیکھ کر تم اب یا آگے کبھی بھی جب تم چاہو، کتائی کی اشاعت میں مدد دے سکتے ہو۔ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ جو لوگ

کتائی کی الف بے سے بھی واقف نہیں، وہ اس کام کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں ہیں۔

۴۔ اگر تم خود کاتو گے تو کتائی اور بہتر ہوتی جائے گی۔ جو لوگ پیسوں کے لیے کاتتے ہیں، وہ قدرتاً صبر سے کام نہ لیں گے۔ وہ اسی نمبر کا سوت کاتتے رہیں گے جس کے وہ عادی ہیں۔ سوت کا نمبر بہتر کرنے کا کام اس کا ہوگا جو اس کا محقق اور اس کا دلدادہ ہوگا۔ یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے۔ اگر کاتنے والوں کی ایک ایسی جماعت جو مرد اور عورت دونوں پر مشتمل ہو، اب تک پیدا نہیں ہوئی ہوتی، جو خالص خدمت کے جذبہ سے کاتتی ہے، تو سوت کی کوالٹی میں جو حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے، وہ ہرگز نہ ہوتی۔

۵۔ اگر تم کاتتے ہو تو تمہاری صلاحیتیں چرخے کے میکانکی پہلو کی ترقی میں کام آسکتی ہیں۔ اب تک چرخے کے میکانکی پہلو اور کتائی کی رفتار میں جو ترقی ہوئی ہے، وہ تنہا ان بے لوث کارکنوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے جو قربانی کے خیال سے کاتتے ہیں۔

۶۔ ہندوستان کا یہ قدیم فن آج تقریباً رفتہ رفتہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا دوبارہ احیاء بڑی حد تک کتائی کے احیاء پر منحصر ہے۔ کتائی میں آرٹ ہے، جن لوگوں نے اسے بطور حلفیہ پابندی کیا ہے، وہ اسے خوب جانتے ہیں۔ ستیا گرہ والے ہفتہ میں کتائی کرنے والے کتائی سے بالکل نہیں تھکے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک وجہ ان کے نہ تھکنے کی وہ اسپرٹ تھی جس میں وہ یہ کام کرتے تھے، لیکن اگر کتائی

میں کوئی آرٹ نہ ہوتا اور اس میں کوئی موسیقی نہ ہوتی تو یہ ان نوجوانوں کے لیے ناممکن ہو جاتا جو ۲۴ گھنٹے میں سے ۲۲½ گھنٹے کتائی کرتے رہے اس سلسلہ میں یہ بات خیال میں رکھنے کی ہے کہ ان کاتنے والوں کو کسی انعام پانے کا کوئی جذبہ محرک نہ تھا۔ کتائی آپ اپنا انعام تھی۔

۷۔ ہمارے ملک میں ہاتھ کا کام ادنیٰ پیشہ سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے شعراء یہاں تک گئے ہیں کہ انھوں نے امراء کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ کبھی مادرِ زمین پر پاؤں بھی نہیں رکھتے تاکہ ان کے تلوؤں پر بال نہ اگنے لگیں۔ چنانچہ بڑے سے بڑا کام یعنی جسمانی محنت جس میں آدمی پیدا ہوتا ہے اور جس کو رشیوں کے قول کے مطابق برہمن نے پیدا کیا، اسے ہم نے ادنیٰ اور حقیر سمجھا ہے۔ اس لیے اگر ہم محنت کرنے والوں کو اپنے سماجی معیار میں حقیر سمجھنے کی برائی سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں خود کاتنا چاہیے۔ کاتنا اس اعتبار سے بادشاہ پر بھی ایسا ہی فرض ہے، جیسا کسان پر۔

نوجوانوں سے

مندرجہ بالا تمام دلائل تم پر صادق آتی ہیں بلا لحاظ اس کے کہ تم لڑکے ہو یا لڑکی۔ لیکن ان کے علاوہ کچھ اور دلائل بھی ہیں جن کی بنا پر تمہارے لیے کاتنا زیادہ ضروری ہے۔ میں اب انہی دلائل کی طرف تمہاری توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں :۔

۱۔ یہ کیسی اچھی بات ہوگی کہ تم بچپن ہی سے غریبوں کے لیے کام کرنے لگو۔ کتائی تمہارے اس جذبۂ خیر کی صحیح راستے پر پرورش کرے گی۔

۲۔ اگر تم ہر روز ایک خاص وقت میں کتائی کرنے لگو تو تم میں پابندی کی عادت پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اگر تم کتائی پابندی سے کرتے ہو، تو تم اور کام کی بھی پابندی کرنے لگو گے اور یہ عام تجربہ کی بات ہے کہ ایک لڑکا جو پابندی سے کام کرنے کا عادی ہے، وہ اس سے دوگنا کام کرتا ہے جو پابندی کا عادی نہیں ہے۔

۳۔ اس سے تمہارے صفائی ستھرائی کے احساس میں ترقی ہوگی، اس لئے کہ بغیر صفائی ستھرائی کے اچھا سوت کبھی نہیں کاتا جا سکتا ہے تمہیں اپنی پونیاں صاف رکھنی ہوں گی، اسی طرح تمہیں اپنا ہاتھ صاف رکھنا ہوگا اور اسے پسینہ سے بچانا ہوگا۔ تمہیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ آس پاس کی جگہ بھی گرد وغیرہ سے پاک ہے۔ کاتنے کے بعد تمہیں اپنا سوت اٹیرن پر صفائی کے ساتھ لپیٹنا ہوگا، پھر اچھی طرح پانی چھڑکنا ہوگا اور آخر میں صاف ستھری اچھی گنڈیاں بنانی ہوں گی۔

۴۔ اس سے تمہیں اس کی بھی تعلیم ہوگی کہ ایک سیدھی سادی مشین کی درستی اور مرمت کیسے کی جاتی ہے۔ عموماً ہندوستان کے لڑکے اور لڑکیوں کو اس قسم کی کوئی تربیت نہیں دی جاتی ہے۔ اگر تم سست ہو اور اپنے چرخے کی صفائی اپنے نوکر یا کسی اور عزیز سے کرا لیتے ہو تو تمہاری اس قسم کی ٹریننگ نہیں ہو سکے گی، مگر میں سمجھتا ہوں کہ ہر بچہ جو اپنا سوت چرخا سنگھ میں بھیجتا ہے یا بھیجے گا، وہ اپنے چرخے کو بھی درست رکھے گا۔ اس کے علاوہ ایک لڑکا جو دلچسپی کے ساتھ کتائی کرتا ہے۔ اور جس طرح ایک بڑھئی جو اپنے اوزار خود صاف کرنا نہیں جانتا، اچھا بڑھئی نہیں کہا جا سکتا ہے، اسی طرح ایک لڑکا

جو اپنی مال خود تیار نہیں کرسکتا۔ اپنی مال کیلئے گھڑی خود نہیں بنا سکتا، یا تکوے کے لیے اپنی موڑھیا خود نہیں تیار کرسکتا، اسے مشکل سے اچھا کاتنے والا کہا جاسکتا ہے، وہ محض کتائی کا نام بدنام کرتا ہے۔

(ینگ انڈیا، ۲۰ رمئی ۱۹۲۶ء)

مہاتماجی کا حکم

ایک اُستاد لکھتے ہیں :-

"ہمارے ....کے اسکول میں لڑکوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ہے جو کچھ مہینوں سے اپنے ہاتھ کا کتا ہوا سوت ... اکثر پابندی سے پیرغا سنگھ بھیجتی ہے اور وہ یہ خدمت محض آپ کی ذات سے انتہائی محبت کی بنا پر کرتی ہے۔ اگر کوئی شخص ان سے پوچھتا ہے کہ تم یہ سوت کیوں کاتتے ہو تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ "مہاتماجی کا حکم ہے، اسے تو ماننا ہی پڑے گا" میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی ذہنیت چھوٹے بچوں میں ہر صورت سے پیدا کرنی چاہیئے۔ غلامانہ ذہنیت اس قسم کی بطل پرستی یا انتہائی فرماں پذیری سے جدا ہے۔ یہ لڑکے اپنی حوصلہ افزائی کے لیے آپ کے ہاتھ سے لکھا ہوا کوئی پیغام چاہتے ہیں، مجھے امید ہے کہ ان کی درخواست قبول ہوگی"

مجھے نہیں معلوم کہ اس خط سے جس قسم کی ذہنیت کا ثبوت ملتا ہے، وہ بطل پرستی ہے یا کور پرستی۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ بعض وقت اتباع بغیر اسباب

معلوم کیے ضروری ہوتی ہے۔ یہ ایک سپاہی کی خصوصیت ہے اور کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کی بہت بڑی تعداد میں یہ خوبی نہ پیدا ہو لیکن کسی منظم سوسائٹی میں ایسی اتباع کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں اور بہت کم ہونے چاہئیں۔ ایک اسکول میں لڑکوں کے لیے سب سے بڑی برائی یہ ہو سکتی ہے کہ استاد جو بات کہے وہ آنکھ بند کر کے اسے مان لیں۔ برعکس اس کے اگر استاد اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کی قوت استدلال کو بڑھانا چاہتے ہیں، تو انھیں ہمیشہ ان کی قوت استدلال سے کام لیتے رہنا ہوگا اور انھیں خود سوچنے کا موقع دینا ہوگا۔ اعتقاد اس وقت پیدا ہوتا ہے جب عقل اپنا کام بند کر دیتی ہے۔ لیکن دنیا میں بہت کم کام ایسے ہیں جن کے لئے معقول وجہ نہیں مل سکتی ہے۔ ایک استاد اپنے شاگردوں سے ایسی بات سننا گوارا نہیں کرے گا جن سے یہ پوچھا جائے کہ کسی بستی میں کنویں کا پانی اگر خراب ہو جائے تو پینے کا پانی اُبال کر اور نتھار کر کیوں پینا چاہیئے اور وہ یہ جواب دیں کہ یہ ایک مہاتما کا حکم ہے اور اس صورت میں ایسا جواب دینا غلط ہے تو کتائی کے معاملہ میں بھی یہ جواب تسلیم کرنا قطعی غلطی ہوگی۔ جب میں اس اسکول میں اپنی مہاتمائی سے اتار دیا جاؤں گا، جیسا کہ بعض گھروں میں میں اتار دیا گیا ہوں (اس لیے کہ بعض نامہ نگاروں نے ازراہ عنایت مجھے اطلاع دی ہے کہ ایسا ہوا ہے) تو مجھے اندیشہ ہے کہ چرخا ختم ہو جائیگا۔ یقیناً (بعض) وقت مقصد انسان سے بڑا ہوتا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ چرخا میری ذات سے بڑا ہے۔

مجھے اس وقت بہت افسوس ہوگا جب میری پرستش میری کسی احمقانہ غلطی سے یا لوگوں کے میری کسی بات پر خفا ہو جانے

سے ختم ہو جائے گی، تو پھر چرخے کے کام کو بہت نقصان پہنچے گا۔ اس لئے یہ بہت اچھا ہے کہ طلبا اُن تمام باتوں میں دلیل سے کام لیں جو دلیل کے قابل ہیں۔ چرخا یقیناً ایک ایسی چیز ہے جس کے متعلق دلیل سے کام لیا جا سکتا ہے اس کے ساتھ میری رائے ہیں ہندوستان کے پورے عوام کا مفاد وابستہ ہے۔ اس لئے طلبا کو عوام کی انتہائی مفلسی کا کچھ حال جاننا چاہیئے۔ انھیں بعض گاؤں کا جو غریبی سے تباہ ہو رہے ہیں، خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنا چاہیئے۔ انھیں ہندوستان کی آبادی کا حال بھی معلوم ہونا چاہیئے۔ انھیں اس جزیرہ نما کی وسعت بھی معلوم ہونی چاہیئے! اور انھیں یہ بھی جاننا چاہیئے کہ وہ کون سی چیز ہے جو یہاں کے لاکھوں آدمی کر کے اپنے قلیل وسائل کو بڑھا سکتے ہیں۔ انھیں اپنے ملک کے غربا اور نچلے طبقہ کے لوگوں کا ساتھ دینے کے لئے سکھانا چاہیئے۔ انھیں یہ بھی تعلیم دینی چاہیئے کہ جو غریبوں کو نہیں میسر آ سکتا ہے، وہ انھیں خود بھی حتی الامکان نہیں لینا چاہیئے۔ پھر وہ کتائی کی خوبیوں کو سمجھیں گے۔ پھر یہ ہر دھکے سے محفوظ رہے گی، یہاں تک کہ خود میرے بارے میں بھی اگر کبھی ان کی آنکھ کھلے۔ چرخے کا مقصد اتنا بڑا اور اتنا بلند ہے کہ وہ محض لطل پرستی پر ٹھہر نہیں سکتا ہے۔ یہ سائنٹیفک معاشی حل چاہتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ ہم لوگوں میں اس قسم کی اندھی لطل پرستی کا بہت رواج ہے، جیسا کہ اس مراسلہ نگار نے بیان کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ قومی مدرسوں کے استاد ان باتوں کا خیال رکھیں گے جن کا

میں نے ذکر کیا ہے اور اپنے لڑکوں کو اپنے اعمال کی بنیاد ایسے لوگوں کے بیانات پر بغیر جانچ پڑتال کے نہ رکھنے دیں گے جو بڑے سمجھے جاتے ہیں۔

(ینگ انڈیا۔ ۲۴ر اپریل ۱۹۲۶ء)

کھادی سائنس کیا ہے؟

میں نے اکثر یہ کہا ہے کہ اگر کھادی معاشی اعتبار سے درست ہے تو یہ ایک سائنس اور رومان دونوں ہے۔ مجھے خیال آتا ہے کہ ایک کتاب کا نام ہے، "کپاس کا رومان" جس میں کپاس کی اصل بتائی گئی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کی دریافت نے کس طرح تہذیب کا رُخ بدل دیا۔ اس طرح ہر چیز سائنس اور رومان دونوں ہوسکتی ہے۔ اگر اس کے پیچھے سائنسی اور رومانی اسپرٹ ہو۔

بعض لوگ کھادی کا مذاق اُڑاتے ہیں اور جب کوئی کتائی کا ذکر کرتا ہے تو سخت بے صبری اور ناگواری کا اظہار کرتے ہیں، لیکن اگر تم اسے ہندوستان کی عام کاہلی، بیکاری اور غریبی دور کرنے کا ذریعہ سمجھنے لگو تو پھر یہ ناگواری اور مذاق کی چیز نہیں رہتی ہے۔ اسے واقعتاً تینوں بیماریوں کا علاج ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب سے دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ایمانداری کے ساتھ اس طاقت کا ذکر کرنا ہی کافی ہے۔ لیکن تم کھادی میں یہ طاقت منسوب

نہیں کر سکتے اور پھر اس ضرورت مند عام آدمی کی طرح اسے سمجھنے لگو جو بنولے نکالتا ہے، دُھنکتا ہے، کاتتا ہے یا بنتا ہے، اس لیے کہ اسے اپنی روزی اس سے پیدا کرنی ہے۔ اس کی اس طاقت میں ایمان رکھنے والا اپنا کام ایمان داری، سمجھ بوجھ، قاعدے کے ساتھ اور سائینٹفک اسپرٹ میں کرے گا۔ وہ کسی بات کو تسلیم شدہ نہیں سمجھے گا۔ ہر چیز کی ناپ تول کرے گا، تمام واقعات اور اعداد کی چھان بین کرے گا۔ شکست سے گھبرائے گا نہیں، چھوٹی کامیابیوں پر بہت خوش نہیں ہوگا اور جب تک منزلِ مقصود حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک مطمئن نہ ہوگا۔ آنجہانی مگن لال شکل گاندھی کھادی کی اس طاقت میں زندہ اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کے لیے یہ ایک سرور افزا روہان تھا اور انھوں نے کھادی کی سائنس کی مبادیات لکھیں۔ ان کے لئے کوئی تفصیل دُور از کار نہ تھی اور نہ کوئی اسکیم ضرورت سے زیادہ بڑی۔ رچرڈ گریگ میں بھی یہی جذبہ تھا اور انھوں نے اس میں ایک عالمگیر معنی پہنائے ہیں۔ ان کی تصنیف "ہندوستان کی معاشی ترقی کا فلسفہ"[1] اس تحریک میں ایک نمایاں حصہ رکھتی ہے۔ وہ چرخے کو عدم تشدد کا سب سے بڑا نشان سمجھتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا، لیکن اپنے اعتقاد کی وجہ سے مگن لال گاندھی اور رچرڈ گریگ کو وہی خوشی اور مسرت ملتی تھی جو کسی سرور افزا موضوع سے مل سکتی ہے۔ ایک سائنس کو اگر سائنس ہونا ہے، تو اسے جسم، دماغ اور روح سب کی پوری تشفی کرنے کے قابل بننا ہے۔ منتشککین کو یہ سنکر تعجب ہوتا ہے

[1] یہ کتاب نوجیون ٹرسٹ، احمد آباد سے چھپی ہے۔

کہ کھادی کس طرح تشفی بخش ہو سکتی ہے یا دوسرے لفظوں میں جب کھادی کی سائنس، کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میرا کیا مطلب ہوتا ہے۔ میں اس کا جواب اس سے بہتر اور کسی طریقے سے نہیں دے سکتا کہ میں یہاں ان سوالات کو نقل کر دوں جو میں نے ایک کھادی کے کام کرنے والے کے لیے جلدی میں تیار کیے تھے، جس نے میرے سامنے امتحان دینا چاہا تھا۔ یہ سوالات کسی منطقی ترتیب کے ساتھ تیار نہیں کیے گئے ہیں اور نہ یہ بہت جامع ہیں۔ ان کی دوبارہ ترتیب بھی ہو سکتی ہے اور اس میں اضافہ اور ترمیم بھی ممکن ہے۔ لیکن میں ان کا یہاں اصل ہندی سے ترجمہ پیش کر رہا ہوں جو ایک دوست نے میرے لیے کر دیا ہے۔

حصہ اوّل

۱۔ ہندوستان میں کتنی کپاس ہوتی ہے اور کہاں کہاں؟ اس کی مختلف قسموں کے نام بتاؤ۔ کتنی مقدار ہندوستان میں رہ جاتی ہے؟ کتنی ہاتھ سے کاتی جاتی ہے؟ کتنی انگلستان اور دوسرے ملکوں کو بھیجی جاتی ہے؟

۲۔ (ا) کتنی مقدار کپڑے کی ہندوستان کی ملوں میں تیار ہوتی ہے؟ اس میں سے کتنا ہندوستان میں خرچ ہوتا ہے اور کتنا باہر جاتا ہے؟

(ب) مندرجہ بالا مقدار میں کتنا سدیشی ملوں کے سوت سے تیار ہوتا ہے اور کتنا بدیشی ملوں کے سوت سے؟ (ج) کتنا کپڑا باہر سے آتا ہے۔؟

(د) کتنی کھادی ہندوستان میں تیار ہوتی ہے؟

ھدایت:۔ اپنے جوابات مربع گزوں اور روپیوں کی شکل میں دیجیے۔

۳۔ اوپر تین قسم کے کپڑوں کا جو ذکر آیا ہے ان کے فائدے اور نقصانات سے بحث کیجیے۔

۴۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کھادی مہنگی، خراب اور کمزور ہوتی ہے۔ ان باتوں کا جواب دیجئے اور ان میں سے اگر کسی کی کوئی بنیاد ہے، تو اس کا حل بتائیے۔

۵۔ کھادی کے کام میں (چرخا سنگھ میں) کتنے کاتنے والے لگے ہوئے ہیں؟ ان سالوں میں انھوں نے کتنا کمایا ہے؟ ملوں میں کام کرنے والوں کی تعداد بتائیے اور ان کی کل سالانہ آمدنی لکھیے۔

۶۔ (ا) چرخا سنگھ کا کام کیسے چلتا ہے؟ وہ کتنا انتظام پر صرف کرتے ہیں؟
(ب) ایک سودیشی مل چلانے میں کتنا عملہ لگتا ہے اور مل کے مزدوروں کے مقابلہ میں یہ لوگ اجرت کی کیا نسبت پاتے ہیں؟

۷۔ (ا) آپ کی رائے میں زندگی کی ضرورتوں میں کپڑے کا کیا مقام ہے؟
(ب) زندگی کی خاص خاص ضرورتیں بتائیے اور ان کی اضافی فی صد کیا ہے؟

۸۔ اگر ہندوستان میں ہر شخص مل کا کپڑا پہننا چھوڑ دے، خواہ بدیشی ملیں ہوں یا ہندوستانی، تو کتنا روپیہ ہندوستان میں بچے گا اور وہ کس کے پاس جائے گا؟

۹۔ ہندوستان میں جو کپڑا باہر سے آتا ہے، اس کے عوض ہندوستان باہر کیا بھیجتا ہے؟ اس مبادلے میں ہندوستان کو کیا نقصان ہوتا ہے؟

۱۰۔ آبادی کا کتنا فیصد کپڑا خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے؟

۱۱۔ ان لوگوں کی کیا فیصد ہے جنھیں اپنا کپڑا خود بنانے کی فرصت ہے؟ اور کیسے؟

۱۲۔ "کھادی پورا معاشی توازن قائم رکھے گی۔" کیا یہ بیان واقعی صحیح ہے؟ اپنے جواب کے وجوہ لکھیے۔

۱۳۔ اگر کھادی عام کردی جائے تو اس کا اثر کاروبار، پیشہ اور آمد و رفت پر کیا پڑے گا اور کس طریقہ سے؟

۱۴۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ آگے ۵۰ سال تک کھادی عام نہیں ہوتی ہے، لوگوں کی معاشی حالت پر اس کا کیا اثر ممکن ہوگا؟

حصّہ دوم

۱۔ ہندوستان کے مروّجہ چرخوں کا حال لکھو۔ ان میں کون سب سے بہتر ہے؟ کسی چار چرخوں کی تصویر بناؤ اور اس کے ہر ایک حصّہ کی صحیح پیمائش دو۔ ان میں کون سی لکڑی استعمال ہوتی ہے؟ تکلے کی لمبائی اور گولائی کیا ہوتی ہے؟ اور مال کی موٹائی کیا ہوتی ہے؟

۲۔ مروّجہ چرخوں کا یرودا چرخہ سے رفتار، قیمت اور عام فائدوں کے لحاظ سے مقابلہ کیجیے۔

۳۔ آپ کپاس کی قسم، سوت کی مضبوطی، اور سوت کا نمبر کیسے معلوم کریں گے؟

۴۔ آپ جو سوت کاتتے ہیں، اس کی مضبوطی اور نمبر کیا ہوتا ہے؟ آپ کی رفتار تکلی اور چرخے پر کیا ہے؟ آپ کون سا چرخہ عام طور پر استعمال کرتے ہیں؟

۵۔ ایک مرد یا عورت کو اپنے لیے کتنے گز کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے؟ ان کے بنانے کے لیے کتنا سوت چاہیے اور اتنے سوت کاتنے کے لیے کتنا وقت چاہیے؟۔

۶۔ ایک خاندان کے لیے کتنے سوت کی ضرورت ہوتی ہے؟ اس کے لیے کتنی کپاس چاہیے؟ اتنی کپاس پیدا کرنے کے لیے کتنی زمین کی ضرورت ہوگی؟ (ایک خاندان سے مراد باپ، ماں اور تین بچے ہیں۔ بچوں میں ایک لڑکی اور دو لڑکے جن کی عمریں ۷، ۵ اور ۳ سال ہوں گی)۔

۷۔ مروّجہ دھنکی کا نئی دھنکیوں سے مقابلہ کیجیے۔ آپ فی گھنٹہ کتنا دھنتے ہیں؟ آپ کیسے بتا سکتے ہیں کہ روئی دھنی گئی ہے یا نہیں؟ ایک پونڈ پونی

بنانے میں آپ کا کتنا وقت لگتا ہے؟ ایک تولہ روئی میں آپ کتنی پونیاں بنا سکتے ہیں؟

۸۔ ایک گھنٹہ میں آپ کتنی روئی تن سکتے ہیں؟ ہاتھ سے تنائی اور مشین کا مقابلہ کیجیے اور ہر ایک کی اچھائیاں اور برائیاں بتائیے۔ آج کل کی ہاتھ سے تنائی کی مشین کا حال لکھیے اور اس کی تصویر بنائیے۔

۹۔ ایک گز کپڑا بننے میں جس کا عرض ۳۶ انچ ہو، ۲۰ نمبر سوت کی کتنی لمبائی درکار ہوگی؟

۱۰۔ کھڈی اور شٹل کا آپس میں مقابلہ کیجیے۔

(ہریجن — ۱۶ جنوری ۱۹۴۲ء)

اسکول میں کھادی کا کام

خاص کر آنجہانی شری ریوا شنکر جگجیون بھاویری کی کوششوں اور شری جمنا داس گاندھی کی مدد سے ایک نیشنل اسکول سولہ برس ہوئے راجکوٹ میں کھولا گیا۔ اس کی سولھویں سالگرہ گزشتہ ماہ شری نرہری پاریکھ کی صدارت میں منائی گئی۔ اسکول تین حصوں میں تقسیم ہے: ونے مندر، کمار مندر، اور بال مندر۔ کل اسکول میں ۱۹۰ طالب علم ہیں: ۱۱۰ لڑکے اور ۸۰ لڑکیاں۔ شری نرائن داس گاندھی کی رپورٹ سے اہم حصے نیچے دیے جاتے ہیں:۔

"کھادی ایک صنعت ہے جو کروڑوں آدمیوں کو روزی دینے میں مدد دے سکتی ہے۔ پیشہ کی تربیت میں اسے جو اہم مقام حاصل ہے، اسکول کی تعلیم کا ایک حصہ یقیناً لڑکوں کو ہمارے ملک کے کروڑوں غریبوں کا خیال دلانے اور ان کے ساتھ اپنا تعلق جوڑنے کے لیے کافی ہے۔ اس کہنے کی ضرورت

نہیں کہ یہ خود ایک بیش قیمت تعلیم ہے۔

„ لڑکے اس کام میں بڑی دل چسپی لے رہے ہیں۔ ایک طالب علم نے گرمی کی چھٹیوں میں اتنا سوت کاتا کہ اس سے ۴۰ مربع گز کھادی تیار ہو سکی۔ اس لڑکے نے چرخا دوادشی[1] کے موقع پر اتنا سوت کاتا کہ اس سے ۷۴ مربع گز کھادی تیار ہوئی۔ اس طرح اس نے سال کے دوران میں اتنا سوت کاتا کہ ۱۵۰ مربع گز کپڑا تیار ہوا۔ یہ یقیناً بہت بڑا کارنامہ سمجھا جائے گا اور لڑکوں نے مقابلۃً کم کیا ہے، لیکن بہ حیثیت مجموعی جو کچھ کام ہوا ہے وہ بہت قابلِ اطمینان ہے۔"

"کھادی کے علاوہ اس اسکول میں اور بھی بہت سے کام چلتے ہیں:۔

سلائی کی کلاس:۔ یہ اگرچہ اصل میں اسکول کے لڑکوں کے لیے ہے، پھر بھی اس میں باہر سے بھی لوگ سیکھنے آتے ہیں۔ دو طالب علموں نے اپنا کورس پورا کر لیا ہے اور یہ کام بطور پیشہ کے شروع کر دیا ہے۔ ایک استاد نے خاص طور پر یہ کام سیکھ لیا ہے۔

بنائی کا شعبہ:۔ ایک بنکر کا خاندان اسکول میں بنائی سکھانے کے لیے رہنے لگا ہے۔ گزشتہ ڈھائی سال میں ۲،۶۰۰ مربع گز کھادی بنی جا چکی ہے۔

زراعت:۔ اسکول کی زمین پر کپاس بوئی گئی اور لڑکے کپاس چنتے تھے۔"

"اسکول میں ۱۳ ہریجن لڑکے پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ پانچ ہریجن جو میونسپلٹی میں ملازم ہیں، صبح کے وقت اپنا کام ختم کرنے کے بعد دوپہر میں چھ گھنٹے اسکول میں کتائی کا کام کرتے ہیں۔ اس سے انھیں تھوڑی اوپر کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ انھوں نے معمولی روئی سے ۱۲ نمبر کا سوت کاتنا

---

[1] جس دن ہندو جنتری کے لحاظ سے گاندھی جی کی سالگرہ منائی جاتی ہے۔

شروع کر دیا ہے یہ کھادی کے کام میں ایک نیا تجربہ سمجھا جائے گا۔ ہم نے ہریجنوں کے لیے اسکول میں غلہ کی ایک دوکان بھی کھولی ہے۔

"گاؤں کی پیداشدہ چیزوں کی دوکان:۔ ہم نے صحت بخش کھانے پینے کی چیزیں مہیا کرنے کا بھی انتظام کیا ہے، مثلاً ہاتھ کا پسا ہوا آٹا، ہاتھ کا کُٹا چاول دالیں، خالص گھی، گھانی کا تیل جس کے لئے ہم نے اسکول میں دو گھانیاں لگائی ہیں

ڈیری :۔ ابھی حال میں ہم نے اپنی حیثیت ڈیری اسکول میں منتقل کر دی ہے اور کوشش کی جائے گی کہ اسے کل ہند گئو سیوا سنگھ کی پالیسی کے مطابق چلایا جائے۔"

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اسکول نے لڑکوں کے اندر کھادی سے اس قدر دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ یہ بھی بہت اہم بات ہے کہ اسکول میں کپاس بوئی جاتی ہے، ڈیری کا کام ہوتا ہے اور متوازن غذا کے لیے ضروری چیزوں کا انتظام کیا ہے اگر یہ سب کام ٹکنیک طور پر کیے جائیں اور ان کی سائنس لڑکوں کو اچھی طرح سمجھا دی جائے تو اس سے یقیناً طلبا کی ذہنی نشو ونما پر بہت اثر پڑیگا۔ یہ ایک دھوکا ہے کہ اگر لڑکوں کے دماغ میں ایسی چیزیں زبردستی بھری جائیں جن کا زندگی میں کوئی کام نہ ہو تو اس سے ان کے ذہن کی ترقی ہو گی۔ یہ ایک ذہنی مشق تو ہو سکتی ہے لیکن ذہنی نشو ونما نہیں ہو سکتی اس لئے کہ اس سے ذہن کو اپنی قوت امتیاز سے کام کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ لیکن جہاں ایک لڑکے یا لڑکی کو کسی نہ کسی قسم کا ہاتھ کا کام کرنا پڑتا ہے اور یہ اسے میکانکی طور پر نہیں بلکہ سائنٹفک طور پر سکھایا جاتا ہے، تو اس کا ذہن از خود نشو ونما پاتا ہے، بچہ اپنی قوتوں سے باخبر ہو جاتا ہے اس میں عزت نفس آتی ہے اور اس کے اندر اعتماد نفس پیدا ہوتا ہے۔ (ہریجن بندھو۔ ۲۱ اپریل ۱۹۴۷ء)

ایک وزیر کا خواب

"اگر آپ صوبائی حکومت اور وہاں کے لوگوں کو یہ پیغام یا ہدایت دے سکیں

کہ تمام اسکولوں میں لڑکے اور لڑکیوں کے لئے بُنائی اور کتائی لازم کی جاتی ہو تو مجھے کوئی شبہ نہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں تمام لڑکے خود اپنے ہاتھ سے بُنا ہوا کپڑا پہننے لگیں گے، یہ پہلا قدم ہوگا مجھے آپ کے نصب العین پر پورا اعتقاد ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ ہر گھر اپنا کپڑا آپ بنانے لگے گا اور ہر گاؤں خود کفیل ہو جائے گا نہ صرف کپڑے کے معاملہ میں بلکہ آپ کی دیہی صنعتوں کی اسکیم اور تعلیم کی اسکیم کے تحت ہر ضرورت کی چیز میں۔ مجھے آپ کی طرح پورا یقین ہو کہ اس ملک میں حقیقی سوراج صرف اسی وقت قایم ہو سکتا ہو جبکہ گاؤں کا بجٹ صوبائی حکومت ہند کے بجٹوں کے ساتھ ساتھ متوازن ہو جائے جو عام طور سے مصنوعی طریقوں اور کرنسی یونٹ سے برابر سرابر کیا جاتا ہے۔"

یہ ایک کانگریسی وزیر کی تحریر ہے، اگر مجھ میں ایک مطلق العنان کے اختیارات ہوتے تو میں یقیناً کتائی کو کم سے کم تمام پرائمری اسکولوں میں لازم کر دیتا۔ ایک وزیر کو اگر یہ اعتقاد ہے تو اسے خود کرنا چاہیئے۔ بہت سی بیکار چیزیں ہمارے اسکولوں میں لازمی کی جاتی ہیں تو پھر یہ مفید ترین فن کیوں نہ لازم کیا جائے۔ لیکن ایک جمہوری نظام میں کوئی چیز لازم نہیں کی جا سکتی ہے، جب تک کہ وہ عام طور پر قبول نہ ہو۔ اس لحاظ سے جمہوریت میں جبر برائے نام ہے۔ یہ کاہلی کو تو دور کر دیتا ہے لیکن ارادے کو مجبور نہیں کرتا۔ اس طرح کا جبر ایک تعلیمی عمل ہو۔ میں ابتداءً اس سے ہلکا راستہ تجویز کروں گا۔ سب سے اچھے کاتنے والے کو اچھے انعامات دیئے جائیں۔ اس طرح کے مقابلے سے بہتوں کو ترغیب ہو گی، اگرچہ سب اس میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ کوئی طریقہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اسکول کے مدرسوں کا اس پر اعتقاد نہ ہو۔ اگر صوبائی حکومتیں بنیادی تعلیم کو اختیار کر لیتی ہیں تو کتائی اور اس قسم کے دوسرے کام نہ صرف نصاب کا جزو ہو جائیں گے بلکہ یہ تعلیم کا ذریعہ ہوں گے اگر بنیادی تعلیم جڑ پکڑ لیتی ہے تو کھادی یقیناً ہمارے اس بدنصیب ملک میں عام اور نسبتاً سستی ہو جائے گی۔

(ہریجن — ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۹ء)

چھٹا باب

متفرق مضامین

درسی کتابیں

(۱)

اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں معلوم ہوتا کہ سرکاری مدرسوں میں جو کتابیں استعمال کی جاتی ہیں، خاص کر بچوں کے لیے، وہ اگر مضر نہیں تو بیشتر بے کار ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ ان میں سے اکثر بہت اچھی لکھی ہوئی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں کے لیے جن کے لیے وہ لکھی گئی ہیں بہترین ہوں، لیکن وہ ہندوستانی لڑکے اور لڑکیوں کے لیے اور ہندوستانی ماحول کے لیے، ہرگز نہیں لکھی گئی ہیں۔ اور وہ اس طرح لکھی گئی ہیں تو وہ عموماً غیر ہضم شدہ نقل کرلیتی ہیں اور لڑکوں کی ضرورتوں کو مشکل سے پورا کرتی ہیں۔ اس ملک میں ضرورتیں بچوں کے صوبوں اور طبقوں کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر ہریجن بچوں کی ضرورتیں کم سے کم ابتدائی منزلوں کے لیے دوسرے بچوں کی ضرورتوں سے مختلف ہیں۔

اس لیے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کتابوں کی ضرورت بچوں سے زیادہ استادوں کے لیے ہونی چاہیے۔ اور ہر استاد کو اگر وہ بچوں کے ساتھ پورا انصاف کرنا چاہتا ہے، تو اسے ہر روز جو مواد مل سکے، بچوں کے لیے بطور سبق تیار کرنا رہے۔ یہ بھی اسے اپنی جماعت کے بچوں کی مخصوص ضرورتوں

کے مطابق کرنا ہے۔

اصل تعلیم یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کی بہترین صلاحیتوں کو ابھارا جائے۔ یہ ان کے دماغوں کے اندر ایسی معلومات بھرنے سے نہیں ہو سکتا جن میں نہ کوئی نظم و ترتیب ہو اور نہ جن میں ان کی خواہش کو دخل ہو۔ یہ ان پر ایک ایسا بوجھ ہو جاتا ہے جو ان کی تمام اُپج کو ختم کر دیتا ہے اور انھیں ایک مشین بنا دیتا ہے۔ اگر ہم خود اس نظام کا شکار نہ ہوتے تو ہم نے خود اس نقصان کو محسوس کر لیا ہوتا جو عام تعلیم دینے کے جدید طریقوں سے بالخصوص ہندوستان جیسے ملک میں ہوا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے اداروں نے اپنی اپنی درسی کتابیں تیار کرنے کی کوششیں کی ہیں اور اس میں انھیں کم و بیش کامیابی بھی ہوئی ہے لیکن میری رائے میں ان سے ملک کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔

میں نے یہاں جن خیالات کے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، میں ان کے بالکل نئے ہونے کا دعویٰ نہیں کر رہا ہوں۔ میں یہاں پر ہریجن اسکولوں کے اُستادوں اور منتظموں کے لیے پیش کر رہا ہوں جن کے سامنے بہت بڑا مسئلہ ہے۔ انھیں صرف اس میکانکی کام کے لیے مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے کہ وہ ان بچوں کو جو ان کے زیرِ نگرانی ہیں، بے مقصد طور پر طوطے کی طرح کتابیں پڑھنا سکھا دیں، جو انھیں اِدھر اُدھر سے ہاتھ آگئی ہیں۔ انھوں نے ایک بڑے کام کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے جسے انھیں ہمت سے، سمجھ بوجھ سے اور ایمانداری سے ادا کرنی ہے۔

یہ کام مشکل ہے لیکن اتنا مشکل نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے، بشرطیکہ استاد یا منیجر پوری تندہی سے یہ کام ہاتھ میں لیں۔ اگر وہ اپنے شاگردوں

کے بمنزلہ والدین بھی ہوجائیں تو انھیں از خود معلوم ہوجائے گا کہ بچے کیا چاہتے ہیں اور وہی وہ انھیں مہیا کرنے لگیں گے۔ اگر استاد کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے تو وہ اسے خود حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، اور یہ دیکھ کر کہ اس نے اس خیال سے لڑکے اور لڑکیوں کو تعلیم دینا شروع کر دیا ہے کہ وہ ان کی ضروریات کے مطابق ہو تو اس کے لیے ایک ہریجن بچوں کے استاد یا کسی اور استاد میں کسی غیر معمولی قابلیت یا خارجی علم کی ضرورت نہ ہوگی۔

اور اگر یہ بات یاد رکھی جائے کہ ہر طرح کی تعلیم کا اصل مقصد بچوں کی سیرت کی تربیت ہے، یا ہونا چاہیے، تو ایک استاد جو خود صاحب سیرت ہوگا، اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

(ہریجن، یکم دسمبر ۱۹۳۳ء)

(۲)

درسی کتابیں

درسی کتابوں کے بار بار بدلنے کا مرض تعلیمی نقطۂ نظر سے مشکل ایک صحت مندانہ علامت کہی جا سکتی ہے۔ اگر درسی کتابیں ہی تعلیم کا ایک ذریعہ بنالی جائیں تو پھر استاد کے زندہ لفظوں کی کوئی قدر نہ ہوگی۔ ایک استاد جو درسی کتابوں سے پڑھاتا ہے، وہ اپنے شاگردوں میں کوئی نئی بات نہیں پیدا کرتا ہے۔ وہ خود درسی کتابوں کا غلام بن جاتا ہے اور نئے ہونے کا پھر کوئی موقع نہیں رہ جاتا۔ اس لئے اس سے یہ معلوم ہوا کہ جتنی ہی کم درسی کتابیں ہوں، اسی قدر استاد اور اس کے شاگردوں

کے لئے بہتر ہے۔ درسی کتابیں ایک تجارت کا بڑا ذریعہ بھی بن گئی ہیں۔ مصنف اور ناشر کتاب لکھنے اور شایع کرنے کو روپیہ کمانے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، انھیں کتابوں کے بار بار بدلتے رہنے ہی میں فائدہ ہے۔ بہت سی صورتوں میں استاد اور ممتحن خود درسی کتابوں کے مصنف ہوتے ہیں۔ پھر اس میں ان کا قدرتی فائدہ ہے کہ ان کی کتابیں بکتی رہیں۔ کتابوں کے منتخب کرنے کے بورڈ میں پھر ایسے اشخاص کا ہونا ضروری ہے، اور اس طرح دونوں میں ایک ناجائز تعلق قایم ہو جاتا ہے۔ والدین کے لئے ہر سال نئی کتابیں خریدنے کے لئے روپیہ مہیا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک بڑا دردناک منظر ہوتا ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں کتابوں سے لدی ہوئی چلی جا رہی ہیں، جنہیں وہ مشکل سے اٹھا سکتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ پورے نظام پر نظرثانی کی جائے۔ کاروباری ذہنیت کو بالکل خارج کر دینا چاہیئے۔ اور اس مسئلے پر خالص طلباء کے مفاد کے خیال سے غور کرنا چاہیئے۔ اس صورت میں غالباً یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ۷۵ فیصدی درسی کتابیں ایسی ہیں جنہیں ردّی کی ٹوکری میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اگر میرا بس چلتا تو میں بچوں کے لئے درسی کتابوں کی بجائے استادوں کے لیے بطور امدادی کتابوں کے رکھتا۔

ایسی درسی کتابیں جو بچوں کے لئے بہت ہی ضروری سمجھی جاتیں، وہ ان میں کئی سال تک رائج رکھتا تاکہ ان کی قیمتیں متوسط طبقہ کے گھرانوں کے لئے آسانی سے قابلِ برداشت ہوں۔ سب سے پہلا قدم اس سلسلہ میں غالباً ریاست کے لئے اٹھانا ہے کہ وہ درسی کتابوں کی ذمہ داری اور ان کی طباعت و اشاعت کا کام اپنے ذمہ لے۔

اس سے ان کے غیر ضروری طور پر بار بار بدلنے کی روک بھی ہو جائے گی۔

(ہریجن — ۹ ستمبر ۱۹۳۹ء)

ایک کُتب خانہ کا مقصد

(ستیاگرہ آشرم، احمد آباد میں کتابوں کے میوزیم کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا، اس موقع پر گاندھی جی نے ایک تقریر کی تھی۔ یہ حصّہ اس سے لیا گیا ہے۔ (مدیر))

میرے ذہن میں کتب خانوں سے متعلق کچھ خیالات ہیں، یعنی انھیں کیسا ہونا چاہیئے اور انھیں کیا کرنا چاہیئے۔ میں ان خیالات کو آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ آپ کو کتب خانہ کی عمارت اس طرح بنانی چاہیئے کہ کتب خانہ میں اضافہ کے ساتھ ساتھ عمارت میں بھی اس طرح اضافہ ہوتا رہے کہ اس کے تناسب میں فرق نہ آئے۔ بعد کے اضافے ایسے نہ معلوم ہوں کہ اصل عمارت میں اوپر سے کچھ بڑھا دیا گیا ہے۔ اس میں کبھی کبھار لیکچروں کے لئے، اور ریسرچ کرنے والے طلبا اور اساتذہ کے لئے بھی انتظام ہونا چاہیئے جو یہاں آکر سکون کے ساتھ اپنا کام کر سکیں۔ ہمیں اس کتب خانہ کو دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے بہتر کتب خانہ بنانا ہے۔ اگر ہم میں ارادہ ہو تو خدا اس کے کرنے کی ہمیں توفیق بھی دے گا۔

کاکا صاحب کا مشورہ ہے کہ وِدیاپیٹھ میں کتابوں کا جو ذخیرہ

ہے، وہ بھی یہیں رکھنا چاہیئے۔ گجرات میں آرٹ کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بھدرا کی مسجد میں پتھروں کے اندر جو جالی کا کام ہے، اس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں اسی طرح احمد آباد کی سوزن کاری کا کام بھی شاید بے مثال ہے۔ احمد آباد کے معماروں کے پتھر کے کام کی نزاکت پر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ میں نے انھیں تنگ، تاریک جھونپڑوں میں رہتے دیکھا ہے۔ فنکاروں کو کسی ہمت افزائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی ہمیں ایک اور عطیہ دینے والا مل جائے جو ہمیں پچاس ہزار روپے ایک میوزیم کے لیئے دے سکے تو ہم اسی عمارت میں ایک میوزیم بھی بنا سکتے ہیں۔ ہمیں اس طرح کام کرنا ہے کہ کتب خانہ روز بروز ترقی کرتا جائے۔ بہتر ہوگا اگر ہمیں کوئی ایک یا دو آدمی ایسے مل جائیں جو اس کے لیے اپنا بیشتر وقت دے سکیں۔ لائبریرین کے لیے کوئی ایسا آدمی منتخب نہ کرو جو روپیہ پیسہ کی ذہنیت رکھنے والا کاروباری آدمی ہو۔ وہ صرف کتابوں کو محفوظ اور اچھی حالت میں رکھے گا۔ بلکہ ایسا کوئی شخص انتخاب کرو جو مختلف کتابوں کی قدر جانتا ہو اور انھیں چن سکے۔ اگر کوئی شخص اس کے لیئے اپنی خدمات مفت دینے والا نہ ملے تو پھر آپ کو ایک اچھی تنخواہ کے لیئے تیار رہنا چاہیئے اور واقعی ایک تربیت یافتہ آدمی مقرر کرنا چاہیئے۔ ہریجنوں کو بغیر کسی فیس کے کتب خانہ کے استعمال کی اجازت ہونی چاہیئے۔ اور اگر ان سے کتابیں خراب ہو جائیں، پھٹ جائیں یا چوری بھی ہو جائیں تو اس کا نقصان خود کتب خانہ کو اٹھانا چاہیئے۔ ہریجن، سب سے غریب ہوتے ہیں اور ان کے لیے خاص رعایت ہونی چاہیئے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ رعایت آپ تمام غریب لوگوں کے لیئے کر سکتے ہیں۔ اس سے اس ادارے کی

شان اور بڑھے گی۔

میں بھی اس بات کو دہرانا چاہتا ہوں جو بھائی رسک لال نے کہی ہے، یعنی یہ کہ کتب خانہ کی مجلس انتظامیہ کو بڑی احتیاط کے ساتھ علماء اور فضلاء کی جماعت سے منتخب کرنا چاہیئے تاکہ کتب خانہ زندہ اور ترقی کرتا رہے۔ یہ مت سمجھئے کہ یہ جماعت عملی سوجھ بوجھ رکھنے والوں ہی پر مشتمل ہونی چاہیئے، اس لیے کہ علماء جانتے ہیں کہ کتب خانہ کو کیسا ہونا چاہیئے اور یہ کیسے روشن ہو سکتا ہے، کارنیگی نے کتب خانوں کو بڑے بڑے عطیے دیئے ہیں۔ انھوں نے جو شرطیں اپنے عطیے کے ساتھ لگائیں، وہ بیشتر علماء نے منظور کیں، سوائے اسکاٹ لینڈ کے علماء کے جنھوں نے کارنیگی سے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ اپنی شرطوں پر اصرار کرتے ہیں تو وہ عطیہ قبول نہیں کریں گے۔ انھوں نے پوچھا کہ آپ کو کیا معلوم کہ کتب خانہ کے لیے کون سی کتابیں کار آمد ہوں گی؟ فنکار اپنا فن نہیں بیچتے ہیں گجرات میں بیش قیمت کتابوں کے بہت بڑے بڑے ذخیرے ہیں۔ لیکن وہ بنیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ جینیوں کے پاس پرانی کتابوں کے جن کی بڑی تاریخی اہمیت ہے، نہایت اچھے ذخیرے ہیں، لیکن وہ ریشمی غلافوں میں بند ہی ہوئی بیکار پڑی ہیں۔ میں ان کتابوں کی حالت دیکھ کر رو پڑا ہوں جو ان بنیوں کے ہاتھوں میں بے کار پڑی ہوئی ہیں اور جو سوائے پیسہ پیدا کرنے کے اور کچھ نہیں جانتے۔ میں تو یہاں تک بھی کہوں گا کہ ان کے ہاتھوں خود جین مذہب، پیسے کے پھندے میں پڑ کر بھوکوں مر رہا ہے۔ کیا دھرم کا روپیہ سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کو دھرم، کا ایک وسیلہ ہونا چاہیئے۔

اس لیے میں آپ سے خواہش کروں گا کہ اس کتب خانہ کی مجلسِ انتظامیہ میں لایق اور فاضل علما رہونے چاہییں، کوشش کیجیے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے اور دیکھیے کہ یہ ہو جائے۔

(ہریجن بندھو — یکم اکتوبر ۱۹۳۳ء)

جامعہ ملّیہ اسلامیہ

گاندھی جی نے بالکا آشرم[1] سے اپنی قیام گاہ پر واپس آنے کا ارادہ کر لیا تھا کہ کچھ طلبہ اور اساتذہ جامعہ ملیہ کے آ گئے، اور گاندھی جی سے درخواست کی کہ آپ کسی وقت جامعہ ملیہ تشریف لے آیئے۔

"کسی وقت کا مطلب ہے ابھی"— گاندھی جی نے جواب دیا اور کہا کہ "جب میں اتنی دور سے آیا ہوں تو میں بغیر تمہارے ہاں چلے واپس نہیں جا سکتا"۔ جامعہ ملیہ والے بہت خوش ہوئے۔ وہ ان سے آگے دوڑ کر اپنے ساتھیوں کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے پہنچے اور ہیریکس لیمپ[2]

---

[1] بالکا آشرم اوکھلا موڑ پر ہریجن لڑکیوں کا ایک اقامتی مدرسہ ہے۔ گاندھی جی یہیں کسی تقریب میں آئے ہوئے تھے، جامعہ کی بستی اس جگہ سے کوئی ایک میل کے فاصلہ پر ہے، جہاں سے یہ طلبا اور اساتذہ گاندھی جی کو دیکھنے اور انھیں بلانے کے لیے آئے تھے۔ ح ت ب

[2] اس لیے کہ اس زمانہ میں یہاں بجلی نہیں تھی، یہ بستی ابھی نئی نئی بس رہی تھی۔ ح ت ب

لیکر راستہ دکھانے کے لیے فوراً واپس آئے۔ گاندھی جی کی اس خلاف امید آمد پر تمام بستی ان کے لینے کے لیے امنڈ آئی۔ اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جامعہ کے کام سے باہر گئے ہوئے تھے، لیکن مجیب صاحب مع دوسرے اساتذہ کے موجود تھے۔ جلدی جلدی ہری گھاس کے لان پر دریاں بچھائی گئیں اور نیلگوں آسمان کے نیچے ایک گھر کے افراد کی طرح سب لوگ جمع ہو گئے۔ جامعہ ملیہ جو عدم تعاون کی تحریک کے شروع میں ۱۹۲۰ء میں قایم ہوئی تھی، اس وقت عنقریب اپنی سلور جوبلی منانے جا رہی تھی۔ یہ پودا جسے حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری اور علی برادران نے مل کر لگایا تھا، اب ڈاکٹر ذاکر اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں ایک بڑا درخت بن گیا ہے۔ اس میں ۲۰۰ کے قریب طالب علم پرائمری جماعتوں میں ہیں، ۱۰۰ ثانوی کے شعبہ میں اور ۲۸ کالج میں ہیں۔ ان کے علاوہ ۶۰ استاد ٹریننگ میں ہیں۔ جامعہ کا ایک اسکول اور ایک مکتبہ قرول باغ میں ہے۔

گاندھی جی طلبہ اور اساتذہ کے اس فوری استقبال سے اتنے متاثر ہوئے کہ فرمانے لگے — "میں نے بغیر سابق اطلاع کے آکر اپنا یہ دعویٰ ثابت کر دیا ہے کہ میں بھی اس خاندان کا ایک فرد ہوں۔" اور پھر اس کے بعد یہ کہا کہ "اچھا آپ میں سے کوئی کچھ سوال کرنا چاہے، تو کر سکتا ہے۔"

اس پر ایک لڑکے نے پوچھا کہ "ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟" یہ ایسا سوال تھا جو گاندھی جی کے دل سے لگا ہوا تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ "اس کا طریقہ بہت آسان ہے۔ اگر تمام ہندو پاگل ہو جائیں اور تمہیں گالیاں دینے لگیں تو تم انھیں اپنا حقیقی

بھائی سمجھنے سے نہ ہٹو۔ اور اسی طرح اس کے برعکس بھی۔ کیا یہ ناممکن ہے؟ نہیں، یہ ناممکن نہیں بلکہ ممکن ہے۔ اور جو بات ایک فرد کے معاملہ میں صحیح ہے، وہ سب کے لیے بھی صحیح ہو سکتی ہے۔

"آج تمام ماحول زہر آلود ہو گیا ہے۔ اخبارات کے ذریعہ طرح طرح کی بے بنیاد خبریں پھیلائی جا رہی ہیں اور لوگ انھیں صحیح بھی تسلیم کر لیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں بدگمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہندو اور مسلمان دونوں اپنی انسانیت کو بھول جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ جنگلی درندوں کا سا برتاؤ کرنے لگ جاتے ہیں۔ انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ شرافت سے کام لے، بلا اس خیال کے کہ دوسرا فریق شرافت سے کام لیتا ہے یا نہیں۔ اگر ایک آدمی صرف شرافت کے جواب میں شرافت سے کام لیتا ہے تو یہ سودا ہے۔ چور اور ڈاکو بھی تو ایسا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی بڑی بات نہ ہوئی۔

انسانیت نفع اور نقصان کو نہیں دیکھتی ہے، یہ صرف ایک پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ وہ شرافت سے کام لے۔ اگر تمام ہندو میری بات سنیں، یا تمام مسلمان میری بات پر عمل کریں تو پھر ہندوستان میں ایسا امن و امان قائم ہو جائے جو تلوار اور لاٹھیوں سے کبھی نہ ٹوٹے۔ جب کوئی بدلہ لینے والا یا اشتعال دلانے والا نہ ہوگا تو غنڈے اور بدمعاشوں کے چھرے بھونکنے کا کاروبار بیٹھ جائے گا۔ ایک غیر مرئی (نظر نہ آنے والی) طاقت اس کے اٹھتے ہوئے ہاتھ کو پکڑ لے گی اور وہ اس کی مرضی پر چلنے سے انکار کر دے گا۔

تم آفتاب پر خاک تو ڈال سکتے ہو لیکن اس سے اس کی روشنی

میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ جو سب سے بڑی کرنے کی بات ہے وہ یہ کہ انسان اعتقاد اور صبر سے کام لے۔ خدا نیک ہے اور وہ بدی کو ایک حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔

"اس ادارے کے بنانے میں میرا بھی ہاتھ ہے، اور اس لیے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے اگر میں اپنے دل کی باتیں آپ سے کہوں۔ میں نے یہی باتیں ہندوؤں سے بھی کہی ہیں۔

"کاش آپ ہندوستان کے لیے اور پوری دُنیا کے لیے ایک روشن مثال ہوں۔"

اپنی قیام گاہ پر واپس جانے سے پہلے گاندھی جی نے ڈاکٹر ایم اے انصاری کی قبر کی زیارت کی جو بہترین اسلامی لبرلزم اور ہندو مسلم اتحاد کے زندہ مجسمہ تھے۔ گاندھی جی کے لئے وہ بمنزلہ ایک حقیقی بھائی کے تھے ۱۹۳۲ء میں جب گاندھی جی نے یرن کی ٹرپونہ میں اکیس دن کا برت رکھا تھا اور حالات بہت نازک ہو گئے تھے، اس وقت ڈاکٹر انصاری اپنا یورپ کا سفر ملتوی کر کے گاندھی جی کے پاس آ گئے تھے۔ ان کی قبر آج جامعہ نگر میں ایک چبوترے پر بنی ہوئی ہے۔ قبر کے ایک جانب پتھر پر ان کا نام اور ان کی تاریخ پیدائش اور وفات درج ہے، اور اس کے دوسری جانب قرآن پاک کی ایک آیت لکھی ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے :- "جو کوئی زمین پر ہے، فنا ہونے والا ہے، اور باقی رہے گی ذات تیرے رب کی جو بزرگی اور عظمت والا ہے۔" دوسری جانب دوسری آیت لکھی ہوئی ہے جس کا مطلب ہے: "کاش میری قوم معلوم کر لے کہ بخشدیا مجھکو میرے رب نے اور کیا مجھکو عزت والوں میں" (مرتب) قبر کے سادہ اور غیر نمائشی ہونے سے اس کی اثرانگیزی

کہیں بڑھ جاتی ہے۔ آزاد ہندوستان ڈاکٹر انصاری مرحوم کو اُمید، ایمان اور اتحاد کے ایک مجسمہ کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے گا۔

("ہریجن" ۲۸ اپریل ۱۹۴۶ء)

(ختم شد)

تشریحات

آتما: روح

آچاریہ دھرو: پورا نام آنند شنکر دھرو۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور سنسکرت کے بہت بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔

آچاریہ رام دیو: گروکل کانگڑی کے پرنسپل تھے اور ہندی کے بہت بڑے حامی۔

آریہ سماج: ہندوؤں کا ایک مذہبی فرقہ جس کی بنیاد سوامی دیانند نے ۱۸۷۵ء میں ڈالی تھی۔

آشرم: ہندوؤں کے قوانین کے مطابق ہر آدمی کو چار منزلوں سے ہو کر گزرنا ہوتا ہے۔ پہلی منزل برہمچریہ آشرم، کہلاتی ہے جو اسے اپنے گروؤں کے ساتھ رہ کر گزارنی پڑتی ہے۔ دوسری منزل، گرہست آشرم، جس میں بال بچوں کے ساتھ زندگی شروع ہوتی ہے۔ تیسری 'وان پرست آشرم'، جو جنگلوں میں جا کر یاد الٰہی میں گزارنی ہوتی ہے اور چوتھی 'سنیاس آشرم'، جس میں تمام علائق دنیوی سے کنارہ کش ہو جانا ہوتا ہے۔ (۲) گروؤں اور چیلوں کے رہنے کی جگہ۔

(ا)

اپنشد: ہندو مذہب کی وہ کتابیں جو بڑے بڑے رشیوں اور منیوں کے افکار و خیالات کا نتیجہ ہیں۔

اپنڈی سائٹیس: وہ مرض جس میں آنتوں کا سرا سوج جاتا ہے اور اس سے بعض وقت سخت تکلیف ہوتی ہے۔

اُچرد ھرم: سدا قائم رہنے والا مذہب۔

اِسپرنٹو: ایک مصنوعی زبان جو یورپ کی بڑی بڑی زبانوں کی آوازوں سے مل کر بنی ہے۔

اسٹاک ایکسچینج مارکیٹ: وہ بازار جہاں تجارتی کمپنیوں کے حصّوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔

اشتراکی: جو شخص ایسے نظام کا حامی ہو جس میں پیداوار اور تقسیم کے ذرائع سماج یا حکومت کے ہاتھ میں ہوں اور سماج کے تمام افراد کام اور پیداوار میں برابر کے شریک ہوں۔

اصلاحات: ہندستان میں انگریزی حکومت وقتاً فوقتاً یہاں کے سیاسی دستور میں کچھ ایسی تبدیلیاں کردیا کرتی تھی جس سے ہندستان کو کچھ مزید اختیارات مل جایا کرتے تھے۔

اکھا بھگت: گجرات کے علاقہ میں ایک ہندو بزرگ گزرے ہیں، جن کی تعلیمات کا وہاں کے لوگوں پر بہت اثر ہے۔

امرتلی: مدراس میں ایک چھوٹی سی جگہ ہے، جہاں ایک مونٹیسوری اسکول تھا۔

انارکسٹ: وہ شخص جو اپنے وقت کے سیاسی نظام کو ختم کردینا چاہتا ہے، خواہ اس کے بعد کوئی نظام نہ ہو

اِندر: قدیم دیوتاؤں میں جس کا ذکر ویدوں میں آتا ہے، اِندر بہت بڑے دیوتا مانے جاتے ہیں۔

انڈین ایجوکیشن سوسائٹی: ایک انجمن جو جنوبی افریقہ میں ہندستانی بچّوں کی تعلیم کے لیے قائم کی گئی تھی۔

اُوستا: پارسیوں کی ایک مذہبی کتاب۔ پورا نام "ژند اوستا" ہے۔

اہِمسا یا اہنسا: (۱) ہندو دھرم کے مطابق کسی جاندار کی جان لینا یا اُسے ستانا

بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ (۲) عدم تشدد۔
ایڈوین آرنلڈ: انگلستان کے ایک مشہور شاعر جنھوں نے 'لائٹ آف ایشیا' کے نام سے گوتم بدھ کی زندگی نظم میں لکھی ہے۔
الیساپ: چھٹی صدی قبل مسیح میں یونان کا ایک باشندہ جس نے جانوروں اور پرندوں کی زبان سے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھی ہیں جو دنیا کی اکثر زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔
ایکاناتھ: شیو جی کو کہتے ہیں۔
ایلیڈ: یونانی زبان میں ایک مشہور رزمیہ نظم جو نویں صدی قبل مسیح میں یونان کے مشہور شاعر ہومر کی لکھی ہوئی بتائی جاتی ہے۔
اینی بیسنٹ: انگلستان کی ایک مشہور سیاسی انقلاب پسند خاتون، جو ہندوستان میں کافی عرصہ رہیں اور یہاں کی ہوم رول تحریک کی بڑی علمبردار تھیں۔

ب

باپو: باپ۔ گاندھی جی کے عقیدتمند انھیں اسی نام سے پکارتے تھے۔
باردولی: سورت ضلع میں ایک تعلقہ ہے جہاں گاندھی جی نے لگان بند کرنے کی تحریک شروع کی تھی۔
بالکا آشرم: لڑکیوں کی تعلیم گاہ۔ اوکھلا موڑ کے پاس ہریجن لڑکیوں کا ایک آشرم تھا، جہاں گاندھی جی اکثر آیا کرتے تھے۔ اب یہ آشرم ہائر سکنڈری اسکول ہوگیا ہے۔
بال مندر: چھوٹے بچوں کا مدرسہ۔ نرسری اسکول
برٹرینڈ رسل: انگلستان کے مشہور ریاضی داں فلسفی۔ ۱۹۱۶ء میں پہلی جنگ عظیم کی مخالفت کی وجہ سے کیمرج یونیورسٹی میں پروفیسری سے علیحدہ کر دیے گئے تھے۔
برہمچریہ: بے بال بچوں کی زندگی۔ طالب علمی کی زندگی۔
برہمچارن: وہ عورت جو بغیر شادی کی زندگی اختیار کرے۔ گروکل کی متعلم۔

برہمچاری: وہ مرد جو بغیر شادی کی زندگی اختیار کرے ۔ گرو کل کا متعلم

بندے ماترم: بنکم چندر چٹرجی کی لکھی ہوئی ایک مشہور نظم جو پہلے قومی ترانہ کے طور پر گائی جاتی تھی ۔

بنرجی: پورا نام سریندر ابنرجی ہے۔ ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے ۔ آئی ، سی ، ایس کے امتحان میں کسی وجہ سے نہیں لیے گئے جس کے بعد سے انھوں نے اپنی زندگی ہندستان کی سربلندی اور قومی خدمت کے لیے وقف کردی تھی ۔

بوس: پورا نام جگدیش چندر بوس ہے۔ ہندستان کے مشہور سائینسدان جنھوں نے یہ تحقیق کی تھی کہ جانوروں کی طرح پودوں میں بھی حس یا جان ہوتی ہے ۔

بوبر: جنوبی افریقہ کے وہ باشندے جو ڈچ نسل سے ہیں اور جنھوں نے ۱۸۸۱ء میں انگریزوں سے باقاعدہ جنگ کی تھی ۔

بھجن: خدا کی تعریف میں گانا ۔ حمد ۔

بھگوت گیتا: مہابھارت کے ان ۱۸ ابواب کا مجموعہ جن میں کرشن جی نے ارجن کے سوالات کے جواب میں کچھ ہدایتیں اور نصیحتیں کی ہیں ۔ ہندو مذہب کی کتابوں میں اس کا بہت اونچا مقام سمجھا جاتا ہے ۔

بیکنٹھ: بہشت یا جنت (ہندو عقیدہ کے مطابق) ۔

پ

پاربتی: پرانوں کی روایت کے مطابق یہ ہمالیہ پہاڑ کی بیٹی سمجھی جاتی ہیں ۔ جن کی شادی شیوجی سے ہوئی تھی ۔

پبلک اسکول: انگلستان میں عموماً ان اسکولوں کو کہا جاتا تھا جو پرائیوٹ عطیوں سے چلتے تھے اور عموماً اقامتی ہوتے تھے ۔ ان میں اکثر امرا اور دولتمندوں کے لڑکے پڑھنے آتے تھے ۔

پُران: ہندو مذہب کی وہ قدیم کتابیں جن میں مختلف مذہبی اُمور، رسوم و عبادات، عقاید و خیالات، رشی منیوں کے حالات۔ قصّے کہانیوں کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔

پرولیتاریا: یہ جرمن زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں: مزدوروں کا طبقہ۔ یا سماج کا سب سے نچلا طبقہ۔

پرہلاد: ہندوؤں کی قدیم روایات کے مطابق پرہلاد ایک شخص تھا جو بچپن سے وشنو کا بڑا معتقد تھا۔ لیکن اس کے باپ اس کے سخت مخالف تھے اور اس پر طرح طرح کی سختیاں کیں، لیکن وہ نہ مانا اور اپنے باپ کی نافرمانی اور ناراضگی کی مطلق پروا نہ کی۔

پولوس یا پال: عیسائی مذہب کے بہت بڑے مبلغ۔ ان کا پہلے ساؤل نام تھا۔ لیکن جب ان پر نورِ حق جلوہ گر ہوا تو ان کا نام پولوس یا پال ہو گیا۔

ت

تال: ڈرچ زبان کی ایک بگڑی شکل۔

تاہل: بیوی بچوں کے ساتھ زندگی۔

تپسیا: کسی اعلیٰ مقصد کے لیے تکلیف اٹھانا۔ ریاضت

تحریکِ خلافت: پہلی جنگ عظیم میں جب اتحادیوں کے ہاتھوں سلطنت ترکی کو شکست ہوئی اور انگریزوں نے اس کی خاندان سے خلافت ختم کر دی تو ہندوستان کے مسلمانوں نے اس پر سخت احتجاج کیا اور خلافت کی بحالی کے لیے ایک تحریک اٹھائی اسی کو تحریکِ خلافت کہتے ہیں۔

تزکیہ نفس: عبادت کے ذریعے دل کی برائیوں کو دور کرنا۔

تکا رام: سترھویں صدی عیسوی میں پونا کے قریب پیدا ہوئے۔ بھگتی کے بڑے ماننے والوں میں تھے اور اسی (معنی میں) انھوں نے مرہٹی زبان میں بہت سے

بھجن اور گیت لکھے جس سے مرہٹی زبان کا بول بالا ہوا۔

تلسی داس: پندرھویں صدی عیسوی میں انھوں نے ہندی میں 'رام چرت مانس' کے نام سے رام چندر جی کی زندگی اور ان کے حالات لکھے، جو والمیکی کی سنسکرت کی راماین سے کہیں زیادہ مشہور و مقبول ہوئی۔

تیاگ: دنیا ترک کر دینا۔

ٹ

ٹرم: تعلیمی سال کا ایک حصہ جو تعلیمی سہولت کے خیال سے مقرر کر لیا جاتا ہے۔

ٹریپسٹ: خانقاہ، تارک الدنیا لوگوں کے رہنے کی ایک جگہ۔

ج

جادو ناتھ سرکار: ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ آخر عہد مغلیہ کے ایک بہت مستند مورخ مانے جاتے ہیں اور انھوں نے 'تاریخ اورنگ زیب' 'شیواجی' 'زوال سلطنت مغلیہ' وغیرہ کئی کتابیں لکھی ہیں۔

چ

چیتنیہ: پندرھویں صدی عیسوی میں وشنو مذہب کے ایک بہت بڑے مبلغ تھے۔ کرشن جی کے عقیدت مند اور بھگتی کے بہت بڑے ماننے والوں میں تھے۔

ح

حامیان سبزی: وہ لوگ جو سبزی کھانے کی حمایت اور گوشت، انڈے اور دودھ کے استعمال کی مخالفت کرتے ہیں۔

حکومت خود اختیاری: حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے اندر صوبوں کی

حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دینے کا جو انتظام کیا تھا، اُسے حکومت خود اختیاری کہتے ہیں۔

حیاتیات: وہ علم جس میں جانوروں، پودوں وغیرہ کی زندگی سے متعلق بحث ہوتی ہو۔ بایولوجی۔

خ

خلفائے اسلام: رسول اللہ صلعم کے بعد جو لوگ آپ کے جانشین ہوئے۔ انھیں خلفا کہتے ہیں اور اس منصب کو خلافت۔ یہ سلسلہ تاریخ اسلام میں ترکوں کے عہد تک قایم رہا اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد مصطفےٰ کمال نے اسے ختم کر دیا۔

د

دارالعوام: انگلستان کی حکومت کا وہ ایوان جو عوام کے منتخب نمایندوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

دراوڑی: جنوبی ہند کے قدیم باشندے یا ان کی زبان۔

درجہ نوآبادیات: سلطنت برطانیہ نے اپنی نوآبادیوں مثلاً کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ ملکوں کو اندرونی حکومت کے جو اختیارات دے رکھے تھے۔ اس حکومت کو درجہ نوآبادیات یا ڈومی نین اسٹیٹس کہتے ہیں۔

درد نارائن: وشنو کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں غریب نواز۔

دمینتی: راجہ نل کی بیوی۔

دوران خون کا نظریہ: ۱۶۲۸ء میں سب سے پہلے ولیم ہاروے نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ خون قلب سے رگوں کے ذریعہ جسم کے تمام حصوں میں جاتا ہے۔

دیانند سرسوتی: ۱۸۲۵ء میں کاٹھیاواڑ میں پیدا ہوئے۔ شیو مذہب کے ماننے والے تھے لیکن اس عقیدے سے مطمئن نہ ہو کر سارے ہندوستان میں حق کی تلاش

میں پھرتے رہے۔ بہت سے مذاہب کے لوگوں سے ملے لیکن کسی سے مطمئن نہ ہوئے۔ بالآخر انھوں نے ایک نئے مذہب 'آریہ سماج' کی بنا ڈالی، جس میں بتوں کی پوجا کی ممانعت ہے۔

دیتی لیتی: سندھ میں ایک رسم تھی جس میں شادی کے وقت لڑکی والوں کو بہت کچھ دینا پڑتا تھا۔

دیو ناگری: وہ رسم خط جس میں سنسکرت، ہندی وغیرہ لکھی جاتی ہے۔

ڈ

ڈارون: انگلستان کا مشہور سائنسداں جس نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ مخلوقات کی تقسیم نوع کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ تمام مخلوق ایک مادہ سے پیدا ہے اور ماحول کے اثر سے ارتقاء کرتی ہوئی مختلف انواع میں تقسیم ہو گئی ہے۔ اسی کو نظریہ ارتقاء کہتے ہیں۔

ڈچ: ہالینڈ کے باشندے

ڈربن: جنوبی افریقہ میں ریاست نیٹال کا ایک مشہور بندرگاہ۔

ڈومی نین اسٹیٹس: دیکھو لفظ 'درجہ نوآبادیات'۔

ڈین: ڈنمارک کے رہنے والے۔

ر

راجہ جی: پورا نام راجگوپال آچاریہ۔ ہندوستان کے ایک مشہور کانگریسی رہنما تھے۔ گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک میں کئی بار جیل گئے۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی ملنے کے بعد مرکزی کابینہ میں وزیر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل بنائے گئے اور ۱۹۵۴ء میں حکومت ہند نے انھیں 'بھارت رتن' کے اعزاز سے نوازا۔

راجہ رام موہن رائے: اٹھارھویں صدی عیسوی میں مشرقی بنگال میں پیدا ہوئے۔ ایک بڑے مذہبی عالم اور سماجی مصلح تھے۔ ستی کے خلاف اور شادی بیوگان کی حمایت میں آواز اٹھائی۔ آخر عمر میں برہمو سماج کے نام سے ایک نئے اصلاحی دین کی بنیاد ڈالی۔

راکشش: پرانوں میں ایک بیرحم، سنگدل مخلوق کا ذکر آتا ہے جنھیں راکشش کہتے ہیں۔

رامائن: یہ رام چندر جی کی زندگی اور ان کے حالات پر ایک کتاب ہے جو سب سے پہلے والمیکی نے سنسکرت میں لکھا تھا۔ اس کے بعد تلسی داس نے رام چرت مانس کے نام سے لکھا جو والمیکی کی رامائن سے کہیں زیادہ مقبول اور مشہور ہوئی۔

رام راج: تلسی داس نے اپنی کتاب "رام چرت مانس" میں ایک ایسے راج کا تذکرہ کیا ہے جس میں سب لوگ نہایت سکھ اور شانتی سے رہتے ہیں۔ اسی لیے اُسے رام راج کہتے ہیں۔

رام کرشن پرم ہنس: بیسویں صدی میں بنگال میں پیدا ہوئے۔ اصل نام گدادھر چیٹرجی تھا۔ ابتدا میں وہ ایک مندر کے پجاری تھے، لیکن بعد میں وہ پھر حق کی تلاش میں نکلے اور ایک عرصے کی ریاضت کے بعد انھوں نے اپنا نام رام کرشن رکھا اور دوستوں نے اس کے ساتھ پرم ہنس کا اضافہ کر دیا۔ انھوں نے بہت سے دوسرے مذاہب کا مطالعہ بھی کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ سب کی منزل ایک ہے، گو راستے الگ الگ ہیں۔

راہو: ہندو عقیدہ کے مطابق ایک راکشش ہے جس نے دیوتاؤں کے ساتھ امرت پی لیا تھا۔

رابندر ناتھ ٹیگور: ہندستان کے مشہور شاعر و ادیب سنہ ۱۸۶۱ء میں مشرقی بنگال میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں انھیں ان کی مشہور کتاب گیتان جلی

پر نوبل پرائز ملا۔ انھوں نے بولپور میں شانتی نکیتن کے نام ایک مدرسہ قایم کیا جو بعد میں ترقی کرکے ایک بین الاقوامی ادارہ بن گیا تھا۔

رومن کیتھولک: عیسائیوں کا وہ فرقہ جو پاپائے روم کے ماتحت ہوتا ہے۔

ریاضت: مشق و محنت، بالخصوص مذہبی مشاغل کی شکل میں۔

ز

زایر کی یاترا: انگریزی میں جان بنین کی ایک مشہور کتاب جس کا نام 'پلگرمس پروگرس' ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے دکھایا ہے کہ ایک زایر کو اپنی منزل تک پہنچنے میں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

س

سالسبری (لارڈ): ۱۸۳۰ء تا ۱۹۰۳ء۔ انگلستان کے ایک مشہور سیاستداں جو حد درجہ قدامت پسند تھے۔ ہندوستان کے لیے حکومت خود اختیاری کا قانون پاس ہو رہا تھا تو دارالامرا میں اس کی سخت مخالفت کی۔

ستیا گرہ: لغوی معنی حق پر قایم رہنا۔ گاندھی جی اپنی ہر تحریک کو حق پر مبنی سمجھتے تھے، اس لیے اسے 'ستیا گرہ' کہتے تھے۔

ست جگ: ہندو عقیدہ کے مطابق قدیم زمانہ جو سب سے اچھا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔

سری نواس شاستری: ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں گوکھلے کی 'سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی' میں شریک ہوئے۔ اپنی خطابت کی وجہ سے خاص طور پر شہرت رکھتے تھے۔

سناتنی: سناتن دھرم کا ماننے والا جو ہندوؤں کا قدیم مذہب ہے۔ بعد میں اس کے مقابل نیا مذہب آریہ سماج کے نام سے قایم ہوا۔

سن یات سین: ۱۸۶۶ء میں چین کے شہر کینٹن کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں جب منچو خاندان کا خاتمہ ہوا، تو اس انقلاب کے لانے میں ان کا بہت نمایاں حصہ تھا۔ اور پھر اس انقلاب کے بعد جمہوریۂ چین کے صدر منتخب کئے گئے۔

سنیاس آشرم: دیکھیے لفظ 'آشرم'

سنیاسی: وہ شخص جو سنیاس آشرم اختیار کرے۔

سول نافرمانی: گاندھی جی نے جب ہندوستان کی آزادی کی تحریک شروع کی تو سب سے پہلے انھوں نے سول قوانین کی نافرمانی سے ابتدا کی، مثلاً نمک کا قانون توڑنا، لگان نہ دینا وغیرہ

سومیرن: خدا کی یاد کرنا۔

سیاسی اصلاحات: دیکھیے لفظ 'اصلاحات'

سیگاؤں: واردھا ضلع میں ایک گاؤں ہے جہاں گاندھی جی نے سابرمتی کے بعد اپنا دوسرا آشرم قائم کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا نام 'سیوا گرام' ہو گیا۔

ش

شاستر: ہندو مذہب کی وہ کتابیں جن میں انسان کو زندگی کے مختلف شعبوں کی تعلیم دی گئی ہے۔

شاستری: دیکھیے ودیا واس شاستری'

شانتی نکیتن: مغربی بنگال میں بولپور سے قریب رابندر ناتھ ٹیگور کے والد دیبندر ناتھ ٹیگور نے جو برہمو سماج کے بانیوں میں تھے، خدا کی عبادت کے لیے ایک آشرم بنایا تھا، جس کا نام انھوں نے شانتی نکیتن رکھا تھا۔ اسی جگہ پر بعد میں رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک درس گاہ قائم کی جو اب وشوا بھارتی

یونیورسٹی بن گئی ہے۔

شردھانند: ۱۸۵۶ء میں پنجاب میں پیدا ہوئے ۱۸۸۲ء میں ان پر سوامی دیانند کا بہت گہرا اثر پڑا، اور وہ آریہ سماج تحریک میں شریک ہو گئے۔ جب اس جماعت میں قدیم و جدید تعلیم کے مسئلہ پر دو گروہ ہو گئے تو شردھانند جی قدیم تعلیم کے حق میں تھے اور اسی بنا پر ۱۹۰۲ء میں ہردوار میں 'گرو کل' کے نام سے قدیم تعلیم کا ادارہ قایم کیا پھر ۱۹۱۷ء میں اس کی انتظامی ذمے داری سنبھالی۔ اس کے بعد انھوں نے 'سنیاس آشرم' اختیار کرلیا ۱۹۲۰ء میں آپ گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک میں شریک ہوئے اور حکومت سے جنگ میں آپ نے بڑی دلیری اور قومیت کا ثبوت دیا پھر ۱۹۲۳ء میں آپ نے شدھی اور 'سنگھٹن' کی تحریک شروع کی۔

شودر: ہندو سماج میں منو کے قوانین کے مطابق چار 'ورن' یعنی طبقے سمجھے جاتے ہیں: (۱) برہمن (۲) کشتری (۳) ویش اور (۴) شودر۔ چوتھا طبقہ جو زیادہ تر یہاں کے قدیم باشندوں پر مشتمل تھا، سب سے ادنیٰ اور حقیر سمجھا جاتا تھا۔

شیکسپیر: ۱۵۶۴ء تا ۱۶۱۶ء انگلستان کا سب سے مشہور ڈرامہ نگار اور شاعر ہے۔

شیواجی: ۱۶۲۷ء میں مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔ ان پر راماین اور مہابھارت کا بہت گہرا اثر پڑا تھا، جس کی وجہ سے وہ نہ صرف خود غیروں کی حکومت سے آزادی کا خواب دیکھنے لگے، بلکہ پوری ہندو قوم کو اس سے آزاد کرانے کا منصوبہ باندھا۔ انھوں نے سب سے پہلے مرہٹہ قوم میں وحدت اور عزم پیدا کیا اور پھر مغلوں سے ٹکر لی اور رفتہ رفتہ ایک مرہٹہ سلطنت قایم کرلی، جو آپس کے اختلاف کی وجہ سے زیادہ عرصہ قایم نہ رہ سکی۔

ص

صلیبیں: وہ جنگیں جو یورپ کی عیسائی طاقتیں صدیوں تک بیت المقدس پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے، ترکوں سے لڑتی رہیں۔ صلیب چونکہ ان کا جنگی نشان تھا، اس لیے انھیں صلیبی جنگ کہتے ہیں۔

ع

عرشِ اعظم: آٹھواں آسمان جو خدائے تعالیٰ کی جلوہ گاہ ہے۔ اسے عرشِ بریں بھی کہتے ہیں۔

علی برادران: یہ لفظ اصل میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے لیے بولا جاتا ہے انھوں نے گاندھی جی کی عدمِ تعاون کی تحریک میں بڑا نمایاں حصّہ لیا تھا۔

عمر خیام: ۱۰۴۲ء میں نیشاپور (ایران) میں پیدا ہوئے۔ یہ ریاضیات کے بہت بڑے عالم تھے لیکن ساتھ ہی اس کے شاعر بھی تھے اور خاص طور سے رباعیات کے لیے مشہور رہیں۔ 'خیام'، اس وجہ سے کہلاتے تھے کہ خیمہ بنانا ان کا آبائی پیشہ تھا۔

عہدِ جدید۔ انجیل کو کہتے ہیں جو حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئی تھی۔ اس سے پہلے حضرت موسیٰ پر جو کتاب نازل ہوئی تھی، اسے عہدِ عتیق، یا توریت کہتے ہیں۔

ف

فٹز جیرالڈ: انھوں نے عمر خیام کی رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ کر کے مشہور بنا دیا ہے، جس سے اس کی بڑی شہرت ہوئی۔

فی نکس : جنوبی آفریقہ میں ڈربن سے قریب ایک جگہ ہے، جہاں گاندھی جی نے اپنی ستیا گرہ کے زمانہ میں اپنے ساتھی کام کرنے والوں کی ایک بستی بسائی تھی۔

ک

کاروے : پورا نام ڈی۔ کے کاروے ہے۔ ۱۸۵۸ء میں پونہ کے قریب پیدا ہوئے۔ انھیں عورتوں کی تعلیم سے ابتدا ہی سے دلچسپی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں انھوں نے عورتوں کی ایک یونیورسٹی قایم کی، ۱۹۲۲ء میں وہ اس کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

کارنیگی : (۱۸۲۵ء تا ۱۹۱۹ء) پورا نام اینڈریو کارنگی ہے۔ امریکہ کے مشہور دولتمندوں میں سے ہیں جنھوں نے بہت پہلے اپنی دولت کا ایک بڑا حصّہ تعلیم و تحقیق کے کاموں پر وقف کر دیا تھا۔

کاکا صاحب : پورا نام کاکا کالیلکر ہے۔ ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ شروع سے ہی قومی تعلیم سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں کچھ عرصہ شانتی نکیتن میں رہے۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ء سے گاندھی جی کے سابرمتی آشرم میں آگئے۔ ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک کے سلسلہ میں گجرات ودیاپیٹھ کے قیام میں مدد دی۔ ۱۹۳۷ء میں بنیادی تعلیم شروع ہوئی تو اس میں بھی بہت نمایاں حصّہ لیا۔

کام دھینو : ہندو عقیدہ کے مطابق جنت کی وہ گائے جو انسان کی ہر خواہش کو پورا کر دیتی ہے۔

کاؤنٹیاں : کاؤنٹی کی جمع۔ ضلع یا ریاست کا ایک حصّہ جو انتظامی غرض سے بنا لیا گیا ہو۔

کبیر : پندرھویں صدی عیسوی میں بھگتی تحریک کے بہت بڑے حامی اور ہندی

کے ایک مقبول شاعر تھے۔ آپ نے اپنے دوہوں میں مذہب کی ظاہری رسوم اور عبادات کی سخت مذمت کی ہے۔

کرزن: عام طور پر لارڈ کرزن مشہور ہیں۔ ۱۸۹۸ء میں ہندستان کے وائسرائے مقرر ہوئے اور بڑے تزک و احتشام سے ہندستان پر حکومت کی۔ لیکن کسی وجہ سے کمانڈر انچیف لارڈ کچنر سے کسی اختلاف کی بنا پر اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

کرم تیاگ: جو کرم (اعمال) میں عقیدہ نہ رکھتا ہو۔

کرن کھیلو:

کلجگ: ہندو عقیدہ کے مطابق جو سب سے برا زمانہ ہوتا ہے اُسے کلجگ کہتے ہیں۔

کلنک کا ٹیکہ: بدنامی کا داغ۔

کنڈرگارٹن: چھوٹے بچّوں کی درسگاہ جسے جرمنی کے ماہر تعلیم فروبیل نے قایم کیا تھا۔ اور جس میں بچّوں کو پوری آزادی اور قدرتی طور پر نشوونما کا موقع دیا جاتا تھا۔ اس نے یہ نام اپنی درسگاہ کا رکھا تھا جس کے معنی ہیں: بچّوں کا باغ۔

کیلن باخ: گاندھی جی کے جنوبی افریقہ کے ساتھیوں میں تھے۔

گ

گائیتری: وید کا ایک منتر جس میں خدا سے یہ دعا مانگی جاتی ہے کہ مجھے ایسی طاقت عطا فرما کہ میں تیری راہ پر چل سکوں۔

گرو کل: پرانے زمانے میں گرو جہاں رہ کر تعلیم دیتے تھے۔ آج قدیم طریقہ کی ہر درسگاہ کو کہتے ہیں۔

گرو گوبند: سکھوں کے نویں گرو تیغ بہادر کے لڑکے تھے۔ ۱۶۶۶ء میں پٹنہ

میں پیدا ہوئے۔ اپنے باپ کی شہادت کے بعد انھوں نے سکھ قوم کی از سرِ نو تنظیم کی اور اسے ایک فوجی نظام میں تبدیل کر دیا۔

گرو نانک : ۱۴۶۹ء میں لاہور کے قریب ننکانہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے سادھوؤں اور فقیروں کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ اپنے زمانے کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ظاہری رسم و رواج سے بیزار تھے۔ پھر بھی خدا کی وحدانیت کے قایل تھے اور ایک نئے دین کی اشاعت کی جو بعد میں سکھ مذہب کے نام سے موسوم ہوا۔

گرہست آشرم : منو کے قانون کے مطابق زندگی کی وہ منزل جو بال بچوں کے ساتھ گزاری جائے۔ دیکھو لفظ "آشرم"

گوکھلے : ۱۸۶۶ء میں رتناگری ضلع میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد "دکن ایجوکیشن سوسائٹی، پونا" میں شریک ہو گئے، جو تعلیم کا کام کرتی تھی۔ ۱۸۹۹ء سے انڈین نیشنل کانگرس میں حصہ لینے لگے۔ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے "انجمن خدام ہند" کے نام سے ایک سوسائٹی بنائی جس کا مقصد ایسے کارکن تیار کرنا تھا جو ہندوستان کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر سکیں۔

گیتانجلی : رابندر ناتھ ٹیگور کی وہ مشہور کتاب جس پر انھیں ۱۹۱۳ء میں نوبل پرائز ملا تھا۔

ل

لارڈ کچنر : (۱۸۵۰ تا ۱۹۱۶ء) ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک ہندوستان کے کمانڈر انچیف رہے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں انھیں برطانوی فوجوں کی تنظیم کا کام سپرد ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں ایک جہاز کے ڈوبنے میں خود کام آ گئے۔

لاطینی : قرونِ وسطیٰ میں یورپ کی ایک مشہور زبان جس میں اس عہد کا تمام علمی ذخیرہ پایا جاتا ہے اور جو آج بھی علمی زبان کی حیثیت سے خاص درجہ رکھتی ہے۔

لبرل : آزاد خیال۔ جو مذہب اور تعلیم کے معاملے میں اصلاح و ترقی کا حامی ہو۔

لبرل تعلیم : وہ تعلیم جو ہر طرح کی تنگ نظری سے پاک ہو۔ وہ تعلیم پیشہ کے خیال سے نہ دی جاتی ہو۔

لوکمانیہ تلک : پورا نام بال گنگا دھر تلک ہے۔ ۱۸۵۶ء میں رتنا گری ضلع میں پیدا ہوئے۔ پہلے فرگسن کالج اور دکن ایجوکیشن سوسائٹی میں شریک ہوئے۔ پھر کسی اختلاف کی بنا پر اس سے الگ ہو گئے۔ تلک اپنے انتہا پسندانہ خیالات کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ وہ ہندوستان میں ایک عوامی تحریک پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں جب کانگریس کے اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں میں اختلاف ہوا تو وہ انتہا پسندوں کو ساتھ لے کر الگ ہو گئے۔ ان کے ان انتہا پسندانہ خیالات کی وجہ سے گورنمنٹ نے ان کو جلاوطن کر کے انہیں انڈمان بھیج دیا۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں چھوڑ دیے گئے اور اینی بیسنٹ کے ساتھ 'ہوم رول' کی تحریک میں ہو گئے جس کا منشا اور مقصد ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کا قیام تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جب برطانوی حکومت نے ہندوستان کو 'اصلاحات' دیں تو انھوں نے ان کو ناکافی قرار دے کر ہندوستان کے لیے سوراج کا مطالبہ کیا۔ لیکن ۱۹۲۰ء ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

لوئی پیسٹور : انیسویں صدی میں فرانس کا ایک بہت بڑا سائنس دان جس نے ریشم کے کیڑوں اور بھیڑوں کی بیماری کا علاج دریافت کیا تھا۔

نیز اس نے کُتّے کے کاٹنے کا علاج بھی معلوم کیا تھا۔

لینسبری (جارج): انگلستان کے ایک سوشلسٹ لیڈر تھے۔

لینن: ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس کے سب سے بڑے علمبردار اور مارکس کے فلسفہ کے حامی۔ انھوں نے بالشویکی جماعت کی بنیاد ڈالی تھی۔

م

مالاباری: پورا نام بہرام جی مالاباری ہے۔ ۱۸۵۳ء میں بڑودہ میں پیدا ہوئے ایک مشنری کے اثر سے ہندو سوسائٹی میں سوشل ریفارم کا کام شروع کیا۔ اور 'سیوا سدن' کے نام سے ایک جماعت قایم کی۔

مانسرور: ہمالیہ کی ایک بہت بڑی جھیل ہے۔

محور: جس چیز کے گرد کوئی چیز گھومے۔ مرکز۔

مدن موہن مالوی: ۱۸۶۱ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ہندو قوم کے بہت بڑے رہنما اور خادم تھے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کا قیام ان سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ ہندی اور انگریزی دونوں زبان کے بہت اچھے مقرر تھے۔

مدیر: گاندھی جی نے 'ہند سوراج' جو مکالمہ کی شکل میں لکھی ہے، اس میں تم سوالات مدیر کی زبان سے پیش کیے ہیں۔ انگریزی میں ایڈیٹر کہتے ہیں

مشرق: پورب۔ عام اصطلاح میں ایشیا سے مراد ہوتی ہے، جو یورپ سے مشرق میں پڑتا ہے۔ اسی طرح یورپ کو اصطلاحاً 'مغرب' کہتے ہیں جو ایشیا کے مغرب میں ہے۔

مشنری: مبلغ۔ عام اصطلاح میں عیسائی مبلغین مراد لیے جاتے ہیں

مسلم لیگ: ۱۹۰۶ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے مقابل میں مسلمانوں کے علٰحدہ حقوق کی نمایندگی کے لیے قایم کی گئی تھی۔

مگن بھائی دیسائی: گجرات، ودیا پیٹھ سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور سماجی معاملات سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔

منوسمرتی: وہ کتاب جس میں منو کے قوانین درج ملتے ہیں۔

مولانا شوکت علی: ۱۸۷۳ء میں رامپور میں پیدا ہوئے۔ ایم اے او کالج، علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۱۲ء میں خدام کعبہ کے نام سے ایک جماعت قائم ہوئی، جس کے یہ سرگرم بانیوں میں تھے۔ ۱۹۲۰ء میں خلافت کی تحریک کے ساتھ گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک میں بھی شامل ہو گئے اور ان کے دست راست کی حیثیت سے رہے۔ جسمانی اعتبار سے بڑے موٹے اور بھاری جسم کے تھے۔

مونٹیگو: (۱۸۷۹ء تا ۱۹۲۴ء) انگلستان کے ایک مشہور ریاست داں ۱۹۱۹ء کی "اصلاحات" کی ترتیب و تشکیل میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ انھیں نے ۱۹۱۷ء میں ہندوستان کو بہ تدریج حکومت خود اختیاری دینے کا اصول پیش کیا تھا۔

مون سادھنا: رشیوں منیوں کی طرح چپ لگانا۔

میڈیم مونٹیسوری: اٹلی کی مشہور ماہر تعلیم خاتون جو چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لیے خاص طور پر شہرت رکھتی ہیں۔ ان کا طریقہ تعلیم خاص طور سے بچہ اس کی تربیت پر مبنی ہے جس کے لیے انھوں نے مخصوص سامان تعلیم بھی وضع کیے تھے۔

مہاتما منشی رام: دیکھیے "شردھانند" یہ ان کا نام تھا جو عرف عام کے طور پر بولا جاتا تھا۔

میکالے: ہندوستان میں لارڈ میکالے کے نام سے مشہور ہیں ۱۸۵۷ء میں اس خطاب سے نوازے گئے تھے، اس لیے کہ انھوں نے ۱۸۳۵ء میں اپنی وہ مشہور "یادداشت" پیش کی تھی جس کی رو سے ہندوستان میں انگریزی

تعلیم رائج کی گئی اور انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی۔

میوزیم : عجائب خانہ۔

ن

نارد جی : ایک بہت بڑے رشی تھے جو برہما کی اولاد سے مانے جاتے ہیں

ناستک : جو خدا کو نہ مانتا ہو۔ ملحد۔

نراجی : جو کسی نظام حکومت کا قایل نہ ہو۔

نشاۃ ثانیہ : لفظی معنی: دوبارہ اٹھنا، اصطلاحاً اس تحریک کو کہتے ہیں جو اسپین میں عربوں کے اثر سے پیدا ہوئی اور یورپ میں یونانی علوم و فلسفہ دوبارہ زندہ ہوئے۔

نظیر : اردو کے مشہور شاعر جو آگرے میں پیدا ہوئے۔

نل : راجہ ویرسین کے بیٹے کا نام ہے جو دمینتی پر عاشق تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

نمسکار : ہندو طریقے پر ہاتھ جوڑ کر سلام کرنا۔

نواب مسعود یار جنگ : ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ اور آکسفرڈ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۸ء تک ریاست حیدر آباد میں ڈائرکٹر تعلیمات رہے۔ آخر عمر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے۔ یہ سر سید کے پوتے تھے۔

نوجیون : نئی زندگی۔ گاندھی جی کے ایک ہفتہ وار اخبار کا نام بھی ہے۔

و

وان پرست : دیکھیے لفظ "آشرم"

وٹھل بھائی پٹیل : ۱۸۷۳ء میں نڈیاڈ (گجرات) میں پیدا ہوئے۔ جس زمانہ میں

یہ انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ منٹو مارلے اسکیم مرتب کی جارہی تھی جس میں انھوں نے بہت بڑا حصہ لیا۔ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے رولٹ ایکٹ کی مخالفت کی اور اس طرح وہ گاندھی جی اور ان کی تحریک سے قریب آئے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک میں پورے طور پر شریک ہوگئے۔ یہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کے بھائی تھے۔

ودیا پیٹھ : درس گاہ۔

ودیارتھی : طالب علم۔

ورڈسورتھ : انگلستان کے ایک مشہور شاعر۔ ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ وہ انسان اور فطرت میں ہم آہنگی کے قایل تھے اور اس کا اثر ان کی شاعری میں بھی پایا جاتا ہے۔

ورن : منو کے قوانین کے مطابق ہندو سماج چار طبقوں میں منقسم ہوا اور ہر ایک کو 'ورن' کہتے ہیں۔ برہمن، کشتری، ویش اور شودر۔

وسوانی : پورا نام ٹی۔ ایل۔ وسوانی۔ عام طور پر سادھو وسوانی کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۸۷۹ء میں سندھ میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے سادھو سنتوں کی صحبت میں رہنے کے عادی تھے۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کی تحریک سے بہت متاثر ہوئے اور اس کے بڑے حامی بن گئے۔

وشنو : ہندوؤں کے تین بڑے دیوتا مانے جاتے ہیں۔ وشنو، شیو اور شکتی۔ وشنو ان میں سب سے بڑے سمجھے جاتے ہیں۔

وشوناتھ جی کا مندر : بنارس میں ایک بہت مشہور مندر ہے۔

ولبھ بھائی : مہاتما گاندھی جی کی تحریک کے بہت بڑے کارکنوں میں تھے۔ آزادی کے بعد قومی حکومت میں ڈپٹی پرائم منسٹر بنائے گئے۔ ریاستوں کا الحاق ان کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

ویدؔ : ہندوؤں کی سب سے قدیم مذہبی کتاب۔

ویدانت : ویدوں کا آخری حصہ جس میں ہندو مذہب کے چھ مذاہب ہو گئے ہیں اور اسی میں خصوصیت سے وحدۃ الوجود کا فلسفہ پیدا ہوا۔ جس کے شنکر اچاریہ بعد میں سب سے بڑے علمبردار ہوئے۔

ویلیس (ایڈگر) : انگلستان کا ایک صحافی اور مصنف۔

ہ

ہکسلے : پورا نام جولین ہکسلے ۱۸۸۷ء میں لندن میں پیدا ہوئے۔ ایٹن اور آکسفرڈ میں تعلیم پائی۔ بعد میں آکسفرڈ اور لندن یونیورسٹی میں زوالوجی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

ہند سوراج : گاندھی جی کی ایک مشہور کتاب جو انڈین ہوم رول کے نام سے انگریزی میں ہے۔ اس میں انھوں نے سوال جواب کی شکل میں مستقبل کے ہندوستان کا ایک خاکہ پیش کیا ہے۔

ہنومان : سگریو کے وزیر اور رام چندر جی کے بڑے معتقد تھے۔ سیتا جی کا پتہ لگانے اور رام چندر جی کو فتح دلانے میں بڑی مدد کی تھی، اسی لیے ہندو انھیں دیوتا مانتے ہیں۔

ہوم رول : اس صدی کی دوسری دہائی میں مسز اینی بیسنٹ اور بعض دوسرے رہنماؤں نے ہندوستان کو رفتہ رفتہ حکومت خود اختیاری دیے جانے کی تحریک اٹھائی تھی، جس کو ہوم رول کہتے ہیں۔

ی

یڈیش : بول چال کی وہ زبان جو یورپ کے اکثر ملکوں میں یہودی بولتے تھے اور اب وہ عبرانی رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔

یم یا یمن : عہد ۔

یوگی : جو 'یوگ' کا عامل ہو۔ 'یوگ' اصل میں ہندو فلسفہ کی چھ شاخوں میں سے ایک ہے۔ اس فلسفے کی رو سے انسان میں ایک طاقت ہے جو ریڑھ کی ہڈی سے ہوتی ہوئی سر کے پچھلے حصے تک پہنچتی ہے۔ اور مشق و ریاضت سے انسان اس کی بدولت بہت سے عجیب و غریب کام کر سکتا ہے، مثلاً ایک عرصے تک دم بخود رہنا، خود کو زمین کے اندر کئی کئی دنوں تک دفن رکھنا، وغیرہ ۔